U 15250 P - 19-1-10

Title - ISLAM KE MA'AASHI NAZARIYE.

Creator - Mehd. Yusuf uddin.

Publisher - Matba Abor Aheemiya (Hyderabad).

Date - 1950.

Pages - 14 + 391 + 43.

Subjects -

اسلامی نظم معیشت

دوسری جلد

اسلام کے معاشی نظریے

از

محمد یوسف الدین
ایم، اے، پی ایچ، ڈی،

اسلامی نظم معیشت

(دوسری جلد)

اسلام کے معاشی نظریے

(از)

محمد یوسف الدین ایم، اے، پی ایچ۔ ڈی (عثمانیہ)
اُستاذ مذہب و ثقافت
جامعہ عثمانیہ

سنہ ۱۳۶۹ھ م سنہ ۱۹۵۰ء

دوسری اشاعت (۱۰۰۰)

مطبع ابراہیمیہ حیدرآباد دکن

فہرست مضامین

پہلا حصہ۔ حکومت کی آمدنی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(۵) مسئلہ اُجرت

محنت کی عزت اور مزدور کا وقار

اُجرتوں کی بحث کے سلسلہ میں سب سے اہم اور بنیادی مسئلہ محنت کی عزت اور مزدور کے وقار کا ہے۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ بیسویں صدی کی مہذب دنیا میں بھی ممالک متحدہ امریکہ اور روس کے سوا باقی کم و بیش تمام ملکوں میں ابھی تک مزدور پیشہ طبقہ کو چنداں وقعت اور عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا۔ جسمانی محنت کرنے والے دستکاروں اور مزدوروں کی کوئی وقعت نہیں۔ دنیا کی اس قدر ذہنی اور عقلی ترقی کے باوجود لوگوں کے دل و دماغ پر ابھی تک تعصب کا غبار چھایا ہوا ہے کہ جسمانی محنت حقیر چیز ہے اور اس کی وجہ سے جسمانی محنت کرنے والا مزدور چنداں عزت کا مستحق نہیں شاید یہی وجہ ہے کہ آج کل کے پڑھے لکھے نوجوان بھی ان ہی کاموں کو زیادہ پسند کرتے ہیں جن میں جسمانی محنت یا ہاتھ سے کام نہ کرنا پڑے خواہ اس میں اہلکاری سے زیادہ اجرت کیوں نہ ملتی ہو۔ یہ واقعہ ہے کہ دوسری جنگ عظیم سے پہلے بھی میٹرک کامیاب اہلکار سے بڑھئی اور معمار زیادہ اجرت لیا کرتے تھے اور آج اور بھی زیادہ کماتے ہیں۔ یہ حال صرف ہندوستان کا نہیں بلکہ بڑی حد تک دنیا کے اور بھی اکثر ممالک میں یہی نظر آتا ہے وجہ صاف ظاہر ہے کہ باوجود اس قدر

معاشی بیداری کے ابھی تک ہاتھ سے کام کرنے والوں کے خلاف تعصب باقی ہے آج بھی بہت سے ایسے خاندان ہیں کہ ان کا کوئی فرد دستکاری کا پیشہ اختیار کرلے تو خاندان بھر کے لیے یہ بات باعث ننگ و عار سمجھی جاتی ہے جب معاشرہ کے ایک بڑے طبقے کے خیالات یہ ہوں تو اس میں مزدور پیشہ طبقہ کی بہتری اور بہبودی کی کیا امید ہوسکتی ہے!

اسلام کی رہنمائی

اس سلسلہ میں اسلام کی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ اس نے ان تمام مصنوعی امتیازات کو یک قلم مٹا دیا اور صحیح معنوں میں نہ صرف انسانی مساوات و اخوت کی تعلیم دی بلکہ عملی طور پر مزدور کے وقار کو بلند کیا اور محنت کو باعزت قرار دیا۔ اس کی تفصیل پیدائش دولت کے باب ۳ میں محنت کے تحت کی جاچکی ہے چنانچہ وہاں اس بات کا اشارہ ہوچکا ہے کہ خود رسول کریمؐ نے بکریاں چرائیں اور بعد میں اس کا ذکر فخریہ طور پر فرماتے تھے نیز آپ نے اجرت پر بیوپار بھی کیا اور یہ فرما کر کہ

اَلْکَاسِبُ حَبِیْبُ اللّٰہِ ‏ پیشہ والے اللہ کے دوست ہیں۔

دستکاروں اور صناعوں کے درجے اتنے بلند فرمائے کہ گویا ان کو محبوبیت الٰہی کا مقام حاصل ہے۔

مسئلہ اجرت کی اہمیت

تقسیم دولت کے مباحث میں اُجرت کے مسئلہ کی خاص اہمیت ہے کیونکہ اجرت کا تعلق خود انسان کی محنت سے ہے اور اس کا اثر تمام معاشرہ پر پڑتا ہے مشینوں کی ایجاد بڑے بڑے کارخانوں کے قیام اور پیدائش بر پیمانۂ کبیر کی وسعت کے ساتھ ہی ساتھ اجرت کا مسئلہ روز افزوں اہمیت حاصل کرتا جارہا ہے۔

اُجرت کی تعریف

پروفیسر بنھام نے اجرت کی تعریف کرتے ہوئے بتایا ہے کہ "اجرت کی یہ تعریف کی جاسکتی ہے کہ وہ زر کی ایک ایسی مقدار ہے جو معاہدہ کے تحت آجر، مزدور کو اس کی خدمات کے معاوضہ میں ادا کرتا ہے"[1]

---

[1] بنھام: اکنامکس صفحہ ۲۳۱ دوسرا ایڈیشن ۱۹۴۰ء

جاہلیت میں آجر اور مزدور کے تعلقات

آج عام طور پر یہ پکار کہ سرمایہ دار اور آجر، مزدوروں کو لوٹ رہے ہیں تو یہ کوئی نئی بات نہیں اسلام سے قبل ساری دنیا میں یہی مرض موجود تھا چنانچہ اسلامی فتوحات کے وقت صحابۂ کرامؓ کی بھی اس پر نظر پڑی اور عمرو بن العاصؓ گورنر جنرل اور مصر کے فاتح نے حضرت عمرؓ کو مصر کے ان مزدوروں کا ذکر کرتے ہوئے جو زمینداروں کے لیے کھیتوں میں کام کرتے تھے یہ لکھا تھا کہ

"ایک مخلوق جس پر خدا کی مہربانی ہے اور جو شہد کی مکھیوں کی طرح دوسروں کے لیے محنت کرتی ہے اور اپنی محنت اور اپنے گاڑھے پسینہ کی کمائی سے کوئی فائدہ نہیں اٹھاتی"[1]

واضح ہو کہ آجر اور مزدور کی محنت سے سرمایہ داروں کا طبقہ جن چالاکیوں سے نفع اٹھا رہا تھا اس کا انسداد بھی اسلام کے مقاصد کا جزو تھا دنیا کے اور حصوں سے قطع نظر خود حجاز میں جاہلیت کے دور میں بڑے پیمانہ پر خود عرب میں بھی بعض کاروبار اسی نوعیت کے ہوتے تھے جاہلیت میں بھی وہاں کان کنی ہوتی تھی اور ہزار دو ہزار مزدور کام کرتے تھے چنانچہ جغرافیہ دان الہمدانی المتوفی ۳۳۴ھ / ۹۴۵ء نے شمام کے چاندی اور تانبے کی کانوں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"..... وکذالک شمام معدن فضۃ ومعدن نحاس۔ وکان بہ الوف من المجوس الذین یعملون المعدن"[2]	..... اسی طرح شمام میں چاندی اور تانبے کی کانیں تھیں جن میں ہزاروں مجوسی (آتش پرست) کام کرتے تھے۔

نیز جیسا کہ اوپر "عرب کے قدیم معاشی نظام" میں واضح کیا گیا ہے قریش کے تجارتی کاروبار بڑے اعلیٰ پیمانہ پر ہوتے تھے اور خود بدر کے کاروان میں دو ہزار اونٹ تھے اسلام کی ابتدا میں خود مسلمانوں میں بھی بعض کاروبار بڑے اعلیٰ

---

[1] ابو المحاسن: النجوم الزاہرہ صفحہ ۳۲، نیز موسیو لی بان تمدن عرب ص ۲۰۱ مترجمہ سید علی بلگرامی
[2] الہمدانی: صفۃ جزیرۃ العرب صفحہ ۱۴۹ تہامۃ الیمن مطبوعہ لائڈن۔

پیمانہ پر شروع ہو گئے تھے خصوصاً حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں جہاز سازی کے بڑے بڑے کارخانے قائم ہو گئے تھے۔ اس موقع پر یہ اشارہ بے محل نہیں کہ اس زمانے میں عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ یورپ کے نام نہاد صنعتی انقلاب سے پہلے بڑے پیمانہ کے کاروبار ناپید تھے۔ اس کی تردید میں پرسی جارڈن اور ملٹن برگس نے انگلستان کے مختلف کاروبار کے تاریخی حالات بیان کرنے کے بعد لکھا ہے کہ "یہ مثالیں عام طور پر پھیلے ہوئے اس قدیم خیال کی تردید کرتی ہیں کہ بڑے پیمانے پر کارخانہ چلانے کے کاروبار صنعتی انقلاب سے پہلے ناپید تھے"۔[1] مقالہ نگار کی رائے میں خود عرب میں زمانۂ اسلام سے پہلے کے کاروبار پر بھی یہی بات صادق آتی ہے یہی وجہ ہے کہ معاش و معیشت کے دوسرے شعبوں کی اصلاح پر اسلام نے جس طرح توجہ کی اسی طرح اجرت اور مزدوری کا مسئلہ بھی اس کی نگاہوں سے اوجھل نہ رہا خود پیغمبر اسلام کو جب اس کا ذاتی تجربہ کرنا پڑا تھا کہ چند قیراطوں پر مکہ والے آپ سے دن بھر بکریاں چروایا کرتے تھے تو کوئی وجہ نہیں کہ رسول کریمؐ پر سرمایہ داروں کی بے رحمیوں کا انکشاف نہ ہوا ہو۔

عرب کے معاشی نظام کے باب صفحہ ۵۹ تا ۶۰ پر تفصیل سے بتایا جا چکا کس طرح ایک قریشی آجر نے ایک معمولی سی شکایت پر ایک ہاشمی مزدور کو ڈنڈے سے اتنا مارا کہ غریب مزدور مر گیا۔

مزدور کو کتنی اجرت ملنی چاہیے؟ معاشرہ پر مزدوروں کی اجرت کا اثر بڑا ہمہ گیر ہوتا ہے، مزدور کو اجرت کم ملے تو نہ صرف مزدور اور اس کے خاندان کا معیار زندگی پست رہے گا بلکہ مجموعی حیثیت سے اس کا اثر پوری قوم و ملت پر پڑے گا کیونکہ ہر ملک میں محنت کرنے والے طبقے ہی کی اکثریت ہوتی ہے خواہ وہ دماغی کام کرنے والے ملازمین ہوں خواہ جسمانی محنت کرنے والے مزدور۔ مزدور کو کتنی اجرت ملنی چاہیے؟ دوسرے لفظوں میں اجرت کا تعین

---

[1] ملٹن برگس اینڈ پرسی جورڈن: اکنامک ہسٹری آف انگلینڈ باب ۵ صفحہ ۱۲۳ اڈیشن ۱۱ سنہ ۱۹۳۴ء۔

کیونکر ہوتا ہے اس سے متعلق معاشین میں اختلاف رائے ہے اور ابھی وہ کسی قطعی فیصلے تک نہیں پہنچے ہیں، اس بارے میں اسلامی معاشیات آجروں سے یہ خواہش کرتی ہے کہ جہاں تک اجرت میں اضافہ کرسکتے ہوں کریں اس میں کمی نہ کریں تاکہ خوراک، لباس، مکان فراہم نہ ہونے سے عام طبقہ جس مصیبت میں مبتلا ہے اس سے نجات پائے اس بارے میں اسلام نے جو احکام دیئے ہیں ان کے بلند معیار کا اندازہ بخاری کی اس روایت سے ہوتا ہے۔

هُمْ اِخْوَانُكُمْ جَعَلَهُمُ اللّٰهُ تَحْتَ أَيْدِيكُمْ۔ فَمَنْ جَعَلَ اللّٰهُ أَخَاهُ تَحْتَ يَدِهِ فَلْيُطْعِمْهُ مِمَّا يَأْكُلُ، وَلْيُلْبِسْهُ مِمَّا يَلْبَسُ، وَلَا يُكَلِّفْهُ مِنَ الْعَمَلِ مَا يَغْلِبُهُ۔ فَإِنْ كَلَّفَهُ مَا يَغْلِبُهُ فَلْيُعِنْهُ عَلَيْهِ[1]	وہ (مزدور) تمہارے بھائی ہیں ان کو خدا نے تمہارے ماتحت کیا ہے۔ پس جس کے ماتحت خدا نے اس کے بھائی کو کیا ہے اس کو چاہیے کہ وہ جو خود کھاتا ہو اس کو بھی کھلائے اور جو خود پہنے وہی اس کو بھی پہنائے۔ اور جو کام اس کی طاقت سے باہر ہو اس کی اسے تکلیف نہ دے اور اگر تکلیف دے تو پھر اس کی مدد کرے۔

اس صاف اور غیر مبہم رہنمائی سے ذیل کے امور بنیادی اصولوں کی صورت اختیار کرسکتے ہیں۔

۱ - آجر مزدوروں کو اپنا بھائی سمجھیں اور دونوں میں تعلقات کی نوعیت ایسی ہو جیسے کہ بھائی بھائی میں ہونی چاہیے۔

۲ - کم از کم کھانے پینے پہننے کی حد تک دونوں کی معاشی سطح برابر ہو۔ آجر جو خود کھائے وہی مزدور کو بھی کھلائے اور جو خود پہنے وہی مزدور کو بھی پہنائے۔

۳ - وقت اور کام دونوں کے حساب سے مزدور پر اتنا بوجھ نہ ڈالا جائے جو اس کو تھکا دے، یہ ایسی رہنمائی ہے جس سے اس زمانے میں بھی

---

[1] بخاری پ۱ کتاب الایمان، بخاری پ۲۵ کتاب الادب نیز بخاری پ۱۰ کتاب العتق۔ بخاری کے علاوہ مسلم، ابوداؤد اور ترمذی وغیرہ میں بھی یہ حدیث ہے۔

وقت اور کام کی نوعیت کے مسئلہ کو طے کیا جا سکتا ہے۔

۴۔ اگر کوئی کام ایسا پیش آجائے جس کی انجام دہی میں مزدوروں کو دشواری ہو تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس کام کو نہ کرایا جائے اور نہ یہ مطلب کہ چاہے مزدور پر کچھ ہی کیوں نہ گزر جائے لیکن وہ کام اسی سے لیا جائے ایسی صورت میں جہاں تک ہو سکے مزدوروں کی اعانت اور مدد کرنی چاہیے۔

ہر شخص کو روزانہ کتنا اور کتنے گھنٹے کام کرنا چاہیے؟ اس کی نسبت وہ رسول کریم سے یہ سوال کیا گیا کہ خدا کو کونسا عمل پسندیدہ ہے؟ فرمایا دوامی عمل اگرچہ قلیل ہو اور فرمایا کہ جس قدر تم بآسانی کام کرسکو اتنے کا التزام کرلیا کرو[1] یہی گویا قاعدۂ کلیہ قرار پائے گا۔

معاشین بیان کرتے ہیں اور عام مشاہدہ بھی یہی ہے کہ کسی ملک کے کسی حصے میں مزدوروں کی تعداد، کاروبار کے مقابلے میں زیادہ ہو تو اجرتیں گر جاتی ہیں۔ قرآن مجید نے اس کا ایک حل تو یہ پیش کیا ہے کہ مزدوروں کی ملک میں ایسی آزادانہ نقل و حرکت ہو کہ اس میں کچھ رکاوٹ نہ ہو یعنے توطن داخلی و خارجی کے ذریعے اجرتوں کے معیار کو گرنے سے روکا جائے اور مزدور کو اس بات کا پورا پورا حق دیا جائے کہ اس کو جہاں اجرت زیادہ ملے وہ وہاں چلا جائے۔

وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِي الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِيْرًا وَّ سَعَةً	جو کوئی خدا کی راہ میں ہجرت کرتا ہے تو روئے زمین پر مرفہ الحالی اور کشادگی پاتا ہے۔

قرآن پ۵ النساء ۴ ع ۱۴

اگر ایک طرف توطن کے ذریعہ اجرت کے معیار کو گرنے سے روکا گیا ہے تو دوسری طرف خود حکومت پر یہ لازم کیا گیا ہے کہ بے روزگار مزدوروں اور غریب طبقے کے روزگار کا انتظام زکات وغیرہ کے ذریعہ کیا جائے۔

بیورج اسکیم :۔ مزدوروں کی مرفہ الحالی کے لیے سر ولیم بیورج نے حال ہی میں

---

[1] بخاری پ۲۶ کتاب الرقاق۔

جو تجویزیں پیش کی ہیں ان کا دنیا بھر میں بہت چرچا ہے اور اسے ایک بہت بڑی انقلابی تجویز سمجھا جا رہا ہے۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد انگلستان ہی پہلا ملک تھا جس نے مزدوروں کی بیکاری کے بیمہ کی تجویز منظور کی تھی اور جس کی رو سے بیکاری کے چند مہینوں میں مزدوروں کو حکومت کی جانب سے کچھ مالی امداد بھی دی جاتی تھی۔ یہ طریقہ انگلستان میں ڈول (بے روزگاری میں سرکاری امداد) کے نام سے موسوم ہے دوسرے لفظوں میں پہلی جنگ عظیم سے پہلے بیکار مزدوروں کے لیے ان کی روزی مہیا کرنے کا حکومت کی جانب سے کوئی انتظام نہ تھا بیورج اسکیم جس کا آج کل اس قدر چرچا سنا جا رہا ہے اس کے اچھے اصول آج سے ۱۳۶۰ سال پہلے اسلامی نظام معیشت میں عملی طور پر رائج تھے۔ حضرت عمرؓ نے تو باقاعدہ اس کا اندازہ کرنے کے لیے کہ اوسطاً روزانہ ایک شخص کے لیے غذا کتنی کافی ہوسکے گی تجربے بھی کیے تھے تاکہ اسی حساب سے روزینے مقرر کیے جائیں اس کی تفصیل اسی باب میں آگے آئے گی۔

غرض "اسلام کے معاشی نظام میں غریبوں کے لیے کافی روزی بہم پہنچانے کی ذمہ داری لی گئی ہے۔ اسلامی تعلیمات کے مطابق ہر جاندار کی روزی کا مدار خدائے رزاق پر ہے چنانچہ خدائے تعالیٰ حکم دیتا ہے کہ

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ۔	(اپنے بچوں کو مفلسی سے ڈر کر قتل نہ کرو ہم ان کو اور تم کو روزی دیتے ہیں)۔

پ ۱۵ بنو اسرائیل ۱۷ ع ۴

نیز یہ کہ

نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا۔	ان کی دنیاوی زندگی میں ہم نے ان کی روزی تقسیم کی۔

قرآن پ ۲۵ الزخرف ۴۳ ع ۳

اسی بنا پر اسلامی حکومت کو گویا خداوند تعالیٰ کی جانب سے یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ زکات یا موئی محصول کے ذریعہ اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہوسکے۔[1]

---

[1] ایم حمید اللہ، اسلامس سولیوشن آف دی بیسک اکنامک پرابلمس اسلامک کلچر جلد ۱۰، اپریل ۱۹۳۶ء

اسلامی معاشرہ میں زکات کا کیا مصرف ہے؟ اور اس کا کیا منشاء ہے؟ اس سے متعلق "مالیات عامہ" کے باب ۷ میں وضاحت کی گئی ہے البتہ یہاں صرف یہ اشارہ کردینا کافی ہے کہ زکات مال داروں سے لی جاتی ہے اور ناداروں کو دی جاتی ہے کہ

تُؤخَذُ مِنْ اَغْنِیَائِهِمْ فَتُرَدُّ عَلٰی فُقَرَائِهِمْ۔ مال داروں سے لی جائے گی اور ناداروں کو دی جائے گی۔

زکات کا نظام آجروں کی قوت مقابلہ کا خاتمہ کردینا ہے۔ یہ ان کے لیے بے سود ہوگا کہ کارخانے بند کرکے مزدوروں کو شکست دیں، لازمی طور پر حکومت ان پر محصول لگائے گی اگر وہ کارخانے بند کرکے مزدوروں کو شکست دینے کی کوشش کریں۔ یہ ظاہر ہے کہ مملوکہ جائداد پر محصول لگایا جاتا ہے اور اس طرح ان کی جائداد پر بھی محصول لگایا جائے گا اور وہ منقسم ہوتی جائے گی اس لیے عملاً وہ مزدوروں کو پوری اتنی اجرت دے دیں گے جتنی کہ انھوں نے پیدائش دولت میں مدد دی ہے۔[1]

اجرتوں کو معیار سے گرنے نہ دینے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ مزدوروں کو آزادی پیشہ کا خیال رہے۔ اسلام نے مزدوروں کو پیشہ کی جو آزادی عطا کی ہے اس کا مطلب یہ نہیں ہوسکتا کہ کسی پیشہ میں ضرورت سے زیادہ لوگ جمع ہوں ضرورت کے مطابق لوگوں کا پیشہ اختیار کرنا چاہیے، قدرتاً ہوگا بھی یہی۔ اس کی وضاحت پیدائش دولت کے باب ۳ میں محنت اور آزادی پیشہ کے تحت بیان ہوچکی ہے۔

اجرت کے معیار کو بلند کرانے کے لیے اعلیٰ کارکردگی کا ہونا لازمی ہے اسلام نے معیار کارکردگی بڑھانے کے لیے جو تعلیم دی ہے اس کی وضاحت بھی "پیدائش دولت" کے باب ۳ میں محنت کے تحت ہوچکی ہے۔

غرض ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کے غریب مفلس اور

---

[1] ایم۔ حمید اللہ: اسلامس سلیوشن آف دی بیسک اکنامک ڈیلس اسلامک کلچر اپریل ۱۹۳۶ء

مزدور پیشہ طبقے جن کو آنحضرتؐ کے ابتدائی زمانہ میں کھانے کے لیے کھانا، پہننے کے لیے کپڑا اور رہنے کے لیے مکان بھی نہ تھا اور جن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آنحضرتؐ نے دعا فرمائی تھی کہ "پروردگار! یہ لوگ بھوکے ہیں انھیں سیر کر، یہ ننگے ہیں انھیں کپڑے پہنا، یہ پیادہ پا ہیں انھیں سواری عطا فرما" آخر نبوت کے آخری دنوں میں اور خلفاء راشدینؓ کے دور میں دولت مندی کے بھی بلند ترین مقام پر پہنچ گئے چنانچہ "ابو مسعود انصاریؓ کہتے ہیں کہ اگر رسول کریمؐ کبھی صدقہ کا حکم دیتے تھے تو ایسا بھی ہوتا کہ ہم میں سے کوئی بازار جاتا اور بوجھ اٹھاتا اور اسے مزدوری میں ایک مد غلہ وغیرہ مل جاتا اسی سے وہ صدقہ بھی دیتا لیکن آج ان میں سے کچھ لوگوں کے پاس ایک لاکھ درہم موجود ہیں۔ شقیق (راوی حدیث) کہتے ہیں کہ میں سمجھتا ہوں کہ ابو مسعودؓ نے یہ اپنا ہی حال بیان کیا[1]" اس قسم کے واقعات سے حدیثیں اور اسلامی تاریخیں بھری پڑی ہیں بیشک یہ ایک "مزدور راج" ہی تھا مزدور طبقے کا گویا ایک عہد زریں تھا۔ اسس میں آج بھی دنیا بھر کے مزدوروں کے لیے ایک سبق، ایک مثال اور ایک بہتری کے آجر کم سے کم کتنی اجرت دینا پسند کرے گا؟ اس سلسلے میں حجاج بن یوسف المتوفی ۹۵ھ کے دور کا یہ ایک واقعہ سننے کا ہے "عراق کے ایک قدیم شہر انبار کے کسانوں نے عراق ایران کے فاتح سعد بن ابی وقاصؓ سے اپنے لیے ایک نہر کھدوا دینے کی درخواست کی اور انھوں نے کسریٰ (شاہ ایران) سے بھی یہ درخواست کی تھی، سعد بن ابی وقاصؓ نے سعد بن عمرو بن حزام کو نہر کھدوانے کا حکم دیا چنانچہ انھوں نے اس کام کے لیے مزدوروں کو جمع کیا، کھدوائی شروع ہوئی یہاں تک کہ وہ کھودتے کھودتے ایک ایسے پہاڑ تک پہنچے جسے کھود ڈالنا ان کے بس کی بات نہ تھی اس لیے کام بند کر دیا گیا" "پھر جب حجاج بن یوسف عراق کا گورنر ہوا تو اس نے ہر طرف سے مزدوروں کو جمع کیا اور اپنے تعمیرات کے منتظموں سے کہا کہ کھودنے والوں میں سے

---

[1] بخاری پ ۹ کتاب السلم۔

ہر ایک مزدور جتنا کھاتا ہے اس کی قیمت کا اندازہ کرو اگر اس کی خوراک (راشن) کی اجرت اس کے روزانہ کام کے مثل ہو تو کام جاری رکھا جائے ورنہ بند کر دیا جائے اس ہدایت کے بموجب سعد اس کام پر روپیہ صرف کرتے رہے یہاں تک کہ نہر بن بنا کے پوری ہو گئی ہے[1]

اسلام میں آجر اور مزدور کے تعلقات:- آجر اور مزدور کے درمیان جو تعلقات ہونے چاہئیں اس کا تذکرہ بھی ضروری معلوم ہوتا ہے اس سلسلہ میں قرآن مجید نے دو پیغمبروں کی زندگیاں بطور نمونہ پیش کی ہیں ایک کو آجر اور دوسرے کو مزدور کی شکل میں مزدور کی صفات طاقتوری اور امانت داری بیان کی گئی ہیں۔

قَالَتْ اِحْدٰىهُمَا يٰٓاَبَتِ اسْتَاْجِرْهُ اِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَاْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْاَمِيْنُ۔

پ ۲۰ القصص ۲۸ ع ۳

ان دو لڑکیوں میں سے ایک نے کہا کہ اے میرے باپ تم اسے مزدوری پر رکھ لو۔ بے شک جنھیں تم مزدور بناؤ ان میں وہی بہتر ہے جو طاقتور اور امانت دار ہو۔

اور آجر کے صفات یہ بیان کیے گئے ہیں کہ

وَمَآ اُرِيْدُ اَنْ اَشُقَّ عَلَيْكَ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ۔

قرآن پ ۲۰ القصص ۲۸ ع ۳

میں تم پر سختی کرنی نہیں چاہتا بخدا تم مجھے نیکو کار پاؤ گے۔

گویا اسلامی مملکت کی حدود کے اندر یا اسلامی معاشرہ میں آجر اور مزدور کے جو تعلقات ہونے چاہئیں یہ ان کا نچوڑ ہے۔ جس سے چاہیں تو اجرت و سرمایہ کی پیچیدگیوں کا حل پیدا کر سکتے ہیں نیز یہ کہ آجر کا برتاؤ مزدور کے ساتھ بالکل ہمدردانہ بلکہ برادرانہ ہو۔ "مسلمان مسلمان کا بھائی ہے۔ اس پر ظلم نہ کرے"[2]

نیز یہ کہ

---

[1] - بلاذری: فتوح البلدان صفحہ ۲۷۴ جلولا کی جنگ

[2] - بخاری پ ۹ کتاب المظالم والقصاص نیز مسلم، کتاب البر۔

لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتّٰى يُحِبَّ لِأَخِيْهِ مَا يُحِبُّ لِنَفْسِهٖ۔[1] تم میں سے کوئی ایمان دار نہ ہو گا جب تک کہ اپنے مسلمان بھائی کے لیے وہی نہ چاہے جو اپنے لیے چاہتا ہے۔

ان اقوال سے قطع نظر نوکروں کے متعلق یہ حکم ہوا ہے کہ اگر نوکر ستر دفعہ روزانہ قصور کرے تو درگزر کی جائے "رسول اکرمؐ کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا اور پوچھا کہ اے اللہ کے رسول! کتنی مرتبہ میں اپنے نوکر کا قصور معاف کروں؟ رسول اکرمؐ خاموش رہے۔ دوبارہ عرض کی کہ اے اللہ کے رسول! کتنی مرتبہ میں اپنے نوکر کا قصور معاف کروں؟ فرمایا: روزانہ ستر دفعہ (مراد بکثرت)"[2]

نیز بطور عام ارشاد ہوا کہ

اِرْحَمُوْا مَنْ فِي الْاَرْضِ يَرْحَمْكُمْ مَنْ فِي السَّمَاءِ[3]

حدیث بالا کو مولانا حالی نے نظم میں بیان کیا ہے کہ ؎

کرو مہربانی تم اہلِ زمین پر ٭ خدا مہرباں ہو گا عرشِ بریں پر

ان اقوال کے بموجب برادرانہ تعلقات کے ذریعہ سے ہی آجر اور مزدور کی درمیانی خلیج کو پاٹا جا سکتا ہے۔

رسول کریمؐ کا اپنے ملازموں کے ساتھ برتاؤ

قرآن کی تعلیم اور خود رسول اللہؐ کے اپنے اقوال کی روشنی میں رسول اللہؐ کے عمل کو دیکھا جائے تو قرآن کا پرتو ہی نظر آتا ہے آجر کا کردار جو قرآن میں بیان ہے اس کا تذکرہ ہو چکا۔

حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ "جب رسول کریمؐ مدینہ میں تشریف لائے تو ابو طلحہؓ میرا ہاتھ پکڑ کر رسول کریمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ یا رسول اللہ! یہ انس سمجھدار لڑکا ہے آپ کی خدمت کریگا۔ انسؓ کہتے ہیں کہ چنانچہ سفر و حضر میں

---

[1] بخاری پ۱ کتاب الایمان۔

[2] ترمذی، ابواب البر والصلۃ۔ قال ابو عیسٰی ہٰذا حدیث حسن صحیح۔

[3] بخاری پ۲۵ کتاب الادب نیز ترمذی

میں نے حضور اکرمؐ کی خدمت کی اور بخدا کبھی حضورؐ نے کبھی کسی کام کو جو میں نے کیا یہ نہیں فرمایا کہ یہ تو نے کیوں کیا اور کبھی کسی کام کو جو میں نے نہ کیا یہ نہیں فرمایا تو نے کیوں نہ کیا؟[1] حضرت انسؓ نے ہی کہا ہے کہ "میں حضورؐ کی خدمت میں دس برس رہا۔ حضورؐ نے کبھی اونھ! تک نہ کہا اور نہ یہ فرمایا کہ یہ کیوں کیا اور یہ کیوں نہ کیا"[2]

حضرت انسؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول کریمؐ سب لوگوں سے زیادہ ملنسار تھے ایک دن آپ نے کسی کام پر جانے کے لیے مجھ سے ارشاد فرمایا۔ میں نے کہا خدا کی قسم! میں تو نہ جاؤں گا۔ لیکن دل میں یہی تھا کہ جس کام کے لیے بھی آپ حکم دیں جاؤں۔ آخر میں چلا یہاں تک کہ مجھے بازار میں چند بچے کھیلتے ہوئے ملے (اور میں وہیں ٹھہر گیا) ناگاہ رسول اللہؐ نے پیچھے سے آکر میری گردن تھامی۔ میں نے آپ کی طرف دیکھا کہ آپ مسکرا رہے تھے۔ آپ نے فرمایا اے انس (پیارے انس) کیا تو وہاں نہ جائے گا جہاں میں نے جانے کا حکم دیا تھا؟ میں نے عرض کی جی ہاں! جاتا ہوں یا رسول اللہ[3]

ابوطفیل کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ میں نے رسول اللہؐ کو مقام جعرانہ میں گوشت تقسیم فرماتے دیکھا، ناگاہ ایک عورت آئی اور آپ کے بالکل قریب پہنچ گئی رسول کریمؐ نے اس کے لیے اپنی چادر بچھا دی اور وہ اس پر بیٹھ گئی۔ میں نے پوچھا یہ کون ہے؟ لوگوں نے کہا یہ وہ ہے جس نے آپ کو دودھ پلایا تھا[4]

غیر مسلم ملازم کی عیادت

رسول کریمؐ اپنے ملازمین کی بھی عیادت کرتے تھے اس سلسلہ میں بخاری کی یہ حدیث ہمارے لیے سبق آموز ہے کہ "رسول اکرمؐ ایک یہودی لڑکے کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے جو آپؐ کی خدمت کرتا تھا"[5]

یہ تو آپ کا خلق عظیم تھا جو خانگی زندگی میں ذاتی خدمت گاروں وغیرہ کے ساتھ مرعی ہوتا تھا لیکن زکوٰۃ وصول کرنے کے لیے جو کلکٹر وغیرہ مقرر کیے جاتے تھے ان سے آپ ضابطے کے بموجب حساب کتاب

۱ - بخاری پ۲۸ کتاب الدیات نیز بخاری پ۱۱ کتاب الوصیت - ۲ بخاری پ۲۵ کتاب الادب۔ ۳ مسلم - ۴ ابوداؤد ۵ - بخاری پ۵ کتاب الصلوٰۃ -

طلب فرماتے تاکہ کوئی کوتاہی اور تغافل نہ ہو اور نظم وضبط قائم رہے۔

حضرت عمرؓ نے اپنی خلافت کے زمانے میں ایسا نظم وضبط رکھا تھا کہ گورنروں کا برتاؤ اور انتظام ذرا بھی بگڑتا تو آن کی آن میں اطلاع پہنچ جاتی تھی۔ ایک مرتبہ سپہ سالار اور فاتح مصر یعنی عمرو بن العاصؓ سے کسی معاملہ میں جواب طلب کرنے کے لیے محمد بن مسلمہ کو بھیجا ....

"محمد بن مسلمہ نے کہا خاموش! اگر یہ ابن حنتمہ کا زمانہ نہ ہوتا جس سے تم کراہت کرتے ہو تو تم گھر کی انگنائی میں اس حال میں پائے جاتے کہ بکری کی ٹانگیں تمہاری ٹانگوں میں ہوتیں اس کے دودھ کی زیادتی تمھیں خوش کرتی اور اس کی کمی تمھیں ناخوش کرتی۔"

"عمرو بن العاص نے کہا خدا کے لیے یہ بات عمرؓ سے نہ کہنا، مجالس کی گفتگو کے لیے امانت ضروری ہے۔"

"محمد بن مسلمہ نے کہا کہ جو باتیں مجھ میں اور تم میں ہوئی ہیں عمرؓ کے جیتے جی نہ کہوں گا۔"[1]

صحابہ کے دور میں غذائی مساوات

اس موقع پر بے محل نہ ہوگا اگر محنت کرنے والے طبقہ کے ساتھ صحابۂ کرام کے برتاؤ پر بھی نظر ڈالی جائے۔ رسول اللہؐ کی زندگی کا جو مشن تھا اس کی کامیابی کا اندازہ اس بات سے بھی ہوسکتا ہے کہ خود رسول اللہؐ کے زندگی میں ہی سینکڑوں لوگوں نے اپنی نجات کا ذریعہ تا امکان رسول اللہؐ کی پیروی کو قرار دے لیا رسول اللہؐ کے "خلق قرآنی" کا پرتو صحابہ کی زندگیوں میں اس طرح جلوہ گر ہے کہ آج بھی اگر کوئی ان کی پیروی کرے تو بے شبہ دنیا امن عافیت اور اخوت کے نور سے چمک اٹھے گی۔

"عتبہ بن فرقد نے اس زمانہ کے روسی ترکستان کا علاقہ آذربیجان فتح کیا تو انھوں نے دو بڑی ٹوکریوں میں مٹھائی بھر کر ان کو جھڑے اور مندے سے منڈھا اور

---

[1] بلاذری: فتوح البلدان صفحہ ۲۱۹ فتوح مصر والمغرب ۱۵۲۵۰

اپنے آزاد کردہ غلام سحیم کے ذریعہ حضرت عمرؓ کی خدمت میں بھیجا۔ سحیم جب حضرت عمرؓ کے پاس پہنچے تو انھوں نے پوچھا کہ تم میرے پاس کیا لائے ہو؟ درہم یا دینار؟ پھر کھولنے کا حکم دیا۔ مٹھائی چکھی اور کہا مزا اچھا ہے لیکن کیا یہ مٹھائی تمام مہاجرین نے بھی سیر ہو کر کھائی؟ انھوں نے کہا جی نہیں، یہ تو آپ ہی کے لیے بھیجی ہے، اس پر انھوں نے عتبہ کو لکھا:

اللہ کے بندے امیر المومنین کی جانب سے عتبہ بن فرقد کو

اما بعد: یہ نہ تو تمھاری کوشش اور مشقت کا پھل ہے نہ تمھاری ماں کی کوشش اور مشقت کا اور نہ تمھارے باپ کی کوشش و مشقت کا ہم کوئی ایسی چیز نہیں کھاتے جو تمام مسلمانوں کے گھروں میں کافی مقدار میں نہ ہو[1]

یہی عتبہ بن فرقد جو بعد میں کسی صوبے کے گورنر بنے حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے، حضرت عمرؓ اس وقت خاصہ تناول فرما رہے تھے، انھیں اندر ہی بلا لیا۔ حضرت عمرؓ کی معمولی غذا کو دیکھ کر گورنر عتبہ نے کہا کہ "آپ کھانے میں کیا ایسی غذا نہیں استعمال کرتے جس کو سپید کہتے ہیں؟ حضرت عمرؓ نے پوچھا اے ابن فرقد! کیا عرب میں مجھ سے زیادہ کوئی اقتدار رکھنے والا ہے؟ اس نے کہا: اے امیر المومنین! آپ سے زیادہ اقتدار رکھنے والا کون ہے؟ حضرت عمر فاروقؓ نے کہا کہ کیا سارے مسلمانوں کو میدہ میسر آسکتا ہے؟ اس نے کہا نہیں۔ فاروق اعظمؓ نے کہا کہ میں بہت ہی برا حاکم ہوں گا اگر اچھا تو میں کھاؤں اور لوگوں کو بری خراب غذا کھلاؤں[2]

حضرت عمرؓ ہی کے عہد خلافت میں ایک مرتبہ ایک سخت قحط پڑا جو تاریخوں میں "عام الرمادہ" کے نام سے مشہور ہے، مورخین کا بیان ہے کہ پبلک کو کافی مقدار میں گوشت نہ ملنے پر خود حضرت عمرؓ نے گوشت کا استعمال ترک کر دیا تھا اور بجائے گھی کے صرف تیل استعمال کرتے تھے، تیل کے استعمال سے

---

[1] - بلاذری: فتوح البلدان صفحہ ۲۲۸ -

[2] تاریخ طبری، عہد فاروقی صفحہ

امیر المومنین کے چہرے کی رنگت تک بدل گئی تھی[1]

جنگ ایران میں جب کہ جنرل ابو عبیدہ بن الجراحؓ مسلمانوں کے سپہ سالار تھے، چند ایرانی عہدہ دار آپ کی خدمت میں کھانے اور حلوے تیار کر کے لائے ابو عبیدہؓ نے پوچھا: کیا تم نے ہماری فوج کے اعزاز میں بھی ایسی ہی دعوت کی ہے؟ انھوں نے جواب دیا: نہیں، ابو عبیدہؓ نے وہ دعوت مسترد کر دی اور کہا کہ ہم کو اس کی ضرورت نہیں، ابو عبیدہ بہت برا شخص ہوگا اگر وہ اُن لوگوں کو چھوڑ کر جو خون بہانے میں ساتھ ہیں کوئی چیز اپنی ذات خاص کے لیے حاصل کرے، بخدا! ابو عبیدہ اُن چیزوں سے جو خدا نے مسلمانوں کو عطا کی ہیں وہی کھا سکتا ہے جو سب مسلمان کھائیں گے[2]

یہاں یہ بات بھی باعث دلچسپی ہوگی کہ قحط کے زمانے میں حضرت عمرؓ نے باقاعدہ راشن بندی کا نفاذ کیا تھا لیکن راشن کی مقدار یونہی محض بآرام کرسی پر بیٹھ کر طے نہیں کی بلکہ باقاعدہ تجربے کیے کہ ہر شخص مہینہ بھر میں کتنی غذا اٹھا سکتا ہے؟ پھر اسی لحاظ سے ہر شخص کے لیے غذا کی مقدار مقرر کی، اس کی تفصیل مبادلہ دولت کے باب میں کی گئی ہے۔

جب ہر شخص کو پیٹ بھر کر غذا ملنے لگے تو اس صورت میں نہ چور بازار میں جانے کی حاجت نہ مصنوعی راشن کارڈ بنانے کی ضرورت۔ یوں چور بازار بھی پنپ نہیں سکتا اور پھر سرمایہ دار تاجر چور بازاری کے ذریعہ غریبوں کی دولت سمیٹ نہیں سکتے۔

---

[1] طبقات ابن سعد صفحہ ۲۳۴ ج ۳ عمرؓ نیز سیوطی، تاریخ الخلفاء حالات عمر فاروقؓ نیز طبری صفحہ ۲۵۷۳
"اس دورِ ظلمت میں جب کہ معمولی معمولی افسر اور لیڈر جو قوم کے غم میں گھلے جاتے ہیں حکام کے ساتھ اور چور بازار سے خرید خرید کر بہتر سے بہتر غذا استعمال کرتے ہیں ایں ہم غنیمت است کہ وزیر اعظم انڈیا یونین ۵۰٪ گیہوں استعمال کرتے ہیں۔ پنڈت نہرو نے کہا کہ میں ایک ایسی غذا استعمال کرتا آ رہا ہوں جو ۵۰٪ گیہوں اور متبادل غذا کے طور پر ۲۰٪ آلو اور مونگ پھلی پر مشتمل ہے"
ہندوستان ٹائمز مورخہ ۷ مارچ سنہ ۱۹۴۹ء

[2] تاریخ طبری عہد فاروقی صفحہ ۲۱۳۲ تا ۲۱۳۳

محنت کرنے والے طبقہ کو خواہ جسمانی محنت کرنے والا ہو خواہ دماغی محنت کرنے والا اگر پیٹ بھر غذا نہ ملے اس کی کارکردگی کا معیار بلند نہیں ہو سکتا۔ ملک میں خاطر خواہ دولت پیدا نہیں کی جا سکتی نتیجہ میں ملک افلاس اور نکبت کی دلدل میں پھنسا رہتا ہے۔

لباس میں مساوات

"معرور کہتے ہیں کہ میں نے ایک چادر ابو ذر غفاریؓ کو اور اسی قسم کی ایک اور چادر ان کے غلام کو اوڑھے ہوئے دیکھ کر ابو ذرؓ سے کہا کہ اگر تم اس چادر کو بھی لے کر اوڑھ لیتے تو اس چادر کی جوڑی ہو جاتی، اور اس کو کوئی اور کپڑا دیے ہوتے۔"

"ابو ذرؓ نے کہا کہ میں نے ایک دن ایک شخص کی ماں کو جو غیر عربیہ تھی کچھ (برا بھلا) کہہ دیا، اس شخص نے حضور کریمؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر اس کی شکایت کی۔ حضور اکرمؐ نے مجھ سے ارشاد فرمایا کہ کیا تم نے فلاں عورت کو برا کہا ہے؟ میں نے کہا: ہاں!"

حضور کریمؐ نے فرمایا کہ تم میں ابھی جاہلیت کی بو باقی ہے میں نے کہا کیا میرے اس بڑھاپے کے زمانہ میں؟"

"فرمایا: ہاں! وہ تمھارے بھائی ہیں پس جس کے ماتحت خدا نے اس کے بھائی کو کیا ہو تو چاہیے کہ جو خود کھائے وہی اس کو بھی کھلائے اور جو خود پہنے وہی اس کو بھی پہنائے اور جو کام اس کی طاقت سے باہر ہو اس کی اسے تکلیف نہ دے اور اگر تکلیف دے بھی تو اس میں خود بھی اس کی مدد کرے[1]

یہ مشہور واقعہ ہے کہ فاروق اعظمؓ سے بھرے مجمع میں ایک شخص نے سوال کیا کہ کیا وجہ ہے کہ امیر المومنین کو تو دو کپڑے ملیں اور مجھ غریب کو ایک ہی۔ کوئی معمولی انسان ہوتا تو اس کی تیوری میں بل پڑ جاتے لیکن عمر فاروقؓ نے پہلے تو خدا کا شکر ادا کیا کہ ملت اسلامیہ میں ایسے بھی لوگ ہیں جو خلیفہ وقت پر بھی تنقید کرتے ہوئے نہیں جھجکتے۔ پھر اپنے صاحبزادے کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا کہ

---

[1] ۔ بخاری ش پ ۲۴ کتاب الادب نیز مسلم، ابوداؤد، ترمذی۔۔

اس تنقید کا جواب دیں۔ صاحبزادے نے کھڑے ہو کر نہایت خندہ پیشانی سے جواب دیا کہ امیر المومنین کو بھی عام مسلمانوں کی طرح ایک ہی کپڑا ملا تھا چونکہ امیر المومنین دراز قد ہیں اس لیے میں نے اپنا کپڑا انھیں دے دیا۔

سرمایہ دارانہ ماحول میں پرورش پانے والے ممکن ہے کہ لباس اور غذا میں مساوات کو ناممکن سمجھیں لیکن خود سرمایہ دارانہ معاشرہ میں فوج کے معمولی سپاہی سے لیکر کرنل اور جنرل تک ڈریس کے لیے خاکی کپڑا ہی استعمال کیا جاتا ہے۔

آج بھی اکثر مسلم گھرانوں میں آقا جو کھانا کھاتا ہے ملازم کو بھی وہی کھانا دیتا ہے۔

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ صدقۂ فطر میں عید الفطر کے پہلے دن محتاجوں اور غریبوں کو وہی غذا دینے کا حکم ہے جو عام طور پر لوگ کھاتے پیتے ہیں[1] رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھی یہی طریقہ جاری تھا اور آج بھی تمام اسلامی دنیا میں یہی عمل درآمد ہے کہ لوگ جو خود کھاتے ہیں وہی غریبوں اور محتاجوں میں تقسیم کرتے ہیں مثلاً گیہوں کھاتے ہوں تو گیہوں، چاول کھاتے ہوں تو چاول یہ نہیں کہ خود تو بہترین قسم کے چاول استعمال کریں اور غریبوں میں لال یا پیلی جوار تقسیم کر دیں[2]

---

[1] بخاری کتاب الزکات باب الفطر نیز ھدایہ ج ا کتاب الزکات باب الفطر۔

[2] صدر جمہوریہ روس اور مسلمان رعایا

کہا جاتا ہے کہ روس میں اشتراکیت کے آجانے سے مساوات کا دور دورہ ہے لیکن اس کی حقیقت ذیل کے واقعہ سے عیاں ہو سکے گی۔

ماسکو کی ایک اطلاع دو سال قبل شائع ہوئی تھی کہ صدر جمہوریہ روس نے قازان کا دورہ کیا جہاں کی آبادی مسلمان ہے اور خلافت عباسیہ کے زمانہ میں وہاں ایک اسلامی حکومت قائم رہی ہے اور اسی کو عرب مولف بلغار کہا کرتے ہیں " صدر جمہوریہ نے کسان قائد سے ملاقات کی اور کہا کہ میں صوبہ قازان کے ایک مقام میں وہاں کے (مسلمان) کسانوں کو مخاطب کر رہا تھا تو یکایک ایک عورت میرے سامنے آئی اور چلا کر کہنے لگی کہ تمھارے جوتے تو نئے اچھے ہیں مجھے جوتے کب ملیں گے

سواری میں مساوات

اس سلسلہ میں تاریخ کا ایک مشہور واقعہ قلمبند کیا جاتا ہے[1] جب فاروق اعظم معاہدۂ صلح کے لیے بیت المقدس روانہ ہوئے تو غلام کی سواری اور آپ کی سواری میں کچھ فرق نہ تھا۔ مورخ طبری کا بیان ہے کہ "حضرت عمر فاروقؓ مدینہ سے روانہ ہوئے اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو مدینہ میں اپنا نائب مقرر کیا اور چند صحابہ کو ساتھ لے کر روانہ ہوئے اور ایلہ (بیت المقدس) کی راہ لی۔ یہاں تک کہ بیت المقدس کے قریب پہنچے۔ آپ کا غلام بھی آپ کے ساتھ تھا۔ ایک منزل پر آپ اتر پڑے پھر غلام کے اونٹ پر سوار ہو گئے اور غلام کو اپنی سواری دے دی چنانچہ جب لوگ آپ سے ملنے کے لیے آئے تو پوچھتے کہ امیر المومنین کہاں ہیں؟ کہتے کہ تمہارے ہی سامنے ہیں لیکن بذات خود"[1]

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) میں نے اسے جواب دیا کہ کیا تم چاہتی ہو کہ صدر جمہوریہ پتلون میں ٹاپتا پھرے؟ آس پاس کے لوگوں نے بھی میری تائید کی اور کہا کہ ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، یہ احمق عورت اتنا تک نہیں سمجھتی۔ پھر میں نے ان لوگوں سے کہا کہ اگر تم چپلیں پہنو تو کوئی محسوس نہیں کرے گا لیکن اگر میں پہنوں تو ہر کوئی نظر ڈالے گا کہ ان کا قائد بے وقوف نکلا سمجھے گئے" (الہدیٰ مورخہ ۵ نومبر ۱۹۴۸ء) بحوالہ لندن ٹائمز۔

صدر جمہوریہ روس کو شاید یہ معلوم نہ ہوگا کہ قازان کی وہ مسلمان عورت حضرت عمرؓ کے دور کی خلیفہ اور رعایا میں مساوات کی روایات کو زندہ کرنا چاہتی ہوگی۔

[1] - تاریخ طبری صفحہ ۲۲ ج ۲ سنہ ۱۶ھ کے واقعات:

مسلمانوں کے ساتھ رہتے رہتے اپنائے وطن بھی اسلامی مساوات کے اعلیٰ تصور سے آہستہ آہستہ متاثر ہو رہے ہیں۔ ابھی چند دن کی بات ہے کہ حیدرآباد دکن کے ایک روزنامہ "آواز" میں حسب ذیل اطلاع شائع ہوئی تھی

تمیز بندہ و آقا فساد آدمیت ہے

ونئی دہلی ۶ مارچ ۱۹۴۹ء ہندوستان کے کمانڈر انچیف جنرل کے ایم کریپا کو روزانہ ہندوستان کی تمام زبانوں میں لاتعداد خطوط وصول ہوتے ہیں حال ہی میں ان کو تامل زبان کا ایک دلچسپ خط وصول ہوا ہے جس کا بڑی محنت سے ترجمہ کیا گیا۔ پوچھا گیا تھا کہ ہندوستان کے جنرل درجہ اول میں اور جوان درجہ سوم میں کیوں سفر کرتے ہیں؟" (آواز مورخہ ۷ مارچ ۱۹۴۹ء) بحوالہ اسوسی ایٹڈ پریس۔

غرض "اسلامی اشتراکیت انسانی اخوت اور مساوات پر بہت زور دیتی ہے"

اگر اسلامی اصول معاشیات کو صحیح طریقہ سے عملی جامہ پہنایا جائے تو ہر فرد بشر کے معاشی حقوق کا بہتر سے بہتر تحفظ ہو سکتا ہے۔ اشتراکیت سے الحاد کو دور کر دیا جائے تو اس کے باقی اچھے اصولوں میں ہم خالص اسلامی معاشیات کے قریب تر آجائیں گے۔

مزدوروں کی ترقی کے قوانین

مزدور اس لیے محنت کرتا ہے کہ اس کو اس کے معاوضہ میں اجرت ملتی ہے اور اجرت سے اس کی اور اس کے خاندان کی ضروریات پوری ہوتی ہیں۔ اگر اجرت کم ملے یا وقت پر نہ ملے تو مزدور کے جذبات کو ٹھیس لگنا لازمی ہے کیونکہ بعض ضرورتیں اور حاجتیں مثلاً غذا وغیرہ ایسی ہوتی ہیں کہ وقت پر ان کا پورا کرنا ضروری ہوتا ہے ضروریات زندگی کے بغیر انسانی زندگی ہی محال ہو جاتی ہے اسی لیے نبی کریمؐ نے فرمایا ہے کہ خدا نے فرمایا تین شخص ایسے ہیں کہ قیامت کے دن میں ان کا دشمن ہوں گا اس سلسلہ میں تیسرے کے متعلق فرمایا کہ

وَرَجُلٌ اِسْتَاجَرَ اَجِيْرًا فَاسْتَوْفٰی مِنْهُ وَلَمْ يُعْطِهٖ اَجْرَهٗ [1]

وہ شخص جو کسی مزدور کو اجرت پر لے پھر اس سے پورا کام لے لے اور اسے اجرت نہ دے۔

نیز آپ نے ہدایت فرمائی ہے کہ

اُعْطُوا الْاَجِيْرَ اَجْرَهٗ قَبْلَ اَنْ يَّجِفَّ عَرَقُهٗ [2]

مزدور کی مزدوری اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے ادا کر دی جائے۔

آئے دن مزدوروں اور کارخانہ داروں میں جو جھگڑے ہوتے رہتے ہیں ان میں سے ۷۵ فی صدی جھگڑے اجرت کی بنا پر ہوتے ہیں [3] اسی لیے اسلامی معاشیات کی رو سے

---

[1] بخاری پ ۹ کتاب السلم بروایت ابوہریرۃ۔ [2] ابن ماجہ نیز بیہقی ج ۶ کتاب الاجارہ صفحہ ۱۲۱

[3] ہندوستان کے سنہ ۱۹۳۰ء تک سرکاری اعداد و شمار سے ظاہر ہوتا ہے کہ آدھے سے زیادہ صنعتی جھگڑے آجر اور مزدور کے درمیان محض اجرت کی ادائی کے سلسلہ میں ہوئے تھے (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ریگولیشن آف ویجز اینڈ آدر پرابلمس آف انڈسٹریل لیبر ان انڈیا از ڈی۔ آر گیڈگل ایم اے، ایم لٹ (کنٹب)۔

مزدوروں کو کام پر لگانے سے پہلے اجرت کا تصفیہ ہونا ضروری ہے۔

اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ نَھٰی عَنِ الْاِسْتِجَارَۃِ الْاَجِیْرِ حَتّٰی یُبَیِّنَ لَہٗ اَجْرَہٗ[1]

رسول اکرمؐ نے اس بات کی ممانعت فرمائی کہ مزدور کی اجرت طے کیے بغیر اس کو کام پر لگایا جائے۔

حضرت انسؓ نے رسول اللہؐ کی اس خصوصیت کو خاص طور پر سراہا ہے کہ "آپ کسی کو اس کی مزدوری کم نہ دیتے تھے"[2] اگر آجر ان ہدایتوں پر عمل کرے تو یقین ہے کہ آجر اور مزدور کے آپس کے جھگڑے جو اجرت کے سلسلہ میں پیدا ہوتے ہیں ان کا بآسانی ازالہ ہو جائے۔

آپس کے تنازعوں کا تصفیہ حکومت کی مداخلت

مزدوروں اور کارخانوں کے مالکوں میں جھگڑے ہوں تو اسلامی حکومت کو ان کے تصفیہ کے لیے مداخلت کا حق حاصل ہے چنانچہ امام ماوردی لکھتے ہیں کہ "اگر کوئی شخص مزدور پر زیادتی کرے مثلاً اجرت کم دے یا کام زیادہ لے تو محتسب ایسا کرنے سے روکے اور دھمکائے اور دھمکانے کے مراتب حالات کے اعتبار سے ہوں اور اگر زیادتی مزدور کی طرف سے ہو مثلاً کم کام کرے اور زیادہ اجرت مانگے تو اس کو بھی روکے اور دھمکائے اور اگر ایک دوسرے کی بات کو جھٹلائے تو فیصلہ کا حق حاکم کو ہے"[3]

مزدور کو آجر سے شکایت ایک تو اجرت کی کمی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے دوسرے حد سے زیادہ ناقابل برداشت کام لینے سے ہو سکتی ہے اس سلسلے میں اسلامی شریعت نے جو احکام دیے ہیں اگر ان پر عمل ہو تو مزدور کی شکایتیں دور ہو جائیں چنانچہ رسول کریمؐ نے یہ حکم دیا ہے کہ۔

لِلْمَمْلُوْکِ طَعَامُہٗ وَکِسْوَتُہٗ بِالْمَعْرُوْفِ

غلاموں نوکروں کو دستور کے موافق غذا اور لباس دیا جائے۔

---

[1] بیہقی: السنن الکبریٰ ج ۶ کتاب الاجارہ صفحہ ۱۲۰ [2] بخاری پ ۹ کتاب السلم
[3] ماوردی الاحکام السلطانیہ باب ۲۰ احکام الاحتساب صفحہ ۲۴۷ نیز ابو یعلیٰ الاحکام السلطانیہ صفحہ

وَلَا یُکَلَّفُ مِنَ الْعَمَلِ اِلَّا مَا یُطِیْقُ [1] — اور ان پر کام کا اتنا ہی بار ڈالا جائے جتنا کہ وہ برداشت کر سکتے ہیں

حکومت کی نگرانی

جس طرح حکومت کو مزدوروں اور آجروں کے جھگڑوں میں دخل دہی کا حق ہے اسی طرح حکومت کو ان کے کام پر نگرانی رکھنے کا بھی حق حاصل ہے۔

ابو مسعود انصاری کا بیان ہے کہ ایک دن میں اپنے غلام کو مار رہا تھا کہ پیچھے سے آواز آئی کہ ابو مسعود! معلوم کر کہ خدا تجھ پر زیادہ قدرت رکھتا ہے میں نے جو منہ پھیر کر دیکھا تو رسالت پناہؐ تھے۔ میں نے جلدی سے عرض کی اے اللہ کے رسول! اس غلام کو میں نے خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے آزاد کر دیا۔ فرمایا اگر تو ایسا نہ کرتا تو دوزخ کی آگ تجھے جھلس دیتی [2]

حضرت عمرؓ ہر شنبہ کے دن (مدینہ کے) قرب و نواح میں جاتے اگر آپ وہاں کسی شخص یا غلام کو ایسے کام میں مشغول دیکھتے جو وہ برداشت نہیں کر سکتا تو آپ اس کے بار کو ہلکا کر دیتے تھے [3]

محتسب کو چاہیے کہ "اگر غلام اور باندیوں پر زیادتی ہو تو ان کے آقاؤں سے باز پرس کرے اور حکم دے کہ ان کی طاقت سے زیادہ کام نہ لیں" اسی طرح اگر مالک اپنے جانوروں کو پوری خوراک نہ دیں یا طاقت سے زیادہ کام لیں تو ان سے مواخذہ کرے [4]

حتیٰ کہ "ملاحوں کو کشتیوں میں اتنا لادنے کی کہ اس کی وسعت نہ ہو اور غرق ہونے کا خطرہ ہو تو محتسب اس کی مخالفت کر دے اسی طرح شدید ہوا کے وقت نہ چلنے دے [5] کچھ ایسے ہی ملتے جلتے احکام کا جہازوں، ہوائی جہازوں اور آب دوز کشتیوں پر اطلاق ہوگا۔

---

[1] امام مالک: موطا بروایت یحییٰ بن یحییٰ [2] مسلم [3] امام مالک: موطا باب فی الملک

[4] ماوردی: احکام السلطانیہ باب ۲۰ صفحہ ۲۴۴ احکام احتساب، مویشیوں سے اگر ایسا کام لیا جائے کہ دوا گا اس کو نہ کر سکیں تو محتسب اس کا انسداد اور آئندہ کو مانعت کر دے اگر مالک عومی ہو کہ اس کا جانور اس کام کا متحمل ہے تو محتسب اس کا امتحان کر سکتا ہے اگرچہ اس میں اجتہاد کی ضرورت ہے لیکن یہ عرفی ہے لوگوں کے عرف و رواج سے معلوم کر سکتا ہے (ماوردی باب ۲۰ صفحہ ۲۴۴)

[5] ماوردی: احکام السلطانیہ باب ۲۰ صفحہ ۲۴۴ احکام احتساب

حکومت کو چاہیے کہ مزدوروں کی صحت کا بھی خیال رکھے اس کا تو کچھ تذکرہ ہم "پیدائش دولت" کے باب۲ میں محنت کے تحت کر چکے ہیں یہاں بھی اس کی کچھ مزید وضاحت بے محل نہ ہوگی۔ خود آنحضرتؐ نے ایک یہودی لڑکے کی عیادت کی جو آپ کی خدمت کرتا تھا[1] حضرت عمرؓ کو بھی اس بات کا بڑا خیال رہتا تھا۔ آئے دن اسلامی صوبوں اور ضلعوں وغیرہ سے جو وفد آپ کی خدمت میں آیا کرتے تھے آپ ان سے اپنے مقرر کردہ افسروں کی بابت دریافت کرتے کہ آیا وہ اپنے فرائض کو بخوبی انجام دے رہے ہیں یا نہیں؟ ان سوالات میں ایک سوال یہ بھی ہوتا کہ آیا وہ غلاموں کی عیادت بھی کرتا ہے یا نہیں۔ اگر وہ جواب دیتے کہ افسر عیادت نہیں کرتا ہے تو آپ اس افسر کو معزول کر دیتے تھے[2] حضرت عمرؓ نے فوج میں بھی اطباء کا تقرر فرمایا تھا[3]

مذکورہ احکام اور واقعات کی روشنی میں ہم فیصلہ کر سکتے ہیں کہ اگر مزدوروں پر زیادتی ہو مثلاً اُجرت کم ملے یا زیادہ گھنٹے کام کرنا پڑے تو لیبر افسر آجروں سے باز پرس کرے اور آجروں کو حکم دے کہ وہ مزدوروں سے ان کی طاقت سے زیادہ کام نہ لیں اور انھیں مناسب اُجرتیں دیں نیز حکومت آجر اور مزدور کے معاملات میں دخل دہی کا پورا حق رکھتی ہے اسی طرح حکومت کو چاہیے کہ لیبر افسروں اور ڈاکٹروں (طبیبوں) کو مقرر کرے جو مزدوروں کی صحت کی دیکھ بھال کریں اور انھیں طبی امداد پہنچائیں۔

اسی سلسلہ میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ رسول کریمؐ کو صحابہ کرامؓ کی صحت کا اس قدر خیال رہتا تھا کہ معمولی معمولی ہدایتیں تک آپ انہیں دیتے تھے چنانچہ حضرت عائشہؓ بیان فرماتی ہیں کہ "رسول کریمؐ کے اصحابؓ چونکہ خود محنت مزدوری کیا کرتے تھے لہذا ان کے (پسینہ میں) بو آتی تھی۔ اس وجہ سے ان سے کہا گیا کہ کاش تم غسل کر لیا کرتے"[4]

۱۔ بخاری کتاب الصلوٰۃ ۔ ۲۔ تاریخ طبری صفحہ کے واقعات

۳۔ تاریخ طبری سنہ ۲۱ھ کے واقعات ملاحظہ ہوں۔

۴۔ بخاری پ کتاب البیوع

شرکت منافعہ

"کسی مقررہ صنعت میں آجر اور مزدور کو ایک دوسرے سے وابستہ رکھنے کی ایک تجویز شرکت منافعہ ہے"[1] "شرکت منافعہ کی تجویز کا مقصد یہ ہے کہ تقسیم دولت میں جو باقی حصہ عام طور سے تنہا کاروباری آدمی کو ملتا ہے اس کا ایک جز مزدوروں میں تقسیم کر دیا جائے"[2] رسول مقبول صلعم نے حکم دیا ہے کہ خادم جو کچھ پکائے اس میں سے اس کو بھی کچھ حصہ دیا جائے چنانچہ "حضرت ابو ہریرہ رض نبی کریم صلعم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ جب تم میں سے کسی شخص کے پاس اس کا خادم کھانا لائے تو اگر وہ خادم کو اپنے ساتھ نہ بٹھائے تو چاہیے کہ اسے ایک لقمہ یا دو لقمے ایک نوالہ یا دو نوالے دے دے کیونکہ اس نے محنت کی ہے"[3] بخاری کی ایک اور روایت میں اس کی وجہ بھی بیان کر دی گئی ہے "کیونکہ اس نے گرمی کی شدت برداشت کی اور عمدہ پکانے کی کوشش کی"[4]

مسند احمد حنبل میں بھی یہ روایت ہے

أَعْطُوا الْعَامِلَ مِنْ عَمَلِهِ فَاِنَّ عَامِلَ اللهِ لَا يَخِيبُ۔ — کام کرنے والے کو اس کے کام میں سے حصہ دو کیونکہ خدا کا عامل نامراد نہیں کیا جاتا۔

ان حدیثوں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مزدور کو اجرت دینے کے علاوہ منافع میں بھی شریک کرنا چاہیے۔

"اگر شرکت منافعہ کی تجویز پر عام طور سے عمل کیا جائے تو کچھ نہ کچھ قابل لحاظ فائدہ ضرور حاصل ہوگا۔ مالی منفعت کا ایک اہم اور مستقل سرچشمہ یہ ہوگا کہ مزدور کی انفرادی کارکردگی بڑھ جائے گی جب اس کو یہ معلوم ہو جائے گا کہ اس کو منافعہ میں حصہ ملنے والا ہے اس سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ زیادہ دیانت اور محنت سے کام کرے گا اشیاء خام کفایت سے اور آلات احتیاط سے استعمال کرے گا۔ اس طرح اس کو جتنی زیادہ مقدار جزو منافعہ کے طور پر ملے گی اتنا ہی اضافہ وہ پیداوار کی مقدار میں کرے گا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اغلب ہے کہ

---

[1] ٹاسگ، پرنسپلز آف اکنامکس ج ۲ باب ۵۹ صفحہ ۳۳۵۔
[2] " " " " صفحہ ۳۳۶۔
[3] بخاری۔ پ۱ نیز ابوداؤد اور ترمذی [4] بخاری پ۲۲ کتاب الطعام۔

اس میں بھی اضافہ کرے۔ اس طرح آجر کو معلوم ہوگا کہ منافعہ ادا کرنے کے بعد بھی نہ صرف، اس کی پیداوار بلکہ غالباً منافعہ میں زیادتی عمل میں آتی ہے اس واقعہ کی جانب اشارہ کیا جا چکا ہے کہ معمولی اجرت کے نظام کے تحت مادی نقصانات ہی نہیں بلکہ روحانی اور اخلاقی مضرتیں بھی مضمر ہیں[1]

غرض اسلام کے معاشی نظام نے محنت اور سرمایہ کے بظاہر نہ کھلنے والی گتھی کو اچھی طرح سے سلجھا دیا تھا ؎

حکم حق ہے لَیۡسَ لِلۡاِنۡسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی
کھائے کیوں مزدور کی محنت کا پھل سرمایہ دار
(اقبال)

(۶) مسئلہ سُود

معاشیات کے قدیم اور پیچیدہ مسائل میں سے ایک سود کا مسئلہ بھی ہے "اکثر معاشی مسائل نے تو گذشتہ دو تین صدی میں جنم لیا ہے لیکن سود کے بحث مباحثہ کا اس قدیم ترین زمانہ تک پتہ چلتا ہے جس کا جدید تحقیقات سے ہم کو کافی تاریخی حال معلوم ہو سکا ہے۔ مصر، یونان، روم اور ہندوستان جیسے قدیم تہذیب والے ممالک میں عہد عیسوی سے بھی مدتوں پہلے سود کے متعلق قواعد و قوانین جاری تھے۔ وید، توریت، انجیل اور قرآن جیسی مشہور مذہبی کتابوں میں سود کے متعلق تاکیدی احکام موجود ہیں۔ افلاطون و ارسطو جیسے قدیم حکماء کی تصانیف میں بھی تحقیقی سود کی جھلک صاف نظر آتی ہے[2] اور آج بھی بہت سے دماغ سود کی تحقیق و تشریح میں مصروف ہیں۔

---

[1] ٹاسگ: پرنسپلز آف اکنامکس ج ۲ باب ۴۹ صفحہ ۳۴۰۔

[2] پروفیسر الیاس برنی صاحب: علم المعیشت باب چہارم صفحہ ۲۳۰ سود۔

سود کے متعلق معاشیین کا اختلاف

عام طور پر یہ غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے کہ مسئلہ سود کے بارے میں تمام معاشیین متفق ہیں حالانکہ ایسا نہیں ہے ھابرلر نے لکھا ہے کہ "ایک طویل زمانے سے سود کا نظریہ علم معاشیات کی ایک دکھتی رگ بنا ہوا ہے، شرح سود کی تشریح اور تعیین کے بارے میں معاشیین میں اس قدر اختلاف ہے کہ اتنا اختلاف نظری معاشیات کے کسی دیگر شعبہ میں نہیں ہے"[1]

نظریۂ سود کی وسعت

سود کا مسئلہ بہت پرانا مسئلہ ہے تاریخ کی ابتدا سے آج تک مختلف معاشیین نے مختلف زمانوں میں سود کے مختلف نظریے پیش کیے ہیں، ان کو بیان کرنے کی نہ تو یہاں جگہ ہے اور نہ وہ ہمارے مقالہ سے متعلق ہے، خود اس موضوع پر ایک علیحدہ مقالہ لکھا جا سکتا ہے[2]

سود کو اسلام ہی برا نہیں کہتا بلکہ یونان کا ارسطو بھی، روما کے مقنن بھی، ہندو اور یہودی مصلح بھی اور سب سے عجیب یہ کہ جدید ترین رجحانات ——— کیمبرج اور امریکہ کے پروفیسر یہ سب کے سب ——— سود کی حرمت ہی کے قائل ہیں، یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ کس طرح اسلامی نظریے کو سود کے تمام مروجہ نظریوں پر فوقیت ہے اور کیونکر موجودہ معاشی تخیل رفتہ رفتہ اسلامی نظریے کی طرف پلٹ رہا ہے۔

اسلام میں مسئلہ ربوا کی اہمیت

سود کو عربی میں ربوا[3] کہتے ہیں" چونکہ اسلامی شریعت میں ربوا کا مسئلہ ایک اہم مسئلہ ہے

۱۔ ھابرلر: پراسپیرٹی اینڈ ڈیپریشن شائع کردہ جمعیت اقوام ص۱۹۵ طبع اول

۲۔ مقالہ نگار کے اساتذہ میں سے مولانا سید مناظر احسن گیلانی سود اور اسلام پر نیز ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب بلاسودی انجمنوں کے کاروبار پر بلند پایہ مضامین لکھ چکے ہیں اور ڈاکٹر انور اقبال صاحب قریشی سابق صدر شعبہ معاشیات جامعہ عثمانیہ نے سود کی تاریخ اور ربا اہمیت پر ایک قابل قدر کتاب اردو اور انگریزی میں لکھی ہے۔

۳۔ عربی زبان میں ربوا کا املا صلوٰۃ، زکوٰۃ کا سا ہے، واؤ لکھا تو جاتا ہے لیکن پڑھا نہیں جاتا۔

اور ان قیود کی اصل بنا ہے جو معاہدوں کی آزادی میں رکاوٹ ڈالتے ہیں اس لیے اس کا پورے طور سے اندازہ کرنا ضروری ہے[1]

لفظ ربوا کی حقیقت

ربوا عربی زبان کا لفظ ہے جس کے لفظی معنے زیادتی کے ہیں مثلاً کہا جاتا ہے کہ اربیٰ فلانٌ علیٰ فلانٍ (فلاں شخص نے فلاں شخص کو زیادتی دی) مذکورہ معنوں میں بھی ربوا کا لفظ قرآن مجید میں استعمال ہوا ہے مثلاً

وَتَرَى الْأَرْضَ هَامِدَةً ، فَإِذَا أَنزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَاءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ وَأَنبَتَتْ مِن كُلِّ زَوْجٍ بَهِيجٍ ۔
پ۱۷ الحج ۲۲ ع۱

اور تو زمین سوکھی ہوئی دیکھتا ہے پھر جب ہم پانی برساتے ہیں تو تازہ ہوتی ہے اور ابھرتی ہے اور بھانت بھانت کی پُر رونق چیزیں اگتی ہیں۔

نیز

وَمِنْ آيَاتِهِ أَنَّكَ تَرَى الْأَرْضَ خَاشِعَةً ، فَإِذَا أَنزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَاءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ ۔
پ۲۴ حم السجدہ ۴۱ ع۵

اور اس کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ تو زمین سوکھی ہوئی دیکھتا ہے پھر جب ہم پانی برساتے ہیں تو تازہ ہوتی اور ابھرتی ہے۔

یا مثلاً

أَن تَكُونَ أُمَّةٌ هِيَ أَرْبَىٰ مِنْ أُمَّةٍ ۔
پ۱۴ النحل ۱۶ ع۱۳

تاکہ ایک امت سے دوسری امت سے زیادہ آگے ہو۔

انہی معنے میں حدیثوں میں بھی ربوا کا لفظ استعمال ہوا[2]۔

غرض ربوا کے لفظی معنے تو زیادتی بڑھوتری کے ہیں لیکن معاشیات کی اصطلاح میں ربوا اس زائد رقم کا نام ہے جو قرضخواہ اپنے مقروض سے مہلت کے معاوضہ میں وصول کرتا ہے چنانچہ مورخ طبری بیان کرتے ہیں کہ

---

[1] ۔ سرعبدالرحیم: اصول فقہ اسلام باب ہفتم صفحہ ۳۹۴ ۔ [2] "من اجبا فقد اربیٰ" الوثائق السیاسیہ تالیف ڈاکٹر محمد حمید اللہ صفحہ ۱۲۸ نیز ۱۳۳ نیز صبح الاعشیٰ قلقشندی ج ۲ ص ۳۷۱

اَلرِّبا یعنی الزِّیادۃُ التی یزادُ رَبّ المال بسبب زیادۃ غیر ہمہ فی الاجل وتاخیرہ دینہ علیہ[1]

ربوا وہ زیادتی ہے جو سرمایہ دار اپنے مقروض کو مزید مہلت دے کر اپنے قرض کی وصولی میں تاخیر کرتا ہے۔

ابوبکر بن العربی صاحب احکام القرآن لکھتے ہیں کہ "ربوا ہر ایسی زیادتی کا نام ہے جس کے مقابلہ میں مال کا عوض نہ ہو"[2] اسی طرح امام رازیؒ بیان کرتے ہیں کہ "مال پر زیادتی طلب کرنے کو ربوا کہتے ہیں"[3]

انگریزی کتابوں میں جو فقہ اسلامی سے متعلق لکھی گئی ہیں ربوا کا ترجمہ یوژری اور انٹرسٹ کیا گیا ہے۔

جاہلی عرب میں سودی لین دین

"عرب کے قدیم معاشی نظام" کے باب میں طائف مکے اور مدینے میں سودی لین دین کے جو طریقے رائج تھے انھیں تفصیل سے بیان کیا جا چکا ہے تسلسل بیان قائم رکھنے کے لیے مختصراً چند امور یہاں دہرائے جاتے ہیں۔ ہوتا یہ تھا کہ جب ایک شخص کے دوسرے پر ایک معین میعاد کے وعدہ پر سو درہم واجب الادا ہوتے تو مدت کے گذرنے کے وقت اگر مقروض قرضہ ادا کرنے کی قدرت نہ رکھتا تو قرض خواہ مقروض سے کہتا کہ تو اصل مال پر زیادتی کر دے میں مدت میں توسیع کر دوں گا چنانچہ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ قرضخواہ سو درہم کے دو سو درہم کر لیتا اور جب دوسری مدت بھی گزر جاتی (اور مقروض میں رقم ادا کرنے کی سکت نہ ہوتی) تو قرضخواہ پھر ویسا ہی کرتا (یعنے اصل مال پر اور زیادہ کر دیتا) پھر بڑی مدت تک ایسا ہی ہوتا رہتا اور قرضخواہ ان سو درہموں کے بدلے کئی گنا زیادہ لے لیتا تھا[4]

---

[1] ـ تفسیر طبری ج ۳ صفحہ ۶۲ آیت: احل اللّٰہ البیع وحرم الربوا [2] ابن عربی اندلسی احکام القرآن ج ۱ صفحہ ۱۰۳ نیز ابن عربی شرح صحیح الترمذی ج ۵ صفحہ ۳۰۱ - ابواب البیوع مطبوعہ مصر - [3] امام رازی تفسیر کبیر ج ۲ صفحہ ۸۵

[4] امام رازی: تفسیر کبیر صفحہ ۳۶۰ آیت: لا تاکلوا الربوا اضعافاً -

ایک طرف تو یہ غریب طبقہ تھا جو غیر منظم حالت میں تھا اور دوسری طرف مال دار سرمایہ دار طبقہ تھا جس نے سودی کاروبار کے لین دین کے لیے باقاعدہ شراکتی کمپنیاں بنائی تھیں[1]، کاشت کاروں کو بھی یہ لوگ سودی قرض دیا کرتے تھے "جب کھجور توڑنے کا زمانہ آتا تو کھجور والا کہتا کہ اگر تم اپنا پورا حق لے لوگے تو میرے بال بچوں کے لیے کچھ نہ رہے گا۔ اگر تم صرف نصف کھجور لو اور نصف میرے لیے چھوڑ دو تو میں تمہیں زیادہ دوں گا چنانچہ وہ ایسا ہی کرتے اور ادائی کے وقت پر اس سے زیادہ طلب کرتے"[2]

کسان اور دوسرا غریب طبقہ قرض کے جنجال میں بری طرح پھنسا ہوا تھا چنانچہ علامہ بیضاوی لکھتے ہیں کہ "وہ لوگ ایک مدت ٹھیرا کر سود لیتے پھر مدت اور رقم میں زیادتی کرتے چلے جاتے یہاں تک کہ مقروض کا سارا مال ایک تھوڑے سے قرض کے پیچھے تباہ و برباد ہو جاتا تھا"[3]

واقعات بتاتے ہیں کہ جاہلی عرب کے غریب طبقہ کی وہی حالت تھی جو آج ہندوستانی کسانوں کی حالت ہے۔ ایک سرکاری کمیشن کا بیان ہے کہ "لوگوں کی بڑی تعداد مقروض پیدا ہوئی ہے مقروض زندگی بسر کرتی اور مقروض مرتی ہے بلکہ مرنے کے بعد بھی اپنے وارثوں کے سر اپنا بوجھ ڈال جاتی ہے"[4]

سود کس بات کا معاوضہ تھا؟

پہلے باب کے صفحہ ۶۳ پر بتایا جا چکا ہے جو لوگ سود ادا کرنے کی قدرت نہیں رکھتے تھے ان کے لیے قرض کی جو مدت مقرر کی جاتی تھی سود اسی کا معاوضہ تھا۔ جدید معاشی اصطلاح میں یوں بیان

---

[1] تفصیل کے لیے مقالہ ہذا کا باب ۲ ص ۶۵ مکہ کے اصل دار ملاحظہ ہو۔

[2] ملاحظہ ہو تفسیر خازن صفحہ ۲۰۳ آیت: وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوا۔

[3] تفسیر بیضاوی ج ۱ صفحہ ۱۵۴ مطبوعہ نول کشور پریس

[4] ملاحظہ ہو دکن بلوہ کمیشن رپورٹ کا فقرہ ۳۶۴

کہا جا سکتا ہے کہ سود انتظار کشی کا معاوضہ تھا۔

قرآن مجید میں سود کی ممانعت

قرآن مجید نے ہر قسم کے سودی کاروبار کو ممنوع قرار دیا ہے اور سود کے متعلق نہایت سخت اور قطعی احکام صادر فرمائے ہیں کہ

اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا — خدا نے تجارت کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام۔

پ ۳ بقرہ ۲ ع ۲۸

قرآن مجید نے بیع اور ربوا کی حقیقت نہیں بیان کی بلکہ اس معاملہ میں مخاطبین کے رسم و رواج پر اکتفا کیا ہے کیونکہ وہ لوگ خرید و فروخت کرتے تھے اور مقررہ مدت کے لیے سودی قرض دیتے تھے۔ شریعت کی اصطلاح میں ربوا کے جو معنے ہیں ہم ابتدا میں ہی بیان کر چکے۔ فقہا بیع کی یہ تعریف کرتے ہیں کہ

ا۔ ابن عربی لکھتے ہیں کہ "جب ادائی کا وقت آتا تو قرض خواہ کہتا کہ آیا تو رقم ادا کرتا ہے یا سود دیتا ہے۔ یعنے میرا مال جو تجھ پر ہے اس میں زیادتی دیتا ہے۔ یا میں دوسری مدت تک صبر (انتظار کشی) کروں"۔ کتاب احکام القرآن صفحہ ۱۰۲ مطبوعہ مصر۔

اکثر جدید معاشیین نے بھی سود کو اجتناب یا انتظار کشی کا معاوضہ بنایا ہے بجا طور پر ایک اشتراکی مصنف لزالے نے اس کا مذاق اڑایا ہے چنانچہ وہ رائے زنی کرتا ہے کہ "اصل کا منافعہ اجتناب کی اجرت ہے واہ خوب کہی۔ کیا انوکھا اسلوب بیان ہے۔ گویا یورپ کے تارک الدنیا کروڑپتی ہندوستانی بیراگیوں یا بڑے رشی منیوں کی طرح ایک پیر پر کھڑے ہیں باہیں پھیلائے لرزاں جسم بے رونق چہرہ اور ہاتھ میں طبق لیے اپنے اجتناب کی اجرت وصول کر رہے ہیں اور ان کے درمیان اپنے ساتھیوں میں سب سے ممتاز مثل ایک بڑے عقوبت نفس جھیلنے والے سادھو کے بیرن روٹ شیلڈ کھڑے ہیں"۔ ان ہی اعتراضات کی بنا پر مارشل نے بجائے اجتناب کے انتظار کشی کا لفظ استعمال کیا۔ (بہام باورکے کیپٹل اینڈ انٹرسٹ میں نقل کیا ہے)

"اپنے مال کو دوسرے کے مال سے برضامندی بدلنا"[۱]

قرآن پاک نے سود خواروں کو سود خواری سے روکنے کے لیے ایسی سختی سے متنبہ کیا ہے کہ قرآن مجید میں اور دوسرے مجرموں کو شاید ہی اس طرح مخاطب کیا گیا ہو۔ وجہ صاف ظاہر ہے کہ سودی لین دین کا اثر ہمہ گیر ہے اس کا اثر نہ صرف سود خوار یا اس کے خاندان پر پڑتا ہے بلکہ اس کا اثر پوری قوم و ملت کی معاشی زندگی پر پڑتا ہے۔

قرآن میں سود خواروں کو اس طرح خطاب کیا گیا ہے کہ یا تو وہ اس معاشی جرم سے باز آئیں یا اللہ اور اس کے رسول سے اعلان جنگ کریں۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ فَإِنْ لَمْ تَفْعَلُوا فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ۔ وَإِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ۔ وَإِنْ كَانَ ذُو عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ إِلَىٰ مَيْسَرَةٍ۔ وَأَنْ تَصَدَّقُوا خَيْرٌ لَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ۔

مسلمانو! خدا سے ڈرو! اور اگر تم ایمان رکھتے ہو تو سود کی بابت جو تمھارا مطالبہ لوگوں کے ذمے ہے اس کو چھوڑ دو۔ اور اگر ایسا نہیں کرتے تو خدا اور اس کے رسول سے جنگ کرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ اور اگر توبہ کر و تو اصل رقم تم کو ملے گی نہ تم کسی پر ظلم کرو اور نہ کوئی تم پر ظلم کرے۔ اور اگر مقروض تنگدست ہو تو فراخی تک مہلت دو۔ اور اگر سمجھو تو (اصل قرضہ بھی) بخش دو۔ یہ تمھارے حق میں بہتر ہے۔

پ ۳ بقرہ ع ۳۸

قرآن مجید میں بتدریج سود کی ممانعت

جس وقت کہ رسول کریم مبعوث ہوئے اہل عرب میں بہت سی عادتیں راسخ ہو چکی تھیں بعض عادتیں تو ایسی تھیں کہ ان سے قوم کے نشو و نما میں کوئی ضرر نہیں پہنچتا لیکن کچھ عادتیں مضر تھیں اس لیے شارع (اللہ تعالیٰ) نے ان سے ان کو الگ رکھنا چاہا۔ اس لیے اس نے اپنی حکمت سے آہستہ آہستہ ان کے لیے

---

[۱] تعریف بیع کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ہدایہ ج ۳ کتاب البیوع نیز ہدایہ کی شرحیں۔

اپنے حکم کو ظاہر کیا اور رفتہ رفتہ اپنے دین کو کمال کے درجہ تک پہنچایا۔ اس اصول کو پیش نظر رکھ کر جو بھی غور کرے گا اس کو معلوم ہو گا کہ دوسرے حکم سے پہلا حکم باطل نہیں ہو جاتا بلکہ اس کی تکمیل ہوتی ہے۔ یہی اصول سود کے بارے میں بھی برتا گیا ہے۔

عرب میں سود خواری عام تھی، سرمایہ داروں کا دعویٰ تھا کہ سود بھی تو ایک طرح کا لین دین ہے جس میں روپیہ کی تجارت ہوتی ہے چنانچہ قرآن میں بھی اس کا ذکر ہے کہ

قَالُوْا اِنَّمَا الْبَیْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا — وہ کہتے تھے کہ سود تجارت ہی کا سا ہے

پ۳ بقرہ ۲ ع ۳۸

عرب سرمایہ دار اور یہودی ہو کار عام طور پر سودی کاروبار کرتے تھے۔ حجاز کی منڈی خیبر ان ہی سرمایہ دار یہودیوں کے ہاتھ میں تھا بعض یہودیوں مثلاً ابو رافع یہودی کو "تاجر حجاز" کا لقب دیا گیا تھا۔ یہ سرمایہ دار یہودی پختہ گڑھیاں بنا کر اس میں رہتے اور غریب طبقہ پر ظلم و ستم ڈھاتے تھے۔

سود کے انسدادی سلسلہ میں پہلے پہل یہ بتایا گیا کہ سود کھانا یہودیوں کی عادت ہے کہ وہ ناحق لوگوں کا مال کھاتے ہیں۔

وَاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ — ان یہودیوں کا سود لینا جس سے ان کو
وَاَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ — منع کیا گیا تھا اور ان کا لوگوں کا مال ناحق کھانا۔

پ۶ نساء ۴ ع ۲۲

واضح ہو کہ سود کی شرح نہایت گراں ہوا کرتی تھی اکثر ۱۰۰ درہم بطور قرض کے دیے جاتے سال تمام ہونے پر اگر مقروض قرض ادا نہ کرتا تو دوسرے سال بجائے ۱۰۰ کے سا ہو کار ۲۰۰ طلب کرتے اگر وہ پھر بھی ادا نہ کرتا تو تیسرے سال چار سو طلب کرتے اور یوں ہی ہر سال مدت کے گزرنے پر دوگنا ہوتا چلا جاتا یا مقروض ادا کر دیتا اور یہی سود در سود "اضعافاً مضعفۃ" تھا جس سے مسلمانوں کو ابتدا میں روک دیا گیا کہ

یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوا — مسلمانو! سود در سود نہ کھاؤ

اَضْعَافًا مُّضٰعَفَۃً ۠ وَّاتَّقُوا اللّٰہَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ۔ — اور خدا سے ڈرتے رہو تاکہ فلاح پاؤ

پ۴ آل عمران ۳ ع ۱۴

اس آیت کے نزول کے بعد بھی سودی کاروبار کچھ نہ کچھ باقی رہا۔ ظاہر ہے کہ "سود در سود" کی ممانعت کی گئی تھی۔ معمولی شرح کا سود ابھی ممنوع نہ ہوا تھا کیونکہ اس کے بعد بھی کچھ عرصہ تک سودی کاروبار جاری رہا چنانچہ اسلامی ماخذوں سے معلوم ہوتا ہے کہ سودی کاروبار کی محدود اجازت تھی۔ رسول کریمؐ نے طائف کے باشندوں سے جو معاہدہ کیا اس سے یہی پتہ چلتا ہے کہ ایک محدود مدت تک کے لیے سود کی اجازت دی گئی تھی[1]۔ پھر ہر قسم کے سودی کاروبار کی ممانعت کردی گئی چنانچہ سود کی پوری تحریم کا جو ابتدائی حکم صادر ہوا وہ یہ ہے کہ

اَلَّذِیْنَ یَاْکُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا یَقُوْمُوْنَ اِلَّا کَمَا یَقُوْمُ الَّذِیْ یَتَخَبَّطُہُ الشَّیْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ[I]، ذٰلِکَ بِاَنَّھُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَیْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ۘ	جو لوگ سود کھاتے ہیں تو وہ قیامت کے دن اس طرح اٹھیں گے جس طرح کہ شیطان سے لپٹا ہوا کوئی شخص جو اس باختہ اٹھتا ہے یہ اس وجہ سے ہے کہ وہ کہتے تھے کہ سود تجارت ہی کی طرح ہے۔
وَاَحَلَّ اللّٰہُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ؕ فَمَنْ جَآءَہٗ مَوْعِظَۃٌ مِّنْ رَّبِّہٖ فَانْتَھٰی فَلَہٗ مَا سَلَفَ ؕ وَاَمْرُہٗٓ اِلَی اللّٰہِ ؕ	حالانکہ تجارت کو خدا نے حلال کیا ہے اور سود کو حرام۔ پھر جس نے اپنے رب کی نصیحت سن لی تو گیا گذرا ہو اور اس کا معاملہ خدا کے ہاتھ ہے۔
وَمَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ النَّارِ	لیکن جس نے دوبارہ سود لیا تو وہ دوزخی ہیں۔

[1] معاہدہ کے متن اور دیگر تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو کتاب الاموال لابی عبید قاسم بن سلام ص ۱۹۲ فقرہ ۵۰۶۔ I۔ آیت کا اسلوب بیان عربوں کے مذاق کے مطابق رکھا گیا ہے کیونکہ جنون میں مبتلا ہونے والے شخص کو یہ لوگ شیطان لپٹا ہو سمجھتے تھے، جاہلی عربوں کا عقیدہ تھا کہ دیوانگی یا مرگی درحقیقت انسان کے اندر شیطانی اثر ہے۔
تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر رازی ج ۲ صفحہ ۶۰ آیت بالا۔

هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۔ يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقَاتِ ۔ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيمٍ ۔
پ ۳ بقرہ ع ۲۸

جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے ۔ خدا سود کو گھٹاتا ہے اور خیرات کو بڑھاتا ہے ۔ خدا کسی ناشکرے گنہگار کو پسند نہیں کرتا ۔

پھر یہ حکم ہوا کہ

وَمَا اٰتَيْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّيَرْبُوَا فِي اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْبُوا عِنْدَ اللّٰهِ ۔ وَمَا اٰتَيْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ تُرِيدُونَ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُونَ ۔
پ ۲۱ الروم ۳۰ ع ۴

اور جو تم لوگ سود دیتے ہو تاکہ لوگوں کے مال میں اضافہ ہو تو وہ خدا کے ہاں نہیں بڑھتا اور جو تم خدا کی رضاجوئی کے لیے زکات دیتے ہو تو وہی لوگ اللہ کے ہاں اپنے دیے کو بڑھا رہے ہیں ۔

پھر نبوت کے آخری سال کریم نے قرآن کا یہ قطعی حکم سنا دیا کہ

يَا اَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِينَ ۔ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوا فَاْذَنُوا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُولِهٖ [1]

مسلمانو! خدا سے ڈرو اور اگر تم ایمان رکھتے ہو تو سود کی بابت جو تمہارا مطالبہ لوگوں کے ذمہ ہے اس کو چھوڑ دو اگر ایسا نہیں کرتے تو اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کے لیے تیار رہو جاؤ ۔

وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوسُ اَمْوَالِكُمْ ۔ لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ ۔

اگر توبہ کرو تو اصل رقم تم کو ملے گی نہ تم کسی پر ظلم کرو اور نہ کوئی تم پر ظلم کرے ۔

وَاِنْ كَانَ ذُو عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ ۔

اور اگر مقروض تنگدست ہو تو فراخی تک مہلت دو ۔

---

[1] ۔ "جس طرح زنا کی سزا شریعت نے مقرر کر دی تھی لیکن جب لوگوں نے اس سزا کو چھوڑ دیا تو اللہ تعالیٰ نے زانیوں پر خوفناک عذاب مسلط کر دیا یعنے تمام زانی آتشک وغیرہ جیسے خوفناک امراض میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور اسی قسم کی بیماری میں گھل گھل کر قبل از وقت مر جاتے ہیں ۔
اسی طرح سود کا مسئلہ ہے جب لوگوں نے شریعت کی تحریم کا کچھ خیال نہ کیا تو تمام قومیں جنگ اور بالشویزم کی خوفناک مصیبت میں مبتلا ہو گئیں ۔" (تفسیر علامہ طنطاوی جوہری تفسیر آیت بالا)

وَاِنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۔ | اور اگر سمجھو تو (اصل قرضہ بھی) بخش دو۔ یہ تمہارے حق میں بہتر ہے ۔

پ۳ بقرہ ع ۳۸

سود کی پوری ممانعت کے احکام کا تعلق رسول کریمؐ کی زندگی کے آخری زمانہ سے ہے چنانچہ ابن عباسؓ کا بیان ہے کہ "آخری آیت جو رسول کریمؐ پر نازل ہوئی وہ آیت ربوا تھی"[1] حضرت عمرؓ کہتے تھے کہ "سب سے آخر میں ربوا کی آیت نازل ہوئی اور رسول کریمؐ نے وفات پائی بغیر اس کے کہ اس آیت کی تشریح فرماتے پس تم ربوا اور جو چیز شک میں ڈالے اس کو چھوڑ دو"[2]

غرض کہ شارع (اللہ تعالیٰ) نے اپنی حکمت سے سود کے متعلق آہستہ آہستہ اپنے حکم کو ظاہر کر دیا ۔

حدیثوں میں سود کی ممانعت

رسول کریمؐ کی حیثیت قرآن کے شارح کی تھی چنانچہ حدیثوں میں بھی سود کی ممانعت کے احکام ہیں[3] حضور کریمؐ نے سودی کاروبار کرنے والوں، سود ادا کرنے والوں اور سودی کاروبار کے حسابات، دستاویز وغیرہ لکھنے والوں کو مساوی طور پر مجرم قرار دیا ہے تاکہ سودی کاروبار دنیا سے مٹ جائے ۔ حضرت عبداللہ بن مسعود کہتے ہیں کہ "رسول کریمؐ نے سود لینے والے اور دینے والے اور سودی کاروبار کے لکھنے والے اور معاملہ سود کی گواہی دینے والوں پر لعنت کی اور فرمایا کہ وہ تمام (معصیت کے ارتکاب میں) برابر ہیں"[4]

حجۃ الوداع کے موقع پر رسول اللہؐ نے جو آخری خطبہ دیا تھا اس میں ارشاد

---

[1] ۔ بخاری پ۱۸ کتاب تفسیر الفرقان نیز تفسیر طبری ج ۳ صفحہ ۷۰
[2] ۔ ابن ماجہ و دارمی نیز تفسیر طبری ج ۳ صفحہ ۷۰ آیت : وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوا نیز مسند احمد حنبل ج ۱ صفحہ ۳۴ مسند عمر ۔
[3] ۔ حدیث کی کتابوں میں سود سے متعلق مواد عموماً کتاب البیوع باب الربوا میں ملتا ہے ۔
[4] ۔ بخاری پ کتاب البیوع نیز ترمذی ج ۵ صفحہ ۲۰ مطبوعہ مصر ۔ قال ابو عیسیٰ : ہذا حدیث حسن صحیح

فرمایا کہ "ہر قسم کا سود ساقط ہے البتہ اصل رقم تمہاری ہے وہ تم کو ملنی چاہیے تاکہ نہ تم پر ظلم ہو اور نہ تم دوسروں پر ظلم کرو اللہ نے فیصلہ کر دیا ہے کہ سود قطعی ساقط ہے اور میں عباس بن عبد المطلب کے سود سے آغاز کرتا ہوں جو تمام کا تمام قطعی ساقط ہے......"

"اچھی طرح سمجھ لو کہ ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے، تمام مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں کسی کے لیے اپنے بھائی کی چیز زبردستی لینی جائز نہیں سوائے اس کے جو وہ اپنی مرضی سے دے، اپنے اوپر ظلم نہ کرنا، اے اللہ! کیا میں نے تیرا پیام پوری طرح پہنچا دیا!"[1]

اہل علم نے بیان کیا ہے کہ اسی خطبے یا انسانی حقوق کے منشوری اعلان کے بعد تکمیل دین کی آیت نازل ہوئی کہ

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ۔ پ۶ المائدہ ع۱

آج میں تمہارے لیے تمہارے دین کو کامل کر چکا اور میں نے تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور میں نے تمہارے لیے دین اسلام کو پسند فرمایا

"حضرت عبداللہ بن عباس رضؓ نے ایک بار یہ آیت پڑھی تو ایک یہودی نے جو آپ کے ساتھ تھا کہا کہ: اگر ہم پر یہ آیت نازل ہوئی ہوتی تو اس کے نزول کے دن ہم عید مناتے، حضرت عبداللہ بن عباس رضؓ نے فرمایا کہ خود یہ آیت اجتماع عیدین کے موقع پر جو ایک ساتھ عرفہ کے موقع پر جمعہ کے جمع ہو گئی تھیں نازل ہوئی ہے"[2]

مذکورہ خطبہ میں آپ نے نہ صرف ہر قسم کے سودی کاروبار کی ممانعت کا اعلان کر دیا بلکہ خود عملی طور سے اپنے چچا حضرت عباس رضؓ کی جانب سے ان کی تمام واجب الوصول سود کی رقم کو منسوخ قرار دیا "عباس بن عبد المطلب کا روپیہ بے شمار لوگوں میں پھیلا ہوا تھا[3] اور انھوں نے باقاعدہ شراکتی کمپنی

---

[1] ۔ تاریخ طبری صفحہ ۱۷۵۳، ۱۷۵۵، اسنہ ۱۰ھ کے واقعات نیز ابو داؤد کتاب البیوع نیز ابن ہشام صفحہ ۹۶۸ تاریخ الیعقوبی ج ۲ ص ۱۲۲ ۔ [2] بخاری کتاب العیدین و کتاب الحج
[3] ۔ تاریخ طبری صفحہ ۱۷۵۳ ۔

قائم کی تھی جو سودی کاروبار کیا کرتی تھی۔

بارٹر اور سود مبادلہ دولت کے باب ۶ میں آگے چل کر بتایا گیا ہے کہ قدیم عرب میں بارٹر کا رواج تھا یعنے اشیاء سے اشیاء کا تبادلہ عمل میں آتا تھا ایک شخص کوئی چیز مثلاً ایک من گیہوں قرض لیتا اور دو من گیہوں قرض خواہ کو ادا کرتا، یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ سو روپیے قرض لے اور دوسرے سال دو سو روپیے ادا کرے۔ رسول کریمؐ کی دُور رس معاشی نگاہ سے یہ بات کیونکر چھُپ سکتی تھی پس آپ نے اس بات کا اعلان کر دیا کہ سود صرف زر کے لین دین تک ہی محدود نہیں بلکہ سود کی ذیل میں اور اشیاء بھی شریک ہیں، رسول کریمؐ نے فرمایا ہے کہ

اَلذَّهَبُ بِالذَّهَبِ رِبوًا اِلَّا هَاءَ وَهَاءَ	سونے کو سونے سے بدلنا سود ہے مگر یہ کہ دست بدست ہو۔
وَالوَرِقُ بِالوَرِقِ رِبوًا اِلَّا هَاءَ وَهَاءَ	چاندی کو چاندی سے بدلنا سود ہے مگر یہ کہ دست بدست ہو۔
وَالبُرُّ بِالبُرِّ رِبوًا اِلَّا هَاءَ وَهَاءَ	گیہوں کو گیہوں سے بدلنا سود ہے مگر یہ کہ دست بدست ہو،
وَالشَّعِيرُ بِالشَّعِيرِ رِبوًا اِلَّا هَاءَ وَهَاءَ	اور جَو کو جَو سے بدلنا سود ہے مگر یہ کہ دست بدست ہو۔
وَالتَّمرُ بِالتَّمرِ رِبوًا اِلَّا هَاءَ وَهَاءَ [1]	اور کھجور کو کھجور سے بدلنا سود ہے مگر یہ کہ دست بدست ہو تو مضائقہ نہیں۔

پھر آگے ارشاد ہوتا ہے کہ "سونا سونے سے بدلنا اور چاندی چاندی سے بدلنا اور گیہوں، گیہوں سے بدلنا اور جَو، جَو سے بدلنا اور کھجور، کھجور سے بدلنا اور نمک، نمک سے بدلنا برابر برابر اور دست بدست ہو تو جائز ہے (مگر زیادتی اُدھار یا نقد کے ذریعے جائز نہیں) ہاں جب یہ اصناف بدل جائیں تو جس طرح چاہو فروخت کرو بشرطیکہ دست بدست ہو [2]

---

[1] بخاری ۳۴ کتاب البیوع نیز موطا، مسلم، ابو داؤد و ترمذی کے ابواب البیوع

[2] بخاری ۳۴ کتاب البیوع نیز موطا، مسلم، ابو داؤد و ترمذی کے ابواب البیوع

سود کے تحت بارٹر کی ان شکلوں کو اسلامی معاشیات نے پہلی دفعہ داخل کیا ہے ورنہ عموماً سود صرف زر یعنے روپیہ، اشرفی سکے کے کاروبار تک محدود تھا بعد میں فقہائے اسلام نے جب اس حدیث پر غور کیا تو جو خصوصیات ان چھ چیزوں کی تھیں وہ اور دیگر اشیاء میں بھی نظر آئیں لہذا انھوں نے رسول کریمؐ کے بیان کو توضیحی بیان قرار دیتے ہوئے ان دیگر اشیاء کو بھی شامل کر دیا جن میں ان کے خیال کے مطابق یہ خصوصیتیں پائی جاتی تھیں۔ امام شافعیؒ اور قریب قریب امام مالکؒ نے سونا اور چاندی کو دیکھ کر خیال کیا کہ اس سے ہر وہ چیز مراد ہے جو مبادلہ میں قیمت کا کام دیتی ہے، اب خواہ سونا چاندی ہو یا اس کے سوا کوئی اور چیز، اسی طرح گیہوں، جو، کھجور سے یہ مراد لی کہ ہر وہ شئے جو بطور غذا کے کام آتی ہے وقس علیٰ ہذا، لیکن ربائی اموال کی یہ خصوصیت کہ اس کا ہر فرد دوسرے کا قائم مقام ہوتا ہے اور ان کی یہی خصوصیت ان نتیجوں کی ذمہ دار ہے جو سودی کاروبار میں پیش آتی ہیں اس نکتہ پر امام اعظمؒ کی نظر گئی انھوں نے خیال کیا کہ ہر وہ چیز جو خرید و فروخت میں تل کر یا نپ کر پیمانہ سے فروخت ہوتی ہے اس میں یہی خصوصیت پائی جاتی ہے اس لیے امام صاحب نے بجائے ان چھ چیزوں کے ہر اس چیز کے تبادلہ میں جو لین دین میں تل کر یا نپ کر پیمانہ سے فروخت ہوتی ہو زیادتی (ربوا) کو ناجائز قرار دیا اس تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں فقہ کی کتابیں ان سے بھری پڑی ہیں۔

قدیم معاشروں میں سود کی مذمت

اسلام ہی میں نہیں بلکہ دنیا کے قدیم معاشروں میں بھی سود کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا تھا ارسطو نے زر کو کڑک مرغی قرار دیا ہے جو انڈے نہیں دیتی، ارسطو کے قول کے مطابق زر کو استعمال کرنے کا مقصد ہی یہ تھا کہ مبادلہ دولت میں آسانی پیدا کی جائے اور انسانی احتیاجات کو پورے طور پر پورا کیا جائے غرض ارسطو کا یہ نظریہ تھا کہ روپیہ روپیہ کو نہیں جنتا[1]۔ ارسطو کے علاوہ افلاطون بھی سود کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتا تھا[2]۔

[1]۔ ارسطو: سیاست ج ۱، باب ۱۰ [2] افلاطون قوانین ج ۵۔

روما[1] کے مقنن ہندو[2] اور یہودی مصلح بھی سود کو برا سمجھتے تھے حتیٰ کہ جاہلیت میں بھی بعض عرب سود کو اچھا نہیں سمجھتے تھے اور سود کی رقم کو ناپاک خیال کرتے تھے[3]۔

یورپی ممالک خصوصاً انگلستان میں سودی کاروبار کی ممانعت

گو انجیل میں سود سے متعلق احکام نہیں ملتے مگر عیسائی عالموں اور پادریوں نے توریت اور زبور کی پیروی میں سود کو حرام قرار دیا تھا[4] چنانچہ یورپ میں سود مدتوں مذہباً حرام اور قانوناً ممنوع رہا[5]۔ عیسائی عقیدہ نے سودی قرض کو ممنوع قرار دیا تھا دینیات ایک مشہور عالم اکوناس (۱۲۲۷ تا ۱۲۷۴ء) نے کلیسا کا رجحان بھی بتایا ہے سود ناجائز ہے، یہودیوں کو ان کے مذہب نے اجازت دی تھی کہ اجنبیوں سے سود لیں چونکہ انھیں ترقی کے دوسرے وسیلوں سے محروم کر دیا گیا تھا اس لیے قرون وسطیٰ میں وہ ساہوکار بن گئے۔ رسم و رواج اور لوگوں کے خیالات کا اس سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۳۶۴ء میں اڈورڈ سوم نے لندن میں سود کے خلاف قانون نافذ کرنے کی اجازت دی اور ۱۳۹۰ء میں میر بلد نے سود کے خلاف ایک سخت امتناعی حکم جاری کیا تھا[6]۔

"صلیبی جنگ کے جوش و خروش کے زمانہ میں یہودیوں پر ظلم و ستم کرنا بھی معمول سا ہو گیا تھا چنانچہ اس موقع پر بھی وہ ظلم و ستم سے محفوظ نہ رہے۔ انگلستان میں یہ لوگ بادشاہ کے خاص طور پر دست نگر سمجھے جاتے تھے اور وہ

۱۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ہینے لیوس : ہسٹری آف اکنامک ڈاکٹر نز۔
۲۔ منوجی اپنی سمرتی میں لکھتے ہیں کہ "بیاج لینے والا جو برہمن ہے اس کو شودر کی طرح ماننا چاہیے" (منو سمرتی ادھیائے منتر نمبر ۱۰۲ صفحہ ۲۶۸ مطبوعہ نول کشور)۔ ۳۔ تفصیل کے لیے مقالہ ہذا کا پہلا باب "عرب کا قدیم معاشی نظام" ص ۹۵ ملاحظہ ہو۔ ۴۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجن عنوان : یوژری۔ ۵۔ ملٹن برگس اینڈ ہیری ڈی ...: اکنامک ہسٹری آف انگلینڈ باب ۳ ص ۷۳ چوتھا اڈیشن۔

ان سے جتنا چاہتا روپیہ وصول کر لیا کرتا تھا۔ ان کی دولت زیادہ تر سود کی ہوتی تھی اور چونکہ سود در سود کی شرعاً ممانعت تھی نیز امن کے قیام کی طرف سے اطمینان نہ تھا اس لیے یہ لوگ بہت بھاری شرح سود پر روپیہ قرض دیتے۔ اور اس زمانہ کی دیہاتی معاشرت میں زراعت پیشہ یا سوداگر اس بات کو اچھی طرح سمجھتے تھے کہ وقت پر روپیہ مل جانا بھی ایک خاص قدر وقیمت رکھتا ہے پس ان قرض دینے والوں سے سب ہی کو نفرت تھی، بہت سے شہروں میں سب سے الگ چار دیواری کے اندر ان کے محلے مقرر کیے جاتے اور رات کو ان کے پھاٹک میں قفل لگا دیا جاتا تھا اور انھیں ایک خاص قسم کا لباس پہننے پر مجبور کیا جاتا قرضدار تاک میں رہتے تھے کہ ذرا موقع ملے اور ان یہودیوں پر ہلہ بول دیا جائے۔ رچرڈ کی تخت نشینی کے دن خود ویسٹ منسٹر میں اسی قسم کا بلوہ ہوا اور اسی خزاں اور سرما کے موسم میں یارک، اسسٹم فرڈ، ناروچ، سینٹ ایڈمنڈ اور دوسرے شہروں میں یہودیوں کے خلاف ہنگامے ہوئے جن میں کشت وخون کی نوبت آئی۔ یارک میں ان بدنصیبوں کو پہلے تو بالاحصار میں جانے دیا اور پھر باقاعدہ ناکہ بندی کر دی۔ زندگی سے تنگ آکر انھوں نے عورتوں اور بچوں کو خود مار ڈالا اور قلعے میں آگ لگا کر خود آگ میں کود سے اور جل کر بھسم ہو گئے[۱]

پھر مورخ ریتسم ہی لکھتا ہے کہ ....."مزید برآں سودی لین دین کا ایک زرعی ملک میں جو اثر لازمی ہے وہ ظاہر ہونے لگا تھا۔ جابجا جاگیریں بھاری بھاری قرضوں میں مکفول ہو رہی تھیں، لیکن چالیس فی صد سود ادا کرنے کے بعد زمیندار کو مشکل سے اتنی بچت ہوتی تھی کہ سرکاری محاصل اور اپنے گھر والوں کا پیٹ بھر سکے۔ پس قرض خواہ یہودی ملک بھر میں نفرت سے دیکھے جاتے تھے کہ ان ہی کی بدولت زمینوں کے بکنے اور زمینداروں کے بزور عدالت بے دخل کیے جانے کی نوبت آتی رہتی تھی۔ رائے عامہ کی

[۱] سیرل ریتسم، تاریخ انگلستان حصہ اول باب دوم صفحہ ۲۱۰۔

شہ سے ایڈورڈ نے یہودیوں کے لیے غیر منقولہ جائداد پیدا کرنے کی ممانعت کر دی پرانے قانون کے مطابق ایک مخصوص لباس پہننے پر مجبور کیا اور آخر میں سود خواری کو کلیۃً ممنوع قرار دیا[1]

یہودیوں کا انگلستان سے اخراج

یورپ کے اور ملکوں کی طرح سود خواری کی بناء پر یہودیوں کا انگلستان سے اخراج عمل میں آیا تھا چنانچہ ایک انگریز مورخ جیمبرز لکھتے ہیں کہ "ازمنہ وسطیٰ میں عیسائی اقوام کو مسئلہ رباسے خاص نفرت تھی اور اپنے ہمسایہ عیسائیوں پر سنگین شرح سود کا بار ڈال کر یہودی ان کی تباہی کا باعث ہوئے تھے اور جس طرح کہ عیسائی مفلس ہوتے جاتے تھے یہودیوں کی ثروت اور تمول میں اضافہ ہوتا جاتا تھا بالآخر عیسائیوں کی نفرت مبدل بہ عناد ہو گئی اور بادشاہ کے یہودیوں کی حمایت و سرپرستی کرنے کے باوجود جب کبھی موقع ملتا عیسائی اپنے دلوں کا بخار نکالا کرتے تھے چنانچہ سن ۱۲۹۰ء میں قوم کی برافروختگی سے مجبور ہو کر ایڈورڈ اوّل نے یہودیوں کو انگلستان سے خارج ہی کر دیا تھا، ان لوگوں کو اولیور کرامول کے زمانہ تک واپس آنا نصیب نہ ہوا[2]"

سوویٹ روس میں سودی کاروبار کی ممانعت

خیر یہ تو قدیم انگلستان کا تذکرہ تھا جدید سوویٹ روس میں بھی سودی کاروبار کی قطعی ممانعت ہے، سوویٹ حکومت کے تمسکات بھی بلا سودی ہوتے ہیں[3]

جدید اشتراکی فلسفہ کا بانی کارل مارکس سود کی برائیاں بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے "سود خوار ایک بڑا بھاری دیو شیطان ہے اور وہ ایک بھیڑیا صفت انسان ہے جو ہر شئے کو برباد کر کے رکھ دیتا ہے۔ جب ہم چوروں، ڈاکوؤں اور نقب زنوں کی گردن مارتے ہیں تو پھر ویسے ہی تمام سود خوار بھی قابل گردن زدنی ہیں[4]"

---

۱ ۔ کیپرل رینسم : تاریخ انگلستان حصہ اول جز چہارم صفحہ ۲۶۴ ۔

۲ ۔ اے، ایم، چیمبرز : اے شارٹ سا تسلی ٹیوشنل ہسٹری آف انگلینڈ باب ششم ص

۳ ۔ وینڈل ولکی : ون ورلڈ باب ۵ ص ۶۵ رشیا، پاکٹ بک ایڈیشن ۔

۴ ۔ کارل مارکس : کیپیٹل ج ۲ ص ۶۵۲ ۔

اشتراکی کہتے ہیں کہ محنت کرنے والے طبقوں پر سود ایک ناروا بوجھ ہے ان کا دعویٰ ہے کہ سودی کاروبار سے مالدار تو اور مالدار ہوتے چلے جاتے ہیں لیکن نادار اور نادار ہوتے جاتے ہیں[1]

سود ایک کا، لاکھوں کے لیے مرگِ مفاجات

اسلامی مملکت میں سودی کاروبار کی ممانعت

چونکہ سودی کاروبار کا اثر معاشرہ پر ہمہ گیر ہوتا ہے اس لیے اسلامی مملکت میں سودی کاروبار نہ صرف مسلمانوں کے لیے ممنوع قرار دیا گیا تھا بلکہ ذمیوں کے لیے بھی ممنوع ٹھیرا۔ جس معاہدہ میں ذمیوں کی حفاظت کی ذمہ داری قبول کی تھی اسی میں خاص طور پر اس کا تذکرہ بھی کر دیا جاتا تھا کہ وہ سودی کاروبار نہ کریں۔ نبی کریمؐ نے نجران والوں کو جو منشور عطا کیا تھا اس میں یہ شرط لگا دی کہ وہ نہ سود کھائیں گے اور نہ سودی کاروبار کریں گے[2]

یحییٰ بن آدم کہتے ہیں کہ میں نے ایک شخص سے اس فرمان کی نقل حاصل کی جو رسول اللہؐ نے اہل نجران کو عطا فرمایا تھا اور اس نے یہ نقل حسن بن صالح سے حاصل کی تھی جو یہ ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"یہ وہ تحریر ہے جو اللہ کے رسول محمدؐ نے اہل نجران کے لیے لکھی... اگر تم سے کوئی اپنا حق مانگے گا تو دونوں کے درمیان انصاف کیا جائے گا۔ نہ تم پر ظلم ہونے دیا جائے گا اور نہ تمھیں ظلم کرنے دیا جائے گا۔ تم میں سے جو آئندہ سود کھائے وہ میری ضمانت سے خارج ہے"[3]

کہتے ہیں کہ جب ابوبکر صدیقؓ خلیفہ ہوئے تو انھوں نے یہی معاہدہ برقرار رکھا اور اسی تحریر کی مانند انھیں ایک تحریر عنایت کی۔ لیکن جب

---

[1] انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس ج ۱۲ ص ۵۵۰

[2] کتاب الاموال ص ۱۸۸ نیز فتوح البلدان ص ۷۱ صلح نجران [3] بلاذری، فتوح البلدان صفحہ ۶۶ و نیز ابو یوسف کتاب الخراج ص ۷۲ و تاریخ یعقوبی وغیرہ

حضرت عمرؓ خلیفہ ہوئے تو یہ لوگ سود کھانے لگے اور ان کی تعداد بھی بڑھ گئی تھی اس سے انھیں اندیشہ ہوا کہ کہیں ان کے وجود سے اسلام کو نقصان نہ پہنچ جائے، اس لیے انھوں نے ان کو جلا وطن کر دیا اور ان کے پیچھے پروانہ لکھا۔۔۔[1]

مقامی مناسبت کے لحاظ سے یہاں یہ تذکرہ بے محل نہیں کہ سود خواری کی بناء پر جلا وطنی یا سودی کاروبار کی ممانعت کچھ نئی بات نہیں ہے آج بیسویں صدی عیسوی میں بھی جرمنی سے ہزاروں یہودیوں کو سود خواری کی بناء پر جلا وطن کیا گیا ہے، اور اشتراکی روس میں سودی کاروبار کی ممانعت ہے خود انگلستان میں جیسا کہ اس سے پہلے بیان ہوا یہودیوں کو سود خواری کی بناء پر انگلستان سے نکال دیا گیا تھا۔

غرض اسلامی مملکت میں مسلمانوں کے سوا دوسرے مذاہب کی رعایاء کے لیے بھی سودی کاروبار قانوناً ممنوع قرار دیا گیا تھا۔ سوال یہ ہے کہ غیر مسلم رعایا کے ساتھ اسلامی مملکت کا عام دستور جب یہ ہے کہ ان کے مذہب میں کسی قسم کا دخل نہیں دیا جائے گا اور ان کا جو مذہب ہے اس پر چلنے کی اجازت دی جائے گی۔ اس بنیاد پر شراب، سور اور اسی قسم کی وہ تمام چیزیں جو اسلامی نقطۂ نظر سے ممنوع تھیں غیر مسلم رعایاء کو ان کی خرید و فروخت کی عام طور پر اجازت دی گئی تھی اور یہی وجہ تھی کہ اسلامی مملکت میں یہ چیزیں غیر مسلم رعایا کی طرف سے درآمد ہوتی تھیں تو اسلامی حکومت ان سے عام سامان کے طور پر محصول درآمد وصول کرتی تھی یہاں تک کہ فقہا لکھتے ہیں کہ مسلمان اگر کسی ذمی کی شراب پھینک دے تو اسلامی مملکت کو تاوان دلانا ہوگا۔[2]

---

[1] ۔ بلاذری: فتوح البلدان صفحہ ۶۶ بحران نیز کتاب الاموال صفحہ ۱۸۹ نمبر ۵۰۳

[2] ۔ اس سلسلہ میں ہدایہ کی عبارت ملاحظہ ہو "اگر مسلمان کسی ذمی کی شراب یا سور تلف کر دے تو تاوان ادا کرنا ہوگا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اور ہماری دلیل یہ ہے کہ ذمیوں کے حق میں شراب یا سور قیمتی اشیاء ہیں اس واسطے کہ شراب

ایسی صورت میں سود جسے اسلام نے حرام کیا ہے چاہیے تو یہ تھا کہ اس کے سلسلہ میں غیر مسلموں کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے دوسرے الفاظ میں یہ مطلب ہوگا کہ باہم غیر مسلموں میں سودی کاروبار کی اجازت ہونی چاہیے تھی۔

اس استثناء کی دو وجہیں ہیں۔ ایک تو سودخواری کو چوری، ڈاکے، قتل وغیرہ کی طرح کا فوجداری جرم قرار دیا جانا مصلحت سمجھا گیا۔ دوسرے چونکہ غیر مسلموں پر ان کا شخصی قانون نافذ کیا جاتا تھا (اباحیت نہ تھی کہ جو چاہیں کر لیں) اور سود ہر مذہب میں حرام ہی ہے اس لیے سود سے ذمیوں کو روکنا دینی مداخلت نہیں۔

اسلامی حکومت کی جانب سے قرضوں کا انتظام

یورپ میں مدتوں سود مذہباً حرام اور قانوناً ممنوع رہا لیکن "حاجت مندوں کو قرض لیے بغیر چارہ نہ تھا آخر یہودیوں کو سود کی ممانعت سے قانوناً مستثنیٰ کر دیا گیا تاکہ قرض بھی مل سکے اور عیسائی سودخواری کے گناہ سے بچے رہیں لیکن اپنے مقابل یہودیوں کو سود لیتے دیکھ کر بھلا عیسائی کیوں رکنے والے تھے انھوں نے قرض داروں سے تحفہ تحائف کی شکل میں سود لینا شروع کر دیا۔ کلیسا کی قوت میں زوال آیا تو سولھویں صدی عیسوی کے آخر تک سود نے اچھی طرح قدم جما لیے۔ اس کا اندازہ بیکن کے حسب ذیل خیالات سے بھی ہو سکتا ہے" چونکہ انسان کو روپیہ قرض بدلینے اور دینے کی ضرورت پڑتی ہے اور چونکہ وہ سخت دل ہوتے ہیں اس لیے وہ قرض نہ دیں گے بصورت دیگر کسی کو قرض ہی نہ ملے گا لہذا سود کی اجازت دی جانی چاہیے"[1]

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) ان کے لیے ایسی ہے جیسے ہمارے لیے سرکہ اور ان کے نزدیک سور ایسا ہی ہے جیسے ہمارے نزدیک بکری ہے۔ اور ہم کو حکم دیا گیا ہے کہ ہم ان کو ان کے دین پر چھوڑ دیں اور تلوار ان پر سے اٹھا لی گئی ہے تو کسی حکم کا لازم کرنا دشوار ہے اور جب ان کے حق میں قیمتی ہونا باقی رہا تو مملوک کے قیمتی مال کے تلف کرنے سے تاوان لازم آئے گا۔" ھدایہ ج ۴ کتاب الغصب۔

[1] بیکن: ڈسکورس آن یوژدری۔

باوجود ممانعت کے یورپ میں سودی کاروبار کے وجود میں آنے کی ایک وجہ یہ تھی کہ قرض دینے کا کسی ادارہ یا مملکت کی جانب سے انتظام نہ تھا۔ اسلامی مملکت نے اگر ایک طرف سود خواری کا انسداد کیا تو دوسری جانب خود سرکاری خزانہ یا بیت المال سے قرض حسنہ کا انتظام کیا اور سرکاری موازنہ میں ایک مد قرضہ حسنہ کی بھی رکھی تھی۔[۱]

حضرت عمرؓ وغیرہ کے زمانہ میں اس کے متعدد نظائر ملتے ہیں کہ لوگوں کو سرکاری خزانہ سے پیدا آور اور غیر پیدا آور اغراض کے لیے قرضہ ملا کرتا تھا یہاں تک کہ عورتیں بھی بیت المال سے پیدا آور اغراض کے لیے قرضہ لیا کرتی تھیں۔[۲] غرض خود اسلامی حکومت نے اپنی جانب سے قرضہ حسنہ دینے اور وصول کرنے کا انتظام کیا تھا اور کاروبار کے لیے جو انتظامی اخراجات لاحق ہوتے وہ خود حکومت برداشت کرتی تھی جیسا کہ اور بہت سے امور جیسے تعلیم، دواخانوں وغیرہ کے انتظام پر حکومت روپیہ صرف کرتی تھی۔

ایک مشہور مغربی مصنف مسٹر جافری مارک نے اپنی کتاب "موجودہ بت پرستی" میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے اس کے بعض خیالات اسلامی اصول سے ملتے جلتے ہیں مسٹر مارک نے جو اسکیم پیش کی ہے اس کا مختصر سا خلاصہ یہ ہے کہ ہر قسم کی خانگی بینک کاری کو ممنوع قرار دیا جائے اور سود کو قطعی ناجائز سمجھا ئے اور اس کے بجائے تمام امانتوں پر ایک قسم کا محصول لگایا جائے اسے شاید یہ معلوم نہیں کہ آج سے ۱۳۵۸[۳] برس پہلے اسلام نے سود کی قطعی ممانعت کر دی تھی اور فاضل رقومات پر زکوٰۃ کی شکل میں ½ ۲ ڈھائی فی صد محصول لگایا تھا۔

سود سے متعلق امام رازی کے نظریے

تمام فقہاء اور اکثر مفسرین جیسے طبریؒ زمخشری، بیضاوی، سیوطی اور ابن عربیؒ

۱؎ - ملاحظہ ہو مالیات عامہ باب ۶

۲؎ - ملاحظہ ہو مبادی دولت باب ۶ میں بیت المال صفحہ ۵۲۲

۳؎ - سود سنہ ۳ھ میں کامل طور پر ممنوع قرار دیا گیا تھا۔

مسئلہ سود پر صرف قانونی نقطۂ نظر سے بحث کی ہے لیکن امام فخر الدین رازی المتوفی ۶۰۶ھ کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ انھوں نے سود پر معاشی نقطہ نظر سے بھی بحث کی ہے امام رازی لکھتے ہیں کہ "لفظ ربوا کے معنی زیادتی کے ہیں لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ہر طرح کی زیادتی وصول کرنا حرام ہے بلکہ ربوا کی جو حرمت ہے وہ ایک خاص قسم کا معاہدہ ہے جو ان (عربوں) کے ہاں ربوا کے نام سے موسوم تھا۔ اور یہی ربوا النسیہ ہے پس خدا نے جس ربوا کو حرام قرار دیا ہے اس سے یہی ربوا النسیہ مراد ہے"[1]

امام رازی نے سود کی حرمت سے متعلق حسب ذیل دلائل پیش کیے ہیں

(۱) "سودی کاروبار کے حرمت کی ایک وجہ یہ ہے کہ ربا اس بات کا مقتضی ہے کہ اس میں ایک انسان کی دولت بغیر کسی عوض کے لی جاتی ہے۔ (کیونکہ جو شخص ایک درہم کو دو درہم کے بدلے میں نقد یا ادھار فروخت کرتا ہے تو اس نے یہ زائد بغیر کسی عوض کے لیے) اور انسان کی دولت سے اس کی احتیاج وابستہ ہوتی ہے اور اس کی بڑی حرمت ہے۔ رسول کریمؐ نے فرمایا ہے کہ انسان کے مال کی حرمت اس کے خون کی حرمت کے مثل ہے۔ پس اسی بنا پر دوسرے شخص کی دولت بغیر کسی عوض کے لینا ممنوع قرار دیا گیا۔ اگر کہا جائے کہ کیوں ایسا جائز نہ ہوا کہ اصل (سرمایہ) زاید درہم کے معاوضہ میں ایک طویل مدت تک اس کے ہاتھ میں رہتا ہے اگر اصل اس کے ہاتھ میں رہتا تو ممکن تھا کہ اصل دار اس سے تجارت کرتا اور اس تجارت کے سبب سے وہ فائدہ حاصل کرتا۔ پس جو وہ اس کو قرض دار کے ہاتھ میں چھوڑتا ہے اور قرض دار اس سے نفع اٹھاتا ہے تو پھر کس لیے اصل دار کو زائد درہم لینے سے روک دیا گیا یہ تو اس دولت سے نفع اٹھانے کا معاوضہ تھا ہم کہتے ہیں کہ جس نفع اٹھانے کا آپ نے تذکرہ کیا ہے وہ ایک امر موہوم ہے جو کبھی حاصل ہوتا ہے اور کبھی نہیں لیکن زاید درہم لینا یقینی امر ہے پس امر یقینی

[1] ۔ امام رازی: تفسیر کبیر ج ۲ صفحہ ۶۰ آیت ربوا

معاوضہ مہلت سے جو امر موہوم ہے فوت ہو جائے گا یہ ضرر سے خالی نہیں ہوتا۔

(۲) "دوسری وجہ یہ ہے کہ سود لوگوں کو کسب و ہنر میں مشغول ہونے سے روک دیتا ہے کیونکہ جب اصل دار کو سود کے ذریعہ — چاہے وہ نقد ہوں یا ادھار — زاید درہم حاصل ہوں تو اس کے لیے روزی کمانا (اکتساب المعیشۃ) آسان ہو جائے گا اور وہ کسب و ہنر، تجارت اور مشقت طلب صنعتوں کی مشقت نہ اٹھائے گا اور اس طرح عام لوگوں کے فائدے منقطع ہو جائیں گے اور یہ تو ایک لازمی امر ہے کہ دنیاوی کاروبار بغیر تجارت اور صنعت و حرفت کے چل نہیں سکتے۔"

(۳) "تیسری وجہ یہ ہے کہ معاہدہ ربوا اس وجہ سے ممنوع قرار دیا گیا کہ سودی قرض لوگوں کی نیک نامی اور شہرت کو منقطع کر دیتا ہے جب سود ہی حرام ہو تو لوگ روپیہ قرض لینے سے باز رہتے ہیں اگر سود حلال ہو جائے تو حاجت مند شخص کی احتیاج اس کو اس امر پر آمادہ کرے گی کہ ایک درہم کو دو درہم پر حاصل کرے۔ اس طرح آپس کی ہمدردی نیکی اور احسان مندی کے جذبات ختم ہو جائیں گے۔"

(۴) "چوتھی وجہ یہ ہے کہ یہ غالب ہے کہ مقروض مال دار ہو جائے اور قرض دینے والا نادار ہو جائے پس سود کے معاملہ کو جائز قرار دینے سے یہ ہوتا ہے کہ دولت مند، غریبوں کی زائد دولت طلب کرتا ہے اور رحم کرنے والے کی رحمت اس کو پسند نہیں کرتی۔"

(۵) "پانچویں وجہ یہ ہے کہ سود کی حرمت قرآن سے ثابت ہے یہ ضروری نہیں کہ انسان کو جو احکام دیے جاتے ہیں اس کی وجہ بھی معلوم ہو۔"[1]

امام رازی کے مزید دلائل

صدقات اور سود سے بحث کرتے ہوئے امام رازی لکھتے ہیں کہ "دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں، صدقات میں ایک شخص اپنی دولت کا زائد حصہ دوسرے کو

[1] امام رازی: تفسیر کبیر ج ۲ ص ۵۹ آیت: اَلَّذِیْنَ یَاْکُلُوْنَ الرِّبٰوا

دیتا ہے اور سود میں دوسرے کا زائد حصہ خود حاصل کرتا ہے تو جس مذہب نے صدقات کا حکم دیا ہو اس میں سود کس طرح جائز ہو سکتا ہے[1] اسی بنا پر علامہ محمد الخضری نے بالکل سچ کہا ہے کہ "سود اس فیاضانہ اصول کے بالکل منافی ہے جس پر شریعت اسلامیہ کی بنیاد ہے"[2]

امام رازی فرماتے ہیں کہ "سود میں فی الحال زیادتی معلوم ہوتی ہے لیکن حقیقت میں نقصان ہے اور صدقہ صوری حیثیت سے نقصان معلوم ہوتا ہے مگر معناً وہ بڑھوتری ہے وجہ یہ ہے کہ بظاہر سود خوار کا مال بڑھتا ہے لیکن انجام فقر ہوتا ہے"

"جو شخص باوجود ممانعت کے سود لیتا ہے اس کے مال سے برکت چلی جاتی ہے، رسول کریمؐ نے فرمایا ہے کہ ربوا زیادہ ہو تو مال کم ہو جاتا ہے"

"دوسری وجہ یہ ہے کہ اگر اس کی دولت کم بھی نہ ہو تو پھر بھی انجام کار سود خوار کی مذمت کی جاتی ہے اس سے انصاف ساقط ہو جاتا ہے اور بدنام ہو جاتا ہے اور وہ کینہ پرور، سخت دل ہو جاتا ہے"

"تیسری وجہ یہ ہے کہ مفلس لوگ جب یہ دیکھتے ہیں کہ سود خوار ان کی دولت سود کے ذریعہ حاصل کر رہا ہے تو اس پر لعنت بھیجتے ہیں اور بد دعا دیتے ہیں اور یہ ان کی جان و مال سے خیر و برکت کو رخصت کرنے کا سبب بن جاتا ہے"

"چوتھی وجہ یہ ہے کہ جب یہ بات عام لوگوں میں مشہور ہو جاتی ہے کہ فلاں شخص نے سود کے ذریعہ دولت جمع کی ہے تو لالچی لوگ اس کی جانب متوجہ ہو جاتے ہیں اور اس طرح ہر ایک ظالم، چور اور لالچی اس کی دولت لینے کی فکر کرتا ہے اور وہ کہتے ہیں کہ حقیقت میں یہ اس کی دولت نہیں اس لیے اس دولت کو اس کے ہاتھ میں نہ چھوڑنا چاہیئے"

---

[1] ۔ امام رازی؛ تفسیر کبیر ج ۲ ص ۵۹ آیت : الذین یاکلون الربوا
[2] ۔ محمد الخضری؛ تاریخ تشریع الاسلامی ص ۸۶ مطبوعہ ۱۳۳۹ھ / ۱۹۲۰ء

"دنیاوی دولت موت کے بعد باقی نہیں رہتی مگر بدنامی اور گناہ باقی رہتا ہے جو کہ سب سے بڑا نقصان ہے"[1]

سودی کاروبار اور تجارت میں فرق

جاہلیت کے لوگ سودی کاروبار اور تجارتی کاروبار میں فرق نہیں کرتے تھے، امام رازی قرآنی آیت: انما البیع مثل الربوا (تجارت سود جیسی ہی ہے) کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "جاہلیت کے لوگ سود اور تجارت کو مشابہ سمجھتے تھے اور یہ کہ اگر کوئی شخص ایک کپڑا دس روپیہ میں خریدے اور گیارہ میں فروخت کردے تو یہ حلال ہے اسی طرح اگر کوئی دس روپیہ کو گیارہ میں فروخت کردے تو یہ بھی حلال ہونا چاہیے کیونکہ عقلی طور پر دونوں میں فرق نہیں معلوم ہوتا اور ربوا نقد (بٹاون) میں ایسا ہی ہوتا ہے"

"اور ربوالنسیہ (ادھار) میں بھی ایسا ہی ہوتا ہے کہ اگر وہ دس روپیہ کا کپڑا آئندہ سال گیارہ میں فروخت کرے تو جائز سمجھا جاتا ہے اسی طرح اگر کوئی شخص دس روپیہ کے بدلے آئندہ ماہ میں گیارہ دے تو جائز ہونے چاہئیں کیونکہ عقلی طور پر ان دونوں میں کچھ فرق نہیں ہے، اور تجارت اس وجہ سے جائز قرار دی گئی ہے کہ اس میں آپس کی رضامندی ہو جاتی ہے اسی طرح سود بھی جائز ہونا چاہیے جب کہ آپس میں رضامندی ہو جائے اور چونکہ خرید و فروخت احتیاجات رفع کرنے کے لیے ضروری ہے اور ممکن ہے کہ ایک شخص احتیاج کے وقت نادار خالی ہاتھ ہو اور مستقبل میں بے شمار دولت اس کے ہاتھ آجائے پس اگر سود کو جائز قرار نہ دیا جائے تو اصل دار اس کو کچھ نہ دے گا اور انسان یوں ہی احتیاجات کے جنجال میں گرفتار رہے گا اور سود جائز رہنے کی صورت میں اصل دار زیادتی کے لالچ میں اس کو قرض عطا کرے گا اور دولت حاصل ہونے پر زیادتی ادا کرنی زیادہ آسان ہے بہ نسبت اس کے کہ وہ شخص دولت پانے سے پہلے

[1] امام رازی: مفاتیح الغیب تفسیر کبیر ج ۲ ص ۱۱۰

احتیاجات کی دلدل میں پھنسا رہے، پس یہ بات چاہتی ہے کہ سود حلال ہو جیسا اور تمام خرید و فروخت کو حلال رکھا گیا ہے کہ اس سے انسانی احتیاج پوری ہوتی ہے یہ جاہلیت کے لوگوں کا شبہ تھا لیکن خداوند تعالیٰ نے ایک ہی لفظ سے اس کو رد کر دیا جیسا کہ اس کا ارشاد ہے کہ "خدا نے تجارت کو حلال کیا اور سود کو حرام" اور جو کچھ ہم نے کہا وہ ایسا نص صریح ہے جو قیاس کے معارض ہے اگر دین بھی قیاس آرائی سے چلتا تو یہ شبہ یہاں بھی لازم آتا مگر ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ دین کا ثبوت نص سے ہے نہ کہ قیاس آرائی سے[1]

امام رازیؒ نے سود اور تجارت کے باہمی فرق کو واضح کرنے کے لیے قفال[2] کا یہ قول نقل کیا ہے "جو کوئی شخص دس کا کپڑا بیس میں بیچتا ہے تو وہ اس کپڑے کو بیس کے مقابل سمجھتا ہے اور جب رضامندی حاصل ہو جائے تو مالیت بھی ایک دوسرے کے برابر ہو جاتی ہے اور وہ اپنے ساتھی سے کوئی شئے بے معاوضہ نہیں لیتا ہے، لیکن اگر وہ دس (روپیوں) کو بیس (روپیوں) میں فروخت کرے تو اس طرح وہ بغیر معاوضے کے دس (روپے) وصول کرتا ہے اور یہ ممکن نہیں کہ وہ کہے کہ اس کا معاوضہ ادائی کی مدت میں مہلت ہے کیونکہ مہلت نہ تو مال ہے اور نہ ایسی شئے جس کی جانب اشارہ کیا جا سکے چہ جائیکہ اس زائد دس کو مہلت کا معاوضہ قرار دیا جائے[3]

مولانا مناظر احسن صاحب کی رائے

استاد محترم مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی نے ایک دوسرے پیرایہ میں اس فرق کو نمایاں کیا ہے۔

---

[1] ۔ امام رازی؛ مفاتیح الغیب، تفسیر کبیر ج ۲ صفحہ ۲۶۱، آیت: انما البیع مثل الربوا

[2] ۔ قفال بہت بڑے متکلم تھے اور عقلی طرز پر قرآن مجید کی تفسیر لکھی ہے تفسیر کبیر رازی میں جا بجا ان کے اقوال مذکور ہیں، قفال کی کتاب کا نام محاسن الشریعۃ ہے۔

[3] ۔ امام رازی؛ تفسیر کبیر ج ۲ صفحہ ۶۲۔

"دُنیا کے سارے کاروبار لین دین میں معاملہ کے فریقین میں سے
ہر ایک دوسرے کے لیے کچھ قربانی کرتا ہے مثلاً تاجر کپڑے دیتا ہے خریدار نے
روپیہ دیا۔ کرایہ کی شکلوں میں مثلاً موٹر کے مالک کو اگر کرایہ کا روپیہ ملتا ہے تو
جس وقت کرایہ دار اس کی موٹر کو استعمال کرتا رہتا ہے موٹر کے تمام کل پرزے
اپنے صفات کارکردگی کو بتدریج کھوتے رہتے ہیں۔ سال بھر کے بعد مکان کو
جب کرایہ دار واپس کرتا ہے تو ظاہر ہے کہ مکان اور اس کے تمام عناصر و اجزا
اپنے اس حیثیت پر باقی نہیں رہتے جو کرایہ دینے کے وقت ان کی حیثیت
تھی الغرض کرایہ کی شکلوں میں بھی اگرچہ اصل جز یعنے مکان، موٹر وغیرہ
مالک کو واپس ہو جاتی ہے لیکن ان کے صفات کی قربانی ضرور ہو جاتی ہے
اس کے مقابلہ میں جس نے بجائے موٹر کے آپ سے دو ہزار روپے قرض لیے
اور دس سال بعد واپس کیے تو لینے کے وقت آپ اپنے روپیوں کو اسی
طرح ٹھوک بجا کر لیں گے جس طرح آج سے دس سال پہلے دیے گئے تھے
یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس عرصہ میں روپیہ کے صفات پر کہنگی اور فرسودگی
طاری ہو گئی اس کی وجہ روپیہ کی یہ خصوصیت ہے کہ ہر روپیہ دوسرے روپیہ کا
کامل طور سے قائم مقامی کرتا ہے جس کے معنے ہی یہ ہوئے کہ قرض دینے
والے کی طرف سے نہ اصل مال کی قربانی ہوتی ہے اور نہ مال کے صفات کی
اب اگر دس سال تک جو روپیہ آپ کا مقروض کے پاس رہا اس کے معاوضہ
میں آپ ہر مہینے اس کا کرایہ اگر وصول کریں گے تو سوال یہ ہے کہ آپ کی
طرف سے کیا قربانی ہوئی؟ نہ روپیے کے ذات کی نہ صفات کی۔ خلاصہ
یہ ہے کہ قرض دینے والے کی پوزیشن بغیر کسی قربانی کے بالکل محفوظ رہتی ہے
بخلاف لینے والے کے کہ اگر اس نے کسی ضرورت سے قرض لیا اور اس
میں خرچ کر دیا تو روپیہ اور اس کا سود یا کرایہ اس طور پر دے رہا ہے کہ اس نے
روپیہ سے کچھ آمدنی نہیں پیدا کی اور اگر تجارت وغیرہ کے لیے لیا تو تجارت
کی کامیابی ہر حال میں ضروری نہیں لیکن قرض دینے والے کا روپیہ بھی اپنی
ذات و صفات کے ساتھ محفوظ اور اس کی دن دونی آمدنی بھی۔ ایسا شخص جو

اپنے کاروبار میں کبھی نفع اٹھاتا ہے اور کبھی نقصان کیا اس کا مقابلہ کرسکتا ہے جس پر نقصان کے تمام دروازے بند ہیں اور صرف نفع اور کیسا نفع، اضعافاً مضاعفہ (دوگنے چوگنے) کے حساب سے کیا دونوں برابر ہوسکتے ہیں ؟ جو کبھی بیمار نہیں ہوتا اس کی صحت کا مقابلہ وہ کیسے کرسکتا ہے جو کبھی اچھا اور کبھی بیمار رہتا ہے! پس چند دنوں میں تو نہیں لیکن اگر کسی ملک یا قوم میں ذرا زیادہ مدت تک اس قسم کی ایک طرفہ گردش دولت کی جب ہوتی ہے تو یہ دیکھا جاتا ہے کہ ملک کا ایک قلیل گروہ یعنی ایسے لوگ جن کی آمدنی مصارف سے زیادہ رہی ہو اور ان کے پاس قدر حاجت سے بچ کر پس انداز بھی ہوتا ہو جو عموماً ہر ملک و قوم میں تھوڑے ہوتے ہیں جب یہ اپنے روپیہ کو سود کی راہ پر ڈال دیتے ہیں تو ان کے یہی روپیے ملک کے اکثر افراد کے گھروں میں پہنچ پہنچ کر آہستہ آہستہ ان کی دولت کو کھینچ کھینچ کر قرض دینے والوں کی جیبوں میں پہنچا دیتے ہیں اور صدی ڈیڑھ صدی کے بعد یہ تماشہ نظر آتا ہے کہ قوم کے اکثر افراد بدترین معاشی لاغری میں مبتلا اور معدودے چند گھرانوں یا شخصوں کے پاس دولت کا گودام پیدا ہوگیا ہے اور پھر بات اس حد پر آکر رک نہیں جاتی ان دولت مندوں کے پاس اگر دولت اور سرمایہ کی قوت ہوتی ہے تو ملک کی اکثریت اپنے پاس جسمانی قوت رکھتی ہے۔ تنگ آکر ان سود خواروں کی مالی قوت پر جسمانی قوت کا وحشیانہ حملہ ہو جاتا ہے اور پھر اس کے بعد ہوتا ہے جو کچھ ہوتا ہے۔ سلطنتیں تباہ ہو جاتی ہیں امن و امان غارت ہو جاتا ہے عز با بھوکے غضبناک بھیڑیوں کی طرح دولت مندوں کو پھاڑ دیتے ہیں۔ تاریخ ان نتائج کو آج یورپ میں دہرا رہی ہے۔ یا دہرانے والی ہے ؟

"اور یہ سب کس چیز کا نتیجہ ہے یہی کہ "معاشی کاروبار" میں اکل بالباطل (یعنی بغیر کچھ دیے ہوئے دوسرے کے مال سے استفادہ) اور "لا تظلمون ولا تظلمون" (نہ تم کسی پر ظلم کرو اور نہ کوئی تم پر کوئی ظلم کرے) کے قانون کی پابندی سے بے اعتنائی برتی گئی۔ حافظ ابن قیم اعلام الموقعین

یں فرماتے ہیں۔

یربوا المالَ علی المحتاجِ مِنْ غیرِ نفعٍ یحصل لہٗ وَ یَزیدُ مالَ المرابی مِنْ غیرِ نفعٍ یحصل منہ لِاخیہِ فیاکلُ مالَ الاخیہِ بِالباطلِ۔ (ص ۲۰۰)

وہ اپنے مفلس بھائی کو سودی قرض دیتا ہے اور وہ غریب صرف اس روپیہ کو اپنے ضروریات میں صرف کرتا ہے جس سے کوئی نفع نہیں ہوتا ہے لیکن ساہوکار تو اس سے رقم وصول کرتا ہے اور اس طرح وہ اپنے بھائی کا بالباطل طریقہ سے مال کھاتا ہے۔

آخر سودخوار کو جب اس کا روپیہ اپنے تمام ذاتی وصفاتی کمالات کے ساتھ بجنسہٖ واپس ہو جاتا ہے تو بغیر کسی قربانی کے وہ غریب قرض خواہوں سے سود کا روپیہ کس بنیاد پر لے رہا ہے؟

"جس ملک میں اس قسم کے لین دین کی جب کبھی قانونی اجازت دی جائے گی اور اس کے دائرہ میں وسعت پیدا ہوگی تو آمدنی کے پس انداز کرنے والوں کا قلیل گروہ اگرچہ اپنے کو یا اپنے خاندان کو مالی فائدہ پہنچاتا رہے گا لیکن ملک کے اکثر افراد کو شدید معاشی ضرر پہنچے گا اس قسم کے کاروبار ان ہی ممالک میں فروغ پا سکتے ہیں جن کے باشندے اپنے کو صرف اپنے لیے یا اپنے خاندان ہی کے لیے سمجھتے ہوں اور اپنے ملک یا شہر یا گاؤں کے دوسرے افراد سے انھیں کچھ بحث نہ ہو آخر یہ سارا روپیہ جو ان کی پس انداز زائد از ضرورت رقم سے بہ شکل سود ان کے گھر پہنچایا ہے وہ عموماً اس ملک اس شہر اس گاؤں اس محلہ کے باشندوں کی جیبوں سے ہی تو وصول ہوتا ہے جن میں وہ رہتے سہتے ہیں۔ حیرت ہے کہ یورپ آج قومیت اور نیشنیلٹی کے دعویٰ کا اپنے کو ساری دنیا میں علمبردار کہتا ہے اس نے صرف یہی نہیں کیا کہ چند ساہوکاروں اور پیشہ ور سودخواروں کو اس کاروبار کی اجازت دے رکھی ہے بلکہ بنکنگ سسٹم کو جاری کرکے اس نے موقع فراہم کر دیا ہے کہ جن پس انداز کرنے والوں کو سودخواری کی فرصت نہ تھی وہ بھی اب بآسانی سودخواروں کی ٹولی میں شریک ہو کر ملک کی اکثریت کا خون چوسنے میں مشغول ہوں۔"[1]

[1] مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی: اسلامی معاشیات، مسئلہ سود

کساد بازاری کا ایک سبب سودی کاروبار ہے۔

"جب آجروں کو کسی صنعت میں زیادہ سے زیادہ نفع ہوتا ہے تو ادھار روپے سے نیا کاروبار کرتے ہیں کچھ مدت تک کے لیے خوب نفع ہوتا ہے رجائیت (خوش امیدی) کی ایک لہر دوڑ جاتی ہے، قرض دینے والے اداروں میں ضرورت سے زیادہ اعتماد پیدا ہو جاتا ہے اور وہ سٹہ بازوں کو زیادہ سے زیادہ قرض دیتے ہیں اس طرح کم اہل آجروں کو کاروبار کا موقع مل جاتا ہے اور بہت جلد قرض کا میدان اپنی انتہائی حدوں تک پھیل جاتا ہے زیادہ سے زیادہ روپیہ پیداوار میں لگ جاتا ہے اور صارفین کے پاس اس کے مقابلہ میں بہت کم رہ جاتا ہے اور یوں قوت خرید گھٹتی ہے اور قیمتیں گرنے لگتی ہیں اور یہ تغیرات اس وقت تو اور شدید ہو جاتے ہیں جبکہ آجرین یا تاجرین اپنے کاروبار کو ایسے ادھار روپیہ سے چلاتے ہیں جو سود کے ذریعہ حاصل کیا گیا ہو۔ اب وہ اپنے کو جکڑا ہوا سا پاتے ہیں، رسد کو تو وہ روک نہیں سکتے کیونکہ انھیں اپنے قرضے بے باق کرنے ہوتے ہیں اور زیادہ سے زیادہ مال بیچنے کے لیے وہ قیمتوں کو گھٹا بھی نہیں سکتے کیونکہ قیمتوں میں ذرا سی بھی کمی کی جائے تو سود کی شرح اور اسباب کی شکل میں اصل کی مقداروں میں اضافہ ہو جاتا ہے جیسا کہ پروفیسر فشر نے کہا ہے کہ قرض ادا کرنے کے لیے لامحالہ قیمتوں میں قابل لحاظ تخفیف کرنی پڑتی ہے اور یوں آجرین اور تاجرین اپنے معاہدوں کی تکمیل کرنے کے قابل نہیں ہوتے اب یہاں لازمی طور پر سا ہوگا اور پیدا آور اغراض کے لیے سودی قرض لینے والوں کے درمیان ان کے مفادوں کی دوئی کھلم کھلا ایک دوسرے سے ٹکرانے لگتی ہے۔ جوں ہی آجروں کا اہم مفاد پیدا شدہ صورت حال سے نپٹنے کے لیے مالی وسائل کی فراہمی کا مطالبہ کرتا ہے سودی قرض دینے والا طبقہ کا مفاد نہ صرف قرض کا مطالبہ کرتا ہے بلکہ قرضہ کی تجدید کا بھی مخالف ہو جاتا ہے نتیجے میں آجرین اپنی مزاحمت کی قوت کھو بیٹھتے ہیں وہ اپنی رسد کو روک نہیں سکتے آخر ان کے دیوالہ اور بینکوں کی ناکامی کے دوگونہ نتیجے نکلتے ہیں۔ سودی قرض

دینے والا ادارہ ہی ان تمام مشکلوں کا باعث ہے۔ یہ قیمتوں کو بہت زیادہ نقصان رساں حد تک گرا کر رسد کی روک تھام کو ناممکن بنا دیتا ہے غرض یہی ادارہ بے شمار طریقوں سے معاشی تغیرات کا باعث ہے[1]
"کیمبرج کے پروفیسر کینز کو حالیہ جنگ نے لارڈ کینز بنا کر برطانوی حکومت کا مشیر معاشی بنا دیا ہے ان کو تو یہاں تک دعویٰ ہے کہ دنیا کی تمام معاشی بُرائیاں حتیٰ کہ بے روزگاری بھی سودخواری کے باعث ہے اور جس قوم میں سود کی شرح جتنی کم ہوگی اس کی تہذیب و تمدن اتنے ہی بلند اور مستحکم سمجھے جائیں گے جہاں سود کی مکمل ممانعت ہو وہ مطلمحی حالت کو پہنچ جائے گی[2] کہا اسلامی معاشیات کی خوبی یہ کہ اس نے سودی قرض کی بیخ کنی کی اور اصل سرمایہ کو برقرار رکھا اور تمام معاشی بحران سے نجات دی۔

اس ادارہ کے وجود کے معنے یہی ہیں کہ کاروبار میں سود سے مقابلہ ہوتا رہتا ہے یہ صنعت و حرفت کی اصل کمزوری کا باعث ہوتا ہے اول تو یہ صنعت و حرفت میں بڑی تباہی پھیلاتا ہے جبکہ قوت خرید بے قرار نقطہ پر پہنچ جاتی ہے اور یہی ادارہ صنعت و حرفت کو اس نقطہ پر پہنچانے میں بنیادی طور پر ممد ہوتا ہے دوسرے صرف یہی ایک ایسا آلہ ہے جو کہ حد سے زیادہ سٹہ بازی کو ممکن بنا دیتا ہے جس طرح یہ خوش حالی کو تیزی سے بڑھاتا ہے اسی طرح خوش حالی کو تیزی سے گھٹا کے ناپید کر دیتا ہے۔ اسلام ایسی خوش حالی کو نقلی قرار دے کر اس کے خلاف تنبیہ کرتا ہے چنانچہ رسول کریمؐ نے فرمایا ہے کہ "گو سود کی وجہ سے پہلے پہل بیشی ہوتی ہے لیکن آخر وہ کمی اور

---

[1] ۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، ایم حمید اللہ ایم اے (الہ آباد) کا مضمون: اسلامس سولیوشن آف دی بیسک اکنامک پروبلمس رسالہ اسلامک کلچر اپریل ۱۹۳۶ء دسویں جلد مطبوعہ حیدرآباد دکن

[2] ۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کا مضمون انجمن ہائے قرضہ بے سودی کا مقام تنظیم جدید میں ماخوذ از رہبر دکن۔
صنعتی نمبر ذی الحجہ ۱۳۶۳ھ م ڈسمبر ۱۹۴۴ء۔

قلت کا باعث ہوتا ہے[1] قرآن مجید میں یہ حکم ہے کہ

وَمَآ اٰتَیْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّیَرْبُوَا فِیْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا یَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَمَآ اٰتَیْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ تُرِیْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ ۔	اور تم جو سود دیتے ہو کہ لوگوں کے مال میں بڑھتا رہے تو وہ اللہ کے ہاں نہیں بڑھتا اور تم خدا کی خوشنودی کے لیے جو زکوٰۃ دیتے ہو تو یہ وہی ہیں جو اپنے مال میں اضافہ کرتے ہیں ۔

پ ۲۱ الروم ۳۰ ع ۴

رسول کریمؐ نے صاف طور پر فرمایا کہ سود تباہ کن ہے چنانچہ آپ کا ارشاد ہے کہ سات تباہ کن چیزوں سے بچو اور تیسری چیز آپ نے سود بتائی ہے[2]

مسٹر جی فیرو کی مشہور تصنیف "روما کی عظمت اور زوال" میں کئی ایسی مثالیں موجود ہیں جس سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ ساہوکاروں کا گروہ سلطنت روما کی تباہی کا باعث ہوا سود کے ادارہ کی وجہ سے جو غیر مفید صنعتی تغیرات ہوئے ان کو پیگو، فشر اور دوسرے معاشیین نے واضح طور پر بیان کیا ہے ۔

سود سے متعلق عصری معاشیین لارڈ کینز وغیرہ کے نظریے

سود کی نسبت حکومت برطانیہ کے سابق معاشی مشیر لارڈ کینز آنجہانی کے خیالات کا اظہار یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کیونکہ نئے زمانے کے مستند معاشیین میں ان کا شمار ہوتا ہے ۔ گزشتہ صدی میں پروفیسر مارشل نے سود کے مسئلہ میں طلب و رسد کی اہمیت کو نمایاں کرتے ہوئے یہ دکھانے کی کوشش کی تھی کہ شرح سود میں اضافہ ہونے سے لوگوں کی پس اندازی میں اضافہ ہوگا اور زیادہ سے زیادہ زر بازار میں آئے گا ۔

لارڈ کینز نے نہایت پُرزور الفاظ میں مارشل کے اس نظریہ کو غلط ٹھیرایا ہے کہ شرح سود میں اضافے سے پس اندازی کی ترغیب ہوتی ہے حالیہ برسوں میں ہم دیکھتے ہیں کہ باوجود اس کے کہ شرح سود انتہا سے زیادہ گر گئی ہے پھر بھی لوگ اپنا پس انداز سرمایہ برابر بنکوں میں جمع کراتے ہی جا رہے ہیں بلکہ

---

[1] ۔ ابن ماجہ باب الربوا ۔ [2] بخاری مسلم اور ابو داؤد

اس میں اضافہ ہی ہوا ہے لارڈ کینز نے اسنادی نظریہ (کلاسیکل تھیوری) کی تنقید کرتے ہوئے یہ منصفانہ رائے دی ہے کہ اگر کسی شخص کو اس کے سرمایہ پر سود نہ بھی ملے لیکن اس پر بھی وہ اپنی رقم بنکوں ہی میں امانت رکھوائے گا اور یوں ہر کوئی سود پاتا ہے چاہے اس شخص نے پس اندازی نہ کی ہو بلکہ اس نے ورثہ میں پایا ہو غرض پس اندازی کا تعین سود نہیں کرتا خاص کر نئے معاشرہ میں پس اندازی کسی ایک فرد کی کوششوں کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ اسے اجتماعی کوششوں کا نتیجہ سمجھنا چاہیے اور سودی قرض کو بنک وجود میں لاتے ہیں۔

اس بارے میں لارڈ کینز کے ہمنوا پروفیسر گسٹاؤ کاسل نے لکھا ہے کہ "شرح سود میں اضافہ ہونے سے بعض اشخاص تو زیادہ پس انداز کریں گے اور کچھ لوگ پہلے جتنا پس انداز کرتے تھے اس سے کم پس انداز کریں گے"

"پس اندازی کے پیچھے کارفرما محرکات بڑے پیچیدہ ہوتے ہیں" اس سلسلہ میں ہی انھوں نے واضح کیا ہے کہ "خالص پس اندازی پر سود کی جو شرحیں بدلتی ہیں ان کا بہت کم اثر پڑتا ہے"[1]

پس اندازی کے پیچھے کارفرما محرکات کو صحیح طور پر خود مارشل نے یوں بیان کیا ہے کہ "لوگ اپنے بال بچوں کے لیے محنت اور پس اندازی کرتے ہیں اور بعض اوقات اکتسابی عادت کی وجہ سے بچاتے ہیں"[2] لوگوں کی ایک بہت بڑی اکثریت صرف مستقبل کے لیے پس انداز کرتی ہے کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ مستقبل کی ضرورتیں اس زمانہ کی ضرورتوں سے بڑھ کر ہوں گی چنانچہ لوگ بچوں کی تعلیم و تربیت شادی بیاہ اور نیز بڑھاپے میں اپنی گزر بسر کے لیے پس انداز کرتے ہیں پھر یہ بھی ممکن ہے کہ لوگ اپنی پس انداز کی ہوئی رقم کو سودی کاروبار میں نہ لگائیں بلکہ اس کو اندوختہ بنا کر زرِ لاحاصل کی شکل میں ڈال رکھیں چنانچہ بیان کیا جاتا ہے کہ دنیا کی $\frac{3}{4}$ حصہ سے زیادہ پس انداز کی ہوئی دولت اندوختہ بنا کر رکھی گئی ہے مغربی یورپ اور امریکہ میں بڑی بڑی رقمیں بشکل زر

---

[1] نیچر اینڈ نیسسٹی آف انٹرسٹ۔ [2] مارشل: پرنسپلز آف اکنامکس

ذخیرہ بنا کر ڈال رکھی گئی ہیں اس میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ اگر شرح سود میں اضافہ ہو تو شغل اصل میں تخفیف کا رجحان پیدا ہو جائے گا اور یہیں اندازی بھی اسی قدر گھٹ جائے گی جس قدر کہ شرح سود میں اضافہ ہوا۔

عام طور پر شرح سود کے متعلق یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس کے ذریعہ خاصا اصل فراہم ہوتا ہے حالانکہ وہ دنیا کی معاشی ترقی میں مثل ایک رکاوٹ کے حائل ہوتا ہے چنانچہ لارڈ کینز کا کہنا یہ ہے کہ " دنیا کی تمام تکلیفیں یہاں تک کہ بے روزگاری بھی صرف سود خواری کا نتیجہ ہیں "[1] ان کی پوری کتاب کا موضوع ہی یہ ہے کہ

" معاشی معاشرہ جس میں ہم گزر بسر کرتے ہیں اس کے نمایاں نقائص یہی ہیں کہ وہ مکمل روزگار فراہم کرنے میں ناکام رہا ہے اور اس میں یہ (نقص بھی ہے کہ) اس میں تقسیم دولت اور آمدنی کی بے اصولی اور عدم مساوات بھی (موجود) ہے "[2]

شرح سود کم کرنے کی ضرورت سے متعلق لارڈ کینز نے لکھا ہے کہ

" ہم یہ بتا چکے ہیں کہ موثر پس اندازی کا پھیلاؤ انہی تناسب سے ہوتا ہے جس تناسب سے کہ روپیہ کاروبار میں لگایا گیا ہے نیز ہم یہ بھی واضح کر چکے ہیں کہ ادنیٰ شرح سود سے شغل اصل کی مقدار میں اضافہ ہوتا ہے پس یہ ہمارے لیے سودمند ہوگا کہ شرح سود کو اس نقطہ تک گھٹا دیا جائے جہاں پر اصل کی کارکردگی اس طور سے مختتم ہو کہ اس سے مکمل روزگار فراہم ہوتا ہو "[3]

لارڈ کینز نے سود کے برخاست کے امکان پر بھی بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

" سرمایہ کا مالک اس وجہ سے سود حاصل کرتا ہے کہ سرمایہ کی قلت ہے جس طرح زمین کا مالک لگان وصول کرتا ہے کیونکہ زمین کی قلت ہے، گو کہ زمین کی قلت کے اسباب کا ازالہ نہیں ہو سکتا تاہم سرمایہ کی قلت کے اسباب کا ازالہ ہو سکتا ہے "

---

[1] ۔ لارڈ کینز : دی جنرل تھیوری آف ایمپلائمنٹ، انٹرسٹ اینڈ منی باب ۲۴ ص ۳۷۶
[2] ۔ لارڈ کینز : دی جنرل تھیوری آف ایمپلائمنٹ، انٹرسٹ اینڈ منی صفحہ ۳۷۲
[3] ۔ لارڈ کینز : دی جنرل تھیوری آف ایمپلائمنٹ انٹرسٹ اینڈ منی ص ۳۷۵

اس مشکل کو دور کرنے کے لیے اسلامی معاشیات نے زکات کا ادارہ قائم کر کے بنی نوع انسان کی بڑی اعانت کی ہے زکات کے محصول کی تفصیل تو ہم آئندہ "مالیات عامہ" کے باب میں بیان کریں گے البتہ یہاں یہ اشارہ کر دینا کافی ہے کہ اگر معمولی سا بھی غور کیا جائے تو واضح ہو گا کہ اگر کسی شخص کے پاس کچھ سرمایہ ہو اور اس کو کسی کاروبار میں نہ لگا کر یوں ہی اٹھا رکھا جائے تو ہر سال زکات $2\frac{1}{2}$ فی صد رقم سرمایہ سے نکلتی چلی جائے گی اس طرح آہستہ آہستہ پورا سرمایہ ختم ہو جانا خارج از امکان نہیں ہو سکتا۔ یہ چیز سرمایہ دار کو مجبور کرتی ہے کہ نہ صرف معاشرہ کی بہتری کے لیے بلکہ خود اپنے ذاتی منفعت کے لیے بھی اپنا سرمایہ کاروبار میں لگائے۔ اس طرح کافی مقدار میں زر خود بخود بازار میں آ جائے گا اسی سلسلہ میں لارڈ کینز کا یہ ایک اور بیان پیش کرنا بھی برمحل ہو گا اگر اصل کی افراط ہو جائے تو بالآخر۔

"سود کی شکل میں معاوضہ باقی نہ رہے گا لہٰذا عملی طور پر ہمیں یہ نصب العین بنانا چاہیے (اور یہ ناقابل حصول نہیں ہے) کہ اصل کی مقدار میں اس قدر اضافہ کیا جائے کہ بے کار بیٹھ کر روپیہ لگانے والے کو (سود کی شکل میں) زائد منافع نہ ملے۔"[1]

اپنی کتاب کے درمیانی حصہ میں جس کا عنوان ہے "اصل کی نوعیت کے متعلق تاثرات" لارڈ کینز اسلامی مسلک کے بہت ہی قریب پہنچ گئے ہیں ان کا بیان ہے کہ ایک اچھے کھاتے پیتے معاشرہ میں شرح سود کو صفر تک گھٹایا جا سکتا ہے اس کے ساتھ ہی انھوں نے تسلیم کیا ہے کہ لوگ کاروبار کے ذریعہ دولت کما سکتے ہیں۔

"ایک ایسا منضبط معاشرہ جس کے پاس عصری ٹکنیکل وسائل موجود ہوں اور جس کی آبادی میں سرعت سے اضافہ نہ ہو رہا ہو ایک ہی نسل میں اصل کی کارکردگی مختتم کو صفر تک گھٹا سکے گا۔"

---

[1] - لارڈ کینز: دی جنرل تھیوری آف ایمپلائمنٹ، انٹرسٹ اینڈ منی باب ۱۶ ص ۲۲۱

اس کے بعد لارڈ کینز[1] نے بتایا ہے کہ اصل کی انتہائی کارکردگی مختتم صفر ہو تو سرمایہ دارانہ معاشرہ کی بہت سی خامیوں کا ازالہ ہو جائے گا کہ " اصل کو اتنا وافر بنایا جائے کہ اصل کی انتہائی کارکردگی صفر ہو جائے اسی سے رفتہ رفتہ سرمایہ داری کی بہت سے قابل اعتراض خصوصیات سے چھٹکارا پانے کا ایک معقول طریقہ ہو سکتا ہے۔ اگر ذرا بھی دھیان کیا جائے تو یہ خیال ہوگا کہ مجتمعہ دولت سے شرح والیسی مفقود ہو جائے تو اس سے کس قدر عظیم معاشرتی تبدیلیاں وجود میں آسکیں گی اس کے بعد بھی ہر شخص آزاد رہے گا کہ اپنی کمائی ہوئی دولت کو اس خیال سے پس انداز کرے کہ وہ اس دولت کو مستقبل میں صرف کرے گا"۔ اسلامی ماہرین معاشیات نے بھی بتایا ہے کہ حقیقی شرح سود صفر ہی ہو سکتی ہے۔

پس انداز کی ہوئی دولت کا مصرف

ممکن ہے کہ اس نوبت پر یہ سوال پیدا ہو کہ اسلام نے جب ہر قسم کے سودی کاروبار کو اپنے معاشی نظام سے قطعی طور پر خارج کر دیا ہے تو لوگوں کی پس انداز کی ہوئی دولت کو آخر کیونکر کاروبار میں لگایا جا سکتا ہے؟ پھر ضمناً یہ سوال بھی ہو سکتا ہے کہ نئے زمانے کے بڑے پیمانے کے کاروبار دولت کی بہتات اور ریل پیل کے بغیر ناممکن ہیں دنیا کی ساری چہل پہل ان آسائشوں کی بدولت ہے جو سود کی بدولت میسر ہوئی ہیں پورا سودی کاروبار بند کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہر جہتی صنعتی ترقی اور مشینی کاروبار گھڑی بھر میں رک رکا جائیں گے اور دنیا آج سے ہزاروں سال پیچھے کی طرف چلی جائے گی بجلی کے قمقموں کے بدلے ٹمٹماتا ہوا مٹی کا دیا نصیب ہوگا، موٹروں اور ہوائی جہازوں کے بدلے چھکڑے تانگے اور بنڈیاں ملیں گی۔

اگر اسلام کے معاشی نظام کی بنیاد رہبانیت ہوتی تو صاف طور پر کہہ دیا جاتا کہ موٹروں، ہوائی جہازوں، برقی قمقموں اور برقی پنکھوں کی آخر ضرورت ہی کیا ہے ان کے بغیر بھی تو دنیا چل سکتی ہے۔ لیکن اسلام نے تو مادی فائدوں

---

[1] ۔ لارڈ کینز: جنرل تھیوری آف ایمپلائمنٹ انٹرسٹ اینڈ منی

حاصل کرنے کی تعلیم دی ہے اس کا جواب کیا ہو سکتا ہے؟ پہلے سوال کے جواب میں دیکھنے کی یہ بات ہے کہ سرمایہ دار ملکوں میں اگر کسی شخص کے پاس کچھ دولت پس انداز ہوتی ہے تو وہ اس دولت کو کسی بنک کے حوالہ کر دیتا ہے اور ہر سال اپنے سرمایہ کا مقررہ سود پاتا ہے اور وہ اپنے سرمایہ کو نقصان کے تمام پہلوؤں سے محفوظ کر لیتا ہے اور ہر سال وہ جو سود لیتا ہے وہ اس مفروضہ پر مبنی ہوتا ہے کہ اس نے بنک میں جو سرمایہ جمع کیا ہے وہ پیداآور اغراض کے لیے استعمال کیا جائے گا اور بنک سے جو شخص بھی قرض لے گا اس کو ہر حالت میں نفع ہی ہوگا اس مفروضہ میں دو بڑی خامیاں ہیں پہلی خامی تو یہ ہے کہ سرمایہ دار نفع میں تو شریک ہوتا ہے لیکن نقصان میں شریک نہیں ہوتا دوسری خامی یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ پیدائش کا پیچ دار طریق اشیاء کی پیدائش اور صرف میں جو وقت لیتا ہے اس کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے اور قرض دار اپنے سود کا حساب اسی مہینے بلکہ اسی دن اور اسی ساعت سے لگانا شروع کرتا ہے جس دن اور جس ساعت میں کہ اس نے قرضہ دیا تھا ظاہر ہے کہ ایسا طریقہ انسانیت پر مبنی نہیں ہو سکتا۔" اسلام نے صرف سود کو ممنوع کیا ہے دوسرے قسم کے معاملات اسلام میں جائز ہیں بیع سلم جائز ہے یعنے پیسے کاروبار کو پہلے دینا اور جنس بعد وصول کرنا۔ مشارکت بھی جائز ہے یعنے ایک کا پیسہ اور ایک کی محنت صحابہ کرامؓ میں اسلامی اصول سے معاملات کر کے لکھ پتی تھے[1]

غرض اسلامی معاشیات نے سودی کاروبار کو تو ممنوع قرار دیا لیکن ساتھ ہی ساتھ مضاربت، شرکت، شراکت کو جائز ٹھیرایا ہے جس کی تفصیل پیدائش دولت کے باب ۲ میں اصل کے تحت گزر چکی۔ نبی کریمؐ کے زمانہ میں قراض اور شراکتی کاروبار ایسے پسندیدہ تھے کہ زراعت میں بھی ان کا رواج تھا شرکت کے کاروبار میں سرمایہ دار اپنے سرمایہ کا منافع اور محنت کرنے والا اپنی محنت کا صلہ پاتا تھا۔ اسلام نے ایسے پورے سودی قرضوں کو ناجائز ٹھیرایا ہے جس میں سرمایہ دار

---

[1] مولانا عبدالقدیر صاحب صدیقی: تفسیر القرآن بحوالہ رسالہ درس القرآن حیدرآباد دکن بابت محرم ۱۳۶۳ھ

پہلے ہی معاہدہ کر لیتا ہے کہ قرض دار کو خواہ نفع ہو یا نقصان سرمایہ دار اپنے سرمایہ کا سود لیکر رہے گا" کاروبار کی مالی شرکت میں اگر معاوضہ کی شرح پہلے سے معین نہ کی جائے بلکہ حسب حال کمی بیشی کے ساتھ نفع و نقصان میں شرکت رہے تو سود کی صورت باقی نہیں رہتی جو کچھ ملتا ہے منافع ہوتا ہے اور منافع ہر طرح جائز ہے بلکہ بلا کسی لحاظ مذہب عملی تجربہ سے بھی دنیا سود کی مضرت اور منافع کی منفعت کی قائل ہو رہی ہے[۱]

غرض بغیر سود لیے بھی مالی معاملات چل سکتے اور اچھی طرح چل سکتے ہیں مشترکہ سرمایہ دار کمپنیوں کے لیے لاکھوں کروڑوں کا سرمایہ آج بھی بغیر کسی سودی لالچ کے اکھٹا ہوتا ہے۔ اصل نکتہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص سرمایہ رکھتا ہو تو سرمایہ حاصل کرنے والے کا اس طرح شریک کار بن سکتا ہے کہ نفع میں بھی شریک اور نقصان میں بھی۔ اسلامی معیشت نے آجر اور سرمایہ دار کو برقرار رکھا ہے لیکن وہ سرمایہ دار جس کو ہم ساہوکار کہتے ہیں معاشرہ سے نکال دیا ہے اور یوں صنعت و حرفت اور ہر قسم کے کاروبار کے لیے مضبوط بنیاد فراہم کی ہے گو اس طرح کے کاروبار کی رفتار اپنی ابتدائی حالت میں کچھ دھیمی رہتی ہے لیکن بعد میں نہایت تیز، متعین اور ایسی پائدار ہو جاتی ہے کہ تجارتی بحران سے بھی کاروبار محفوظ رہتا ہے

سود کے ناجائز ہونے میں کوئی کلام نہیں ہو سکتا اور معاوضے کی جو آخری شکل مقسوم ہے اس کے جواز میں کوئی شک نہیں البتہ سود کی دوسری صورت جبکہ کاروباری قرضے پر پہلے ہی سے شرح تعین کر دی جائے شائد اختلاف رائے کا محل بن سکے لیکن اس میں بھی عدم جواز کا پہلو راجح ہونا یقینی ہے، خود تجربے کی بنا پر اشتراکیت اس کے خلاف ہیں اور جبکہ حاصہ دار مقسوم کے ذریعہ سے قرضے اور سود کا مقصد بخوبی حاصل ہو سکتا ہے تو پھر یہ اعتراض بھی قطعاً باقی نہیں رہتا کہ عدم جواز سود کاروباری ترقی کا مانع ہے بلکہ شرکتِ مقسوم اس کا بہتر بدل موجود ہے

۱۔ محمد الیاس برنی صاحب: پانچویں معاشی کانفرنس حیدرآباد کا خطبہ صدارت بحوالہ مجلہ طیلسانین عثمانیہ جلد ۷ بابتہ ماہ ربیع الاول ۱۳۶۲ھ مطابق مارچ ۱۹۴۳ء

اور تجربے سے روز افزوں رواج پا رہا ہے گویا علمی تحقیقات اور عملی تجربہ بھی مذہبی مسلک کی طرف راجع ہے[1]

ہندوستان اور پاکستان کی پستی کا ایک سبب سودی کاروبار کا رواج

ہندوستان کا کاشت کار "مقروض پیدا ہوتا ہے، مقروض زندگی بسر کرتا ہے اور مقروض مرتا ہے بلکہ مرنے کے بعد اپنے ورثاء کو مقروض چھوڑ جاتا ہے"۔ سر مالکم ڈارلنگ نے اپنی کتاب "پنجاب کا کاشت کار قرض اور خوشحالی میں" لکھا ہے کہ "پنجاب کا کاشت کار جو سود ادا کرتا ہے وہ مجموعی مالگذاری کی رقموں سے دوگنا ہوتا ہے"[2] جبکہ سود کی شرح ۲۵ سے ۵۰ فی صد ہو تو بھلا کاشت کار کو کیا بچ سکتا ہے چنانچہ کاشت کار خستہ حال ہیں اور دولت بھی کم پیدا ہوتی ہے اگر قرض کمتر شرح سود پر مل سکے تو پیدائش دولت میں بہت کچھ ترقی کی گنجائش ہے[3]

اسلامی مملکت بیت المال سے کاشت کاروں کو بلا سودی یعنے صفر شرح پر قرض دیا کرتی تھی[4] ضرورت ہے کہ آج ہندوستان و پاکستان میں بھی سودخواری کو پورے طور پر ممنوع قرار دیا جائے۔

سودی کاروبار اور صنعتی ترقی:- "ہندوستان میں صنعتی پستی کا بڑا سبب میری رائے میں یہاں سودی کاروبار کا بے روک ٹوک رواج ہے۔ جب ساہوکار طبقہ کو روک ٹوک کے ساتھ کم سے کم ایک روپیہ فی صد سود مل جاتا تھا تو انھیں کیا ضرورت تھی کہ اپنا اصل صنعتی کاروبار میں لگاتے جہاں عموماً ایک فی صدی سے کم ہی روپیہ ملتا ہے ۱۹۳۳ء سے مختلف صوبہ جات نے سودی کاروبار پر کڑی پابندیاں عائد کر دی ہیں اور شرح سود کی تحدید کر دی ہے اور کئی نفع بخش موقعے

---

[1] پروفیسر محمد الیاس برنی صاحب ،معیشت الہند۔ باب دوم فصل دہم صفحہ (۲۹۹)
[2] ڈارلنگ : پنجاب کا کاشت کار قرض اور خوشحالی میں صفحہ
[3] مورلینڈ ؛ انٹروڈکشن ٹو اکنامکس باب پنجم فصل ۳۵
[4] اس کی وضاحت مبادلۂ دولت کے باب میں بیت المال کے تحت کی گئی ہے۔

ساہوکاروں کے ہاتھ سے نکل گئے اب لامحالہ ان کو اپنے روپیہ کا کچھ حصہ تجارت یا صنعتی کاروبار میں لگانا پڑ رہا ہے۔"

"مجھ سے اگر پوچھا جائے کہ اس ملک میں صنعتی ترقی جلد سے جلد کیونکر کی جائے تو میں کہوں گا کہ عام سودی کاروبار کو قطعی طور پر ممنوع قرار دینا چاہیے نہ نو من تیل ہوگا نہ رادھا ناچے گی۔ سرمایہ دار مجبور ہو جائیں گے کہ وہ اپنا روپیہ صنعتی کاموں پر لگائیں۔ ساہوکار لوگ اگر سودی کاروبار کو چھوڑ کر صنعتی کاروبار کی طرف متوجہ ہوں تو ملک میں جلد صنعتی ترقی ہو سکتی ہے۔ بمبئی کی بہت سی صنعتیں ایسے لوگوں کی کوششوں کی مرہون منت ہیں"[1]

بہر طور آج بھی ایک ایسے سرمایہ دارانہ معاشرہ کی داغ بیل ڈالی جا سکتی ہے جس میں سود نہ لیا جاتا ہو یا زیادہ صفائی سے یوں کہا جا سکتا ہے کہ سرمایہ دارانہ معاشرہ بغیر سودی کاروبار کے بھی برقرار رہ سکتا ہے یہ امکان اب تیزی سے حقیقت بنتا جا رہا ہے انگلستان میں تو چالو کھاتہ پر کچھ سود نہیں دیا جاتا اور کمتر شرح سود کے باوجود پس اندازی میں کچھ بھی رکاوٹ نہیں بلکہ اس کے برعکس پس اندازی میں مزید اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر مالی ذریعوں کی مناسب طریقہ پر ذمہ داری لی جائے اور حکومت اس کی باقاعدہ نگرانی کرے تو روپیہ سود کے بغیر حاصل کیا جا سکتا ہے اگر جنگ کے دوران میں امریکہ میں حکومت کی نگرانی کی وجہ سے شرح سود صرف ایک فی صد ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ امن کے زمانہ میں ——— میری اس رجائیت پسندی کو معاف فرمائیے گا ——— شرح سود صفر یا صفر کے قریب پہنچ سکے گی۔

تہذیب و تمدن کی بقا کے لیے سود کو ممنوع قرار دینا ضروری ہے اس سلسلہ میں فرانسیسی پروفیسر لوئی ماسین نون کا یہ طرز بیان دیکھنے کے قابل ہے:—

---

[1] مضمون "حیدرآباد کا صنعتی مستقبل" از ڈاکٹر انور اقبال صاحب قریشی مشیر مالیات حکومت حیدرآباد ماخوذ از رہبر دکن (صنعتی نمبر) جلد ۲۴ مورخہ ۸ ذیحجہ ۱۳۶۲ھ م ۶ دسمبر ۱۹۴۳ء۔

"سرمایہ داری اور اشتراکیت کے تصادم میں اسی تمدن اور تہذیب کا مستقبل محفوظ اور درخشاں رہے گا جو سود کو ناجائز قرار دے کر اس پر عمل بھی کر رہا ہو۔"[1]

(۷) اُجرتِ تنظیم یا مُنافعہ

آجر کی اہمیت بڑے پیمانہ کے نئے کاروبار اور صنعتی نظام میں آجر کی خدمات کو خاص اہمیت حاصل ہے، آجر ملک کے عطیاتِ قدرت، زمین، محنت اور سرمایہ کو اکھٹا کرتا ہے اور ان کی ہم آہنگی سے بہتر سے بہتر طریقہ پر استفادہ کرتا ہے، وہ ملک کی دولت میں زیادہ سے زیادہ اضافہ کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اپنی تنظیمی خدمتوں کا صلہ یا معاوضہ پاتا ہے۔

تنظیم بھی ایک قسم کی دماغی محنت ہے اور اس محنت کا معاوضہ اس کو منافعہ یا اجرتِ تنظیم کی شکل میں ملتا ہے۔ "منافعہ کو بھی اجرت کی ایک شکل شمار کرنا زیادہ مناسب ہوگا تاہم اس میں اکثر خاص خصوصیتیں بھی ہیں اور اسی لحاظ سے وہ الگ غور و بحث کا طالب ہے۔"[2] تقسیم دولت کی بحث میں اس قسم کے منافعہ کے لیے کئی اصطلاحیں استعمال کی جاتی ہیں مثلاً اجرتِ تنظیم، خالص منافعہ، کاروباری آمدنی، آجر، مہتمم یا منتظم کا حصہ وغیرہ۔ کاروباری منافعہ سے جس قسم کی آمدنی مراد ہے اس پر اس فصل میں غور کیا جائے گا۔

ہر وہ شخص جو عطیاتِ قدرت زمین، محنت اور تھوڑے بہت اصل سے کام لے کر بطور خود کاروبار کرے عام طور سے اسے آجر سے تعبیر کیا جاتا ہے

---

[1] مجوزہ مضمون ڈاکٹر حمید اللہ: انجمن ہائے قرضہ حسنہ کی اہمیت اور حیدرآباد میں ان کی حالت۔ مجلہ طیلسانین عثمانیہ ج۔ حصہ دوم ج ۴ ستمبر ۱۹۴۳ء
[2] ٹاسگ: پرنسپلز آف اکنامکس ج ۲ باب ۴۹ صفحہ ۱۶۴

چاہے اس کا کاروبار چھوٹے پیمانے کا ہو چاہے بڑے پیمانے کا" لیکن ہم زیادہ تر ان لوگوں کے کاروباری انتظام کے تعلق سے تصور قائم کرتے ہیں جو کاروبار کو بڑے پیمانے پر انجام دیتے اور کثیر مقدار میں اصل فراہم کر کے اس کا انتظام کرتے ہیں، اور دوسرے مزدوروں سے اجرت پر اپنی نگرانی میں کام لے کر اہم اور اہتمام طلب منصوبے اور خاکے مرتب کرتے ہیں جن کا کام خود زیادہ تر معاملات کی نگرانی اور انجام دہی ہوتا ہے[۱] "کاروباری شخص کے ہاتھ میں صنعت کے انتظام کی عنان ہوتی ہے اور وہی صنعتی کاروبار کا رہنما اور قائد ہوتا ہے سب سے پہلے کاروبار کی آمدنی اس کے ہاتھ میں آتی ہے اور وہ دوسروں کو اس کا حصہ تقسیم کرتا ہے"[۱]

اسلامی نظام نے آجر کے وجود کو تسلیم کیا ہے، ہر شخص آزاد ہے چاہے خود کاروبار کرے یا دوسروں کو اجرت پر رکھ کر ان سے کام لے، کاروبار کا منتظم اپنی خدمات کا معاوضہ پانے کا حق رکھتا ہے، حضرت ابوبکر صدیق رضؓ تجارت پیشہ تھے آپ روزانہ صبح کو بازار جاتے اور خرید و فروخت میں مشغول رہتے۔ خلافت کی ابتدا میں علاوہ حکومتی کاروبار کے آپ اپنے اور اپنے اہل وعیال کی ضرورتوں کے لیے تجارت بھی کرتے رہے لیکن جب سارا وقت حکومت ہی کے کاروبار میں صرف ہونے لگا اور تجارت سے دست بردار ہونا پڑا تو مہاجرین و انصار کے مشورے سے آپ کا روزینہ بیت المال سے مقرر کیا گیا جس کی مقدار ابتدا میں کم تھی لیکن کام اور گنجایش بڑھنے سے بعد میں چھ ہزار درہم سالانہ تک بڑھ گئی[۲] منقول ہے کہ "جب ابوبکر رضؓ خلیفہ منتخب ہوئے تو انھوں نے کہا کہ بے شک میری قوم جانتی ہے کہ میرا پیشہ ایسا ہے جو مجھے اپنے اہل وعیال کی پرورش کے واسطے ہر طرح کافی ہے لیکن میں مسلمانوں کے کام میں لگا دیا گیا ہوں تو اب ابوبکر کے بال بچے اس مال (بیت المال) سے

---

[۱] ٹاسگ: پرنسپلز آف اکنامکس ج ۲ باب ۴۹ صفحہ ۱۴۶۔

[۲] تاریخ طبری صفحہ ۲۱۴۴ ابوبکرؓ کے قاصدوں، منشیوں اور عمال اور قاضیوں کے نام۔

روزی پائیں گے اور میں مسلمانوں کا کام کروں گا[1] یعنے خلافت و حکومت کے کاروبار کو حضرت صدیق اکبرؓ نے پیشہ (احتراف) قرار دیا اور اسی بنا پر آپ نے اپنے گھر والوں کے واسطے معاش بیت المال (سرکاری خزانہ پبلک ٹریژری) سے مقرر کی اس کا ثبوت قرآن مجید میں بھی ملتا ہے کہ بیت المال کے تحصیلداروں کلکٹروں کی تنخواہ "والعاملین علیہا" (جو زکوٰۃ وصول کرنے پر مقرر ہوں) کے الفاظ سے درست ہے۔ اسی طرح قرآن میں یتیموں کے مال و جائداد کے نگران کار یا منتظم کو حکم دیا گیا ہے کہ

وَمَنْ كَانَ فَقِيرًا فَلْيَأْكُلْ بِالْمَعْرُوفِ اور جو مفلس ہو دستور کے موافق کھائے

پ ۴ النساء ۴ ع ۱

اور اسی "دستور کے موافق کھانے" کی اجازت ہی گویا آجر یا منتظم یا مہتمم کو اس کی تنظیم اور نگرانی کا معاوضہ دلاتی ہے۔

(۸) حکومت کی آمدنی میں تقسیم دولت کا اصول

ملک کے عام باشندوں کی بھلائی اور آسودگی کے لیے اسلامی مملکت محصول لگان، محصول جزیہ، محصول زکوٰۃ اور محصول درآمد وغیرہ کی شکل میں جو رقمیں وصول کرتی ہے اس کا بیان "مالیات عامہ" کے باب میں کیا گیا ہے البتہ تقسیم دولت کی بحث کے سلسلہ میں اسلامی مملکت میں تقسیم دولت کا جو اصول کار فرما تھا اس سے یہاں کچھ بحث کی جاتی ہے۔

عہد رسالتؐ میں دولت کی تقسیم عہد رسالتؐ میں سب سے پہلے مال غنیمت جنگ بدر میں ملا اور آنحضرتؐ نے اس کو بدر کے شرکا میں برابر برابر تقسیم کر دیا چنانچہ "ابوامامۃ الباہلیؓ" کہتے ہیں کہ میں نے

[1] بخاری پ ۸ کتاب البیوع نیز کتاب الاموال ص ۲۶۶ نمبر ۶۵۶۔

عبادۃ بن الصامتؓ سے آیت "انفال" (مال غنیمت) کی تفسیر پوچھی انھوں نے کہا کہ یہ آیت ہم اصحاب بدر کے متعلق نازل ہوئی جب مال غنیمت کے متعلق ہم میں سخت اختلاف ہوا اور نوبت یہاں تک نوبت پہنچی تو اللہ نے اُسے ہم سے چھین کر رسول اللہؐ کو دے دیا اور آنحضرتؐ نے اسے تمام مسلمانوں میں مساویانہ طریقے پر تقسیم کر دیا اور اس میں اللہ کا تقویٰ اس کے رسولؐ کی فرماں برداری اور آپس کے تعلقات کی اصلاح تھی۔[۱]

بدر کی جنگ کے بعد بنو قینقاع کے غزوے میں مسلمانوں کو غنیمت ملی" اسی غزوے میں پہلا خمس نکالا گیا اس موقع پر آپ نے اپنا خاص اور عام حصہ لیا۔ خمس لیا اور بقیہ چار حصوں کو صحابہؓ میں تقسیم فرما دیا یہ پہلا خمس ہے جو رسول اللہؐ نے لیا۔[۲]

پھر ۳ھ میں غزوہ قردہ میں بڑی غنیمت ہاتھ آئی چنانچہ "بیس ہزار اس غنیمت کا خمس ہوا تھا جسے رسول اللہؐ نے امت کے عام مفاد کے لیے لے لیا باقی چار حصے شرکائے مہم پر تقسیم کر دیے۔[۳]

پھر ۴ھ میں رسول اللہؐ نے بنو نضیر کا محاصرہ کر لیا اور انھوں نے رسول اللہؐ کے حکم پر ہتھیار ڈال دیے رسول اللہؐ نے انھیں مدینہ سے جلاوطن کر دیا[۴] بنو نضیر نے جو اپنی تمام املاک رسول اللہؐ کے حوالہ کر دی وہ خاص آپ کی ایسی ملکیت قرار پائی کہ آپ جس طرح چاہیں اسے خرچ کریں چنانچہ

۱۔ تفسیر طبری ج ۹ صفحہ ۱۰۹ آیت: یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْاَنْفَالِ نیز تاریخ طبری ص ۱۳۳۴ واقعات جنگ بدر ۲ھ

جنگ بدر میں جب فتح ہو چکی تو کچھ لوگ دور تک کافروں کا پیچھا کرتے ہوئے چلے گئے اور کچھ لوگ رسول کریمؐ کی خدمت میں پہرے تعاقب کرنے والے واپس آئے تو انھوں نے دعویٰ کیا کہ مال غنیمت ہمارا حق ہے کیونکہ ہم دشمن سے لڑ کر آئے ہیں ان لوگوں نے کہا ہم رسول اللہؐ کے محافظ تھے اس لیے ہم زیادہ حق دار ہیں اس پر آیت بالا نازل ہوئی (تفسیر طبری ج ۹ ص ۱۰۹)۔

۲۔ تاریخ طبری عہد رسالت ص ۱۳۶۲ غزوہ بنی قینقاع۔ ۳۔ تاریخ طبری عہد رسالت ص ۱۳۷۵ غزوہ القردہ ۳ھ کے واقعات۔

آپ نے انصار کو چھوڑ کر اسے صرف پہلے مہاجرین میں تقسیم کر دیا انصار میں سے سہیل بن حنیف رض اور ابو دجانہ سماک بن خرشہ رض نے اپنی غربت کی وجہ سے رسول اللہ صلعم سے درخواست کی کہ ہمیں بھی کچھ عطا فرمائیے۔ آپ نے اس میں سے ان کو بھی دیا[1]

"جب رسول اللہ صلعم کے قبضے میں بنو نضیر کے اموال آئے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا

هُوَ الَّذِی أَخْرَجَ الَّذِینَ کَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْکِتَابِ مِنْ دِیَارِهِمْ لِأَوَّلِ الْحَشْرِ۔	وہی ہے جس نے اہل کتاب میں سے کفرانِ نعمت کرنے والوں کو ان کے گھروں سے نکال دیا کہ وہ اپنے ان ساتھیوں سے جا ملیں جو اُن سے پہلے جلا وطن کیے جا چکے ہیں۔
پ ۲۹۔ الحشر ع ۳	

اور یہ ان اموال میں سے تھے جن کے لیے مسلمانوں نے اپنے گھوڑے اور اونٹ نہیں دوڑائے تھے، رسول اللہ صلعم نے انصار سے فرمایا: تمہارے بھائی مہاجر نادار ہیں اگر تمھاری مرضی ہو تو میں یہ مال اور تمھارے اموال سب تم دونوں میں تقسیم کر دوں اور اگر یہ نہ چاہو تو تم اپنے اموال اپنے ہی پاس رہنے دو، میں یہ مال مہاجرین میں تقسیم کیے دیتا ہوں۔ انھوں نے عرض کی یہ مال تو آپ اُن ہی میں تقسیم فرما دیجے لیکن ہمارے اموال میں سے جتنا چاہے انھیں عطا فرمائیے ان کی نسبت یہ آیت نازل ہوئی۔

وَیُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ وَلَوْ کَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ۔	وہ ایثار کرکے اپنے اوپر (مہاجرین کو) ترجیح دیتے ہیں اگرچہ وہ خود مفلس ہو جائیں[2]

۵ھ میں بنو قریظہ نے سرکشی کی تو رسول اللہ صلعم نے اُن پر چڑھائی کی اور بالآخر رسول اللہ صلعم نے بنو قریظہ کی املاک، عورتوں اور بچوں کو مسلمانوں میں تقسیم کر دیا۔ اس مرتبہ آپ نے سوار اور پیدل کے حصوں میں تفریق کر دی

---

[1] ۔ تاریخ طبری عہد رسالت صفحہ ۱۲۵۳ بنو نضیر کی جلاوطنی ۴ھ کے واقعات۔

[2] ۔ بلاذری؛ فتوح البلدان صفحہ ۳۰ اموال بنو نضیر۔

نیز آپ نے اس میں سے خمس نکالا۔ سوار کے تین حصے، دو گھوڑے کے اور ایک خود سوار کا مقرر کیا۔ اور پیدل کا ایک حصہ مقرر فرمایا۔ اس مہم میں مسلمانوں کے چھتیس سوار شریک تھے یہ پہلا مال غنیمت ہے جس میں دو حصے علیحدہ علیحدہ دیے گئے اور اس سے خمس نکالا گیا جو آج (مورخ طبری کے زمانے) تک برقرار ہے اس سے پہلے مغازی میں یہ دستور تھا کہ جب پیدل کے ساتھ رسالہ بھی شریک ہوتا تو دو گھوڑوں کا ایک حصہ دیا جاتا[1]

بنو قریظہ کے خاتمہ کے بعد رسول کریمؐ نے خیبر پر چڑھائی کی۔ تقسیم اراضی کی بحث میں بتایا جا چکا کہ رسول اللہؐ نے اراضی کے قطعے قطعے کر کے تمام شرکا کو مساوی مساوی زمین کے پلاٹ عطا فرما کر خود اپنی ذات کے لیے بھی ایک ہی پلاٹ لے لیا۔

خیبر کے بعد مکہ فتح ہوا پھر ہوازن سے مقابلہ ہوا جس میں ہوازن نے شکست کھائی "جنگ کے بعد تمام قیدی اور مال غنیمت جمع کر کے رسول اللہؐ کی خدمت میں پیش کیا گیا مسعود بن عمرو القاری مال غنیمت کے امین تھے۔ رسول اللہ کے حکم سے سب قیدی اور مال جعرانہ میں محفوظ کر دیا گیا[2]

پھر آپ طائف کی طرف متوجہ ہوئے ایک عرصہ تک محاصرہ کے بعد محاصرہ اٹھا لیا۔ اور مدینہ کی طرف روانہ ہوئے" طائف جانے سے پہلے ہی آپ نے ہوازن کے قیدیوں کو جعرانہ بھیج دیا تھا اور وہ یہیں قید تھے۔ واپسی پر جعرانہ کے قیام میں ہوازن کے وفد آپ کی خدمت میں آئے۔ ہوازن کی عورتوں اور بچوں کی بڑی تعداد قید تھی، چھ ہزار اونٹ اور بے شمار بھیڑ بکریاں مال غنیمت میں ہاتھ آئی تھیں[3] اس وفد نے آنحضرتؐ سے بات چیت کی اور اپنے بال بچوں کی واپسی کی استدعا کی آپ نے اسے منظور کرتے ہوئے

---

[1] تاریخ طبری عہد رسالت ص۔۔ غزوہ بنی قریظہ ۵ھ کے واقعات

[2] تاریخ طبری عہد رسالت ص۱۶۲۵ غزوہ ہوازن حنین میں۔

[3] تاریخ طبری عہد رسالت ص۱۶۲۶ غزوہ ہوازن حنین میں۔

ان کے بال بچوں کو انھیں واپس دے دیا[۱] حنین کے قیدیوں کو ان کے وارثوں کے سپرد کرنے کے بعد آنحضرت صلعم سوار ہو گئے۔ لوگ آپ کے پیچھے پڑ گئے اور کہنے لگے یا رسول اللہ صلعم! آپ ہمارے مال غنیمت کے اونٹ اور بکریاں تو ہم میں تقسیم کرتے جائیے۔ ان کی یورش نے آپ کو ایک جھاڑی کے قریب کر دیا جس سے الجھ کر آپ کی چادر کاندھوں سے اُتر گئی[I] آپ نے اُن لوگوں سے فرمایا اے لوگو! میری چادر تو مجھے دیدو بخدا! اگر میرے پاس اتنے اونٹ ہوتے جتنے تہامہ میں درخت ہیں تو میں ان سب کو تم میں تقسیم کر دیتا تب شاید تم مجھے بخیل، بزدل اور جھوٹا نہ سمجھتے۔ اس کے بعد آپ اپنے اونٹ کے پاس تشریف لائے اور آپ نے اس کے کوھان میں سے مُٹھی بھر بال انگلیوں میں لیے اور ان کو لوگوں کو دکھا کر فرمایا اے لوگو! بخدا تمھاری غنیمت اور اس پشم کے مٹھے میں میرا صرف پانچواں حصہ ہے اور وہ میں تم کو دیے دیتا ہوں[۱]

غرض رسول اللہ صلعم نے تقسیم شروع کی۔ آپ نے قبائل کے عمائد اور اشراف کو ان کی تالیف قلوب کے لیے بڑی بڑی عطائیں عطا فرمائیں چنانچہ آپ نے ابو سفیان بن حربؓ کو سو اونٹ اور ان کے بیٹے معاویہؓ کو سو اونٹ

I۔ جاہل بدو عرب آپ کے ساتھ بعض وقت تو بالکل نازیبا سلوک کرتے لیکن شان رسالت صلعم تحمل سے برداشت کر لیتی چنانچہ انس بن مالکؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک دن میں ذات اقدس صلعم کے ساتھ چلا جا رہا تھا اور آپ اس وقت دبیز اور سخت کنارے والی نجرانی چادر اُوڑھے ہوئے تھے (راستہ میں) ایک بدو نے اس زور سے چادر کو گھسیٹا کہ آپ کے مونڈھے پر اس کا نشان پڑ گیا اور کہا اے محمدؐ! تمھارے پاس جو خدا کا مال ہے اس میں سے میرے واسطے بھی تو کچھ حکم دو آپ مسکرائے اور اس کو کچھ عنایت کرنے کا حکم دیا۔

(بخاری ج ۲ کتاب الادب نیز مسلم وغیرہ)

۱۔ تاریخ طبری ص ۱۶۷۸ غزوہ حنین ھوازن میں۔

عنایت کیے اسی طرح حکیم بن حزامؓ، بنو عبدالدار کے نضیر بن الحارث بن کلدہ بن علقمہ علاء بن حارثہ الثقفی بنو زہرہ کے حلیف، حارث بن ہشام، صفوان بن امیہ سہیل بن عمرو، جویطب بن عبدالعزیٰ بن ابی قیس، عینیہ بن حصن، اقرع بن حابس التمیمی اور مالک بن عوف النضری ان اصحاب میں سے ہر ایک کو سو سو اونٹ دیے۔ ان کے علاوہ قریش کے مخرمہ بن نوفل بن اہیب الزہری عمیر بن وہب الجمحی اور بنو عامر بن لوی کے ہشام بن عمرو کو سو سے کم دیے سعید بن یربوع بن عنکشہ بن عامر بن مخزوم اور سہمی کو پچاس پچاس اونٹ دیے۔ عباس بن مرداس السلمی کو چند اونٹ دیے جس سے وہ ناراض ہو گیا، اور اس نے اس کی شکایت میں چند شعر کہے رسول اللہؐ کو جب خبر ہوئی تو آپ نے صحابہ سے فرمایا؛ جاؤ اور اس کی زبان بند کر دو۔ آپ نے اس بناء پر اسے اور اونٹ دے دیے اور اس طرح اس کا منھ بند ہو گیا جیسا رسول اللہؐ نے ارشاد فرمایا تھا[1]

پھر "جب جعرانہ میں رسول اللہؐ نے مال غنیمت کو مسلمانوں میں تقسیم کیا تو ہر شخص کے حصے میں چار اونٹ اور چالیس بکریاں آئیں، جو سوار تھے انھوں نے اپنے گھوڑے کا بھی ایک حصہ لیا[2]

بعض صحابہ کا شکوہ اور رسول اللہؐ کا جواب

"جب رسول کریمؐ نے قریش اور دوسرے قبیلوں میں وہ عطا تقسیم کی جس کا ذکر ہوا اور انصار کو اس میں سے کچھ نہیں ملا تو وہ اپنے دل میں سخت ملول ہوئے اور اس پر چہ میگوئیاں کرنے لگے۔ کسی نے یہ کہا کہ بخدا رسول اللہؐ اپنی قوم سے مل گئے۔ سعد بن عبادہؓ آپ کے پاس آئے اور کہا یا رسول اللہؐ! یہ جماعت انصار آپ کے اس طرز عمل سے آزردہ ہے کہ آپ نے اس مال غنیمت کو صرف اپنی قوم میں تقسیم کر دیا

[1] ۔ تاریخ طبری عہد رسالت غزوہ حنین ہوازن میں ص ۱۶۷۹

[2] ۔ تاریخ طبری عہد رسالت غزوہ حنین ہوازن میں ص ۱۶۸۰ بروایت عبداللہ بن ابی بکرؓ

اور عرب کے دوسرے قبیلوں میں بھی بڑے بڑے عطیے تقسیم کیے مگر انصار کے قبیلے کو اس میں سے کچھ بھی نہیں ملا۔ رسول اللہ ؐ نے پوچھا تمھارا اپنا خیال کیا ہے؟ سعدؓ نے کہا یا رسولَ اللہ! میں بھی اپنی قوم کا ہمنوا ہوں، آپ نے فرمایا کہ اپنی تمام قوم کو اس احاطہ میں بلا لاؤ۔ سعدؓ اپنی قوم کو اسی احاطہ میں بلا لائے۔ دوسرے اکابر مہاجرین بھی وہاں آئے سعدؓ نے ان کو نہ روکا وہ اندر چلے گئے اور عام لوگ آئے ان کو سعدؓ نے اندر جانے سے روک دیا۔ جب سب جمع ہو گئے سعدؓ نے رسول اللہ ؐ کو جا کر اس کی اطلاع کی۔ آپ وہاں تشریف لائے۔ آپ نے اللہ کی شایانِ شان حمد و ثنا کے بعد فرمایا: تمھاری اس بات کا کیا مطلب ہے جس کی اطلاع مجھے ملی ہے؟ تم کیوں اپنے دل میں رنجیدہ ہو؟ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ جب میں تمھارے پاس آیا تم گمراہ تھے اللہ نے تم کو ہدایت کی، تم غریب تھے اللہ نے تم کو مالدار کر دیا، تم آپس میں ایک دوسرے کے دشمن تھے اللہ نے تم کو ایک دوسرے کا دوست بنا دیا۔"

انصار نے کہا بے شک! آپ صحیح فرماتے ہیں، یہ اللہ اور اس کے رسول کا احسان اور فضل ہے۔"

رسول اللہ ؐ نے پھر فرمایا تم مجھے جواب کیوں نہیں دیتے؟ انصار نے کہا ہم کیا جواب دیں یا رسولَ اللہ! اللہ اور اس کے رسول کا ہم پر بڑا احسان اور فضل ہوا ہے، آپ نے ارشاد فرمایا کیوں نہیں اگر تم چاہو تو جواب دے سکتے ہو اور اس جواب میں تم سچے ہو گے اور میں تمھاری تصدیق کروں گا، تم مجھے یہ جواب دے سکتے ہو کہ آپ ہمارے پاس آئے جبکہ اوروں نے آپ کو جھٹلایا تھا، ہم نے آپ کی رسالت کی تصدیق کی، آپ کو سب نے چھوڑ دیا تھا ہم نے آپ کی مدد کی، آپ اپنے گھر سے نکال دیے گئے تھے ہم نے آپ کو پناہ دی، آپ ضرورت مند تھے ہم نے آپ کی مدد کی۔"

اے گروہ انصار!

دنیا کی ایک حقیر شے کے لیے تم مجھ سے کبیدہ خاطر ہو گئے ہیں میں نے اس مال سے بعض لوگوں کی تالیف قلوب کرنا چاہی تا کہ وہ

مسلمان ہو جائیں اور میں نے تم کو تمہارے اسلام کے سپرد کر دیا۔

اے گروہ انصار!

کیا تم اسے پسند نہیں کرتے کہ اور لوگ اونٹ اور بکریاں لے جائیں اور تم اللہ کے رسول کو اپنے گھر لے جاؤ۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اگر ہجرت نہ ہوئی تو میں بھی انصار کا ایک فرد ہوتا اگر تمام دنیا ایک راستہ جاتی اور انصار دوسری راہ جاتے تو میں انصار کا راستہ اختیار کرتا۔

اے اللہ!

تو انصار پر رحم فرما اور ان کی اولاد پر اپنی رحمت نازل کر اور ان کی اولاد کی اولاد پر اپنی رحمت مبذول کر۔

یہ سن کر تمام لوگ اس قدر روئے کہ ان کی ڈاڑھیاں آنسوؤں سے تر ہو گئیں۔ اور انصار نے عرض کی کہ ہم سب اس بات پر راضی ہیں کہ رسول اللہ ہمارے حصے میں آئے۔ اس کے بعد آپ وہاں سے چلے آئے اور سب لوگ اپنے اپنے گھر چلے گئے۔[1]

احتیاج اور ضرورت کا لحاظ: یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ تقسیم دولت کے سلسلے میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہر ایک کی احتیاج اور ضرورت کا بھی لحاظ رکھتے تھے چنانچہ عوف بن مالک بیان کرتے ہیں کہ "رسول اللہ کے پاس جب فئے کا مال آتا تو آپ اس کو اسی دن تقسیم فرما دیتے تھے اور بیوی والے کو دو حصے دیتے اور مجرد کو ایک حصہ۔ ابن مصفی نے اس قدر زیادہ کہا کہ ہم کو بلایا گیا اور مجھے عمار سے پہلے بلایا گیا اور مجھے دو حصے دیئے کیونکہ

[1] تاریخ طبری عہد رسالت غزوہ ہوازن حنین میں صفحہ ۱۲۸ سنہ ۸ھ کے واقعات بروایت ابو سعید الخدری نیز بخاری پ۱۲ کتاب الجہاد نیز بخاری پ۱۷ کتاب المغازی

میں گھر بار والا تھا، پھر میرے بعد عمار بلائے گئے اور ان کو ایک ہی حصہ ملا[1]
امام بخاری نے تو اپنی صحیح میں ایک باب ہی قائم کیا ہے اور لکھتے ہیں کہ
"اگر چہ آپؐ جس کو دیتے تھے وہ (رشتہ میں آپ سے) دور ہوتا لیکن اس کی احتیاج اور اس کی ضرورتوں کا لحاظ فرماتے تھے"[2]

عہد صدیقی میں دولت کی تقسیم

حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خلافت کے زمانے میں سب سے پہلے بحرین کا مال غنیمت آیا
پھر آپ نے ہر شخص کو جس سے رسول کریمؐ نے وعدہ[3] فرمایا تھا عطا فرمایا پھر باقی مال و دولت کو

فَقَسَمَهَا بَيْنَ النَّاسِ بِالسَّوِيَّةِ عَلَى الصَّغِيرِ وَالْكَبِيرِ وَالْحُرِّ وَالْمَمْلُوكِ وَالذَّكَرِ وَالْأُنْثَى۔

لوگوں میں مساوی، مساوی چھوٹے بڑے آزاد اور غلام مرد اور عورت میں یکساں تقسیم کر دیا۔

اور ہر شخص کو ۷½ درہم ملے۔ دوسرے سال پہلے سال سے بھی زیادہ مال آیا اور آپ نے اس کو بھی تقسیم کر دیا۔ ہر شخص کو بیس درہم ملے، بعض مسلمان آپ کے پاس آئے اور آپ سے کہا کہ اے رسول اللہؐ کے جانشین! آپ نے تقسیم دولت میں تمام لوگوں کو برابر کر دیا حالانکہ بہت سے لوگ فضیلت

---

[1] ابوداؤد پ۱۹ کتاب الخراج والامارۃ۔ [2] بخاری پ۱۳ کتاب الجہاد۔

[3] "حضرت جابر بن عبداللہؓ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ مجھ سے نبی کریمؐ نے فرمایا: اگر بحرین کا مال آگیا تو میں تمھیں اس قدر دوں گا مگر بحرین کا مال آنے نہ پایا تھا کہ آپ نے رحلت فرمائی جب بحرین کا مال آیا تو حضرت ابوبکرؓ نے اعلان کیا کہ جس شخص سے رسول کریمؐ کا کچھ وعدہ ہو یا آپ پر کسی کا کچھ قرض ہو تو وہ میرے پاس آئے چنانچہ میں ان کے پاس گیا اور میں نے کہا کہ نبی کریمؐ نے مجھ سے ایسا ایسا فرمایا تھا تو حضرت ابوبکرؓ نے مجھے دامن بھر کر درہم دے دیے میں نے ان کو گنا تو وہ پانسو تھے۔ حضرت ابوبکرؓ نے کہا کہ اتنے ہی اور لے لو"

(بخاری پ۹ کتاب الکفالۃ نیز بخاری پ۱۲ کتاب الجہاد)

رکھتے ہیں کیونکہ ان کو قدامت حاصل ہے اور ان کے اگلے کارنامے ہیں ایسے لوگوں کو تو ترجیح دینی چاہیے لیکن صدیق اکبرؓ نے کہا کہ تم نے جن اگلے کارناموں اور ان کی فضیلت کا ذکر کیا میں ان سے بخوبی واقف ہوں ان چیزوں کا ثواب تو خدا کے یہاں ملے گا۔

وَھٰذَا مَعَاشٌ فَالْاُسْوَۃُ فِیْہِ خَیْرٌ[۱] معاش کے معاملہ میں مساوات ہی بہتر ہے۔

" ابوبکر صدیقؓ سبقت اسلام کا اعتبار نہ فرماتے تھے سب کے وظائف مساوی قرار دیے تھے ..."

" جب حضرت ابوبکرؓ نے سب کو برابر ٹھیرایا تو حضرت عمرؓ نے ان سے فرمایا کہ آپ کے نزدیک جس نے دو ہجرتیں کیں، دو قبلوں کی طرف نمازیں پڑھیں اور جو تلوار کے خوف سے فتح مکہ کے سال مسلمان ہوا (یہ دونوں) برابر ہیں؟ ابوبکرؓ نے فرمایا کہ ان کے اعمال اللہ کے واسطے ہیں وہی ان کا اجر دے گا دنیا سوار کے لیے دار البلاغ ہے ....[۲]

غرض "حضرت ابوبکرؓ کے پاس جب کبھی مال آتا تو لوگوں میں برابر برابر تقسیم کرتے تھے[۳] اور جب کبھی حضرت ابوبکرؓ سے کہا گیا کہ آپ تقسیم دولت میں لوگوں کے درمیان درجہ بندی کیجئے تو آپ فرماتے کہ

" ان کی بزرگیاں اللہ کے ہاں ہیں اور یہ معاش کا معاملہ ہے اس میں مساوات ہی بہتر ہے[۴]

عہد فاروقی میں دولت کی تقسیم

حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ کی طرح حضرت عمرؓ کی خدمت میں بھی بحرین ہی کا مال سب سے پہلے آیا "حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ میں بحرین سے حضرت عمرؓ کے پاس پہنچا، نماز عشاء کا آخر وقت تھا، ملاقات ہوئی، سلام کیا، پہلے انھوں نے لوگوں کا

۱۔ ابویوسف: کتاب الخراج صفحہ ۴۲ مطبوعہ بولاق مصر

۲۔ ماوردی: احکام السلطانیہ باب۱۸ صفحہ ۱۹۱ دیوان اور اس کے احکام

۳۔ کتاب الاموال صفحہ ۲۶۲ نمبر ۶۴۵ ۔ ۴۔ کتاب الاموال صفحہ ۲۶۳ نمبر ۶۴۶ ۔

حال پوچھا، پھر کہا کیا لائے ہو؟ میں نے کہا پانچ لاکھ، بولے جانتے بھی ہو کیا کہہ رہے ہو؟ میں نے کہا ایک لاکھ اور ایک لاکھ اور ایک لاکھ۔ اسی طرح پانچ مرتبہ کہا۔ بولے تھکے ہوئے ہو، نیند کا خمار ہے، اپنے بال بچوں میں جاؤ اور سو رہو صبح کو آنا۔ ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ صبح ہوتے ہی میں حضرت عمرؓ کے پاس گیا۔ پوچھا کیا لائے ہو؟ میں نے کہا پانچ لاکھ۔ پوچھا کیا پاک ہیں؟ میں نے کہا جی ہاں! اس سے زیادہ میں نہیں جانتا۔ جب وہ مطمئن ہو گئے تو لوگوں سے کہا کہ ہمارے پاس بہت سا مال آیا ہے۔ چاہو تو ہم تمھارے لیے ایک ایک کر کے شمار کر دیں اور چاہو تو تول کے دیں۔ اس پر کسی نے کہا اے امیر المومنین! میں نے عجمیوں کو دیکھا ہے کہ وہ پہلے لکھتے ہیں پھر اسی کے مطابق لوگوں کو دیتے ہیں۔ غرض دیوان معین کیا گیا[1]

دیوان[2] یا معاشرتی کفالت

ملکی باشندوں کے سماجی تحفظ کے لیے آئے دن مختلف حکومتوں کی جانب سے مختلف اسکیمیں پیش ہوتی رہتی ہیں گذشتہ جنگ عظیم دوم کے دوران میں بیوریج اسکیم کا بڑا چرچا رہا لیکن بہت کم عمل کی نوبت آئی۔ دیوان کے تحت ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ وہ بیوریج اسکیم جس کا اس قدر چرچا ہے اس کے اچھے اصول حضرت فاروق اعظمؓ نے اسلامی مملکت میں رائج کیے تھے اس سماجی کفالت میں عربی اور عجمی مسلمان چھوٹے بڑے، آزاد، غلام، مرد، عورت شہری اور دیہاتی غرض سب ہی شریک تھے یہاں تک کہ اس معاشی کفالت میں غیر مسلموں کو بھی نظر انداز نہیں کیا بلکہ ان کی بھی بے دریغ امداد کی جاتی تھی۔

حضرت عمرؓ نے جب شام اور عراق فتح کیے اور ان کا خراج آیا تو انھوں نے رسول اللہؐ کے اصحاب کو جمع کیا اور کہا کہ میری رائے ہے کہ ان سب کے لیے جن لوگوں نے فتح کیا ان کے اہل کے لیے عطائیں مقرر کی جائیں۔ سب نے کہا کہ

---

[1] بلاذری: فتوح البلدان ص۴۵۳ نیز ماوردی: الاحکام السلطانیہ باب۱۸ ص۱۸۹ نیز ابویوسف کتاب الخراج ص۲۶ نیز ابن سعد ج۳ ص۲۱۶ عمرؓ

[2] دیوان (ملٹری سیول لسٹ یا رجسٹر وظائف)

اے امیر المومنین ! ہم سب آپ کی رائے پسند کرتے ہیں، پوچھا تو پھر کس سے ابتدا کی جائے ؟ لوگوں نے کہا خود اپنے سے اور آپ سے زیادہ حق دار کون ہو سکتا ہے ؟ کہا نہیں بلکہ میں رسول اللہؐ کی آل سے پہل کروں گا چنانچہ ام المومنین عائشہؓ کے بارہ ہزار باقی ازواج مطہرات کے لیے دس دس ہزار اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے لیے پانچ ہزار اور بنو ہاشم میں ان سب کے لیے جو بدر میں شریک ہوئے تھے پانچ پانچ ہزار مقرر کیے[1]

"حضرت عمرؓ نے دیوان کے بارے میں مسلمانوں سے مشورہ کیا تھا حضرت علیؓ نے کہا کہ ہر سال جتنا مال جمع ہو تقسیم کر دیا جائے، حضرت عثمانؓ نے کہا: میں دیکھتا ہوں کہ مال بہت زیادہ ہے جو ممکن ہے کہ تقسیم کرنے کے بعد بھی بچ رہے، یہ جاننے کے لیے کہ کس نے لیا اور کس سے نہیں لیا، شمار کرنا اور حساب رکھنا ضروری ہے ورنہ پراگندگی اور بدنظمی پیدا ہو جانے کا مجھے اندیشہ ہے، ولید بن ہشام بن مغیرہ نے کہا، میں شام گیا ہوں اور میں نے دیکھا ہے کہ وہاں کے بادشاہ (ملوک) دیوان معین کرتے اور فوج بھرتی کیا کرتے ہیں، غرض حضرت عمرؓ نے حکم دیا اور دیوان معین کیا گیا اور فوج بھرتی کی گئی، (اور دیوان مرتب کرنے کے لیے) عقیل بن ابی طالب، مخرمہ بن نوفل اور جبیر بن مطعم کو بلایا — یہ لوگ قریش میں نسب دان تھے — اور کہا درجہ بندی میں لوگوں کے مرتبوں کا لحاظ رکھو، چنانچہ انھوں نے بنو ہاشم سے پہل کی، پھر حضرت ابوبکرؓ اور ان کے گھرانے کو لیا، پھر بلحاظ خلافت حضرت عمرؓ اور ان کے گھرانے کو، حضرت عمرؓ نے اس کو دیکھ کر کہا کہ جی تو یہی چاہتا ہے کہ مجھے رسول اللہؐ سے ایسا ہی قرب ہوتا لیکن تم نبی کریمؐ کے قرابت داروں سے پہل کرو پہلے ان کو لو جو قریب تر ہیں پھر ان کو جو قریب ہیں اور عمرؓ کو وہیں رکھو جہاں اللہ نے اس کو رکھا ہے[2]

---

[1] کتاب الاموال صفحہ ۲۲۴ نمبر ۵۴۹ نیز کتاب الخراج صفحہ ۲۵ نیز فتوح البلدان صفحہ ۴۴۹

[2] فتوح البلدان صفحہ ۴۴۹ و صفحہ ۴۵۰ حضرت عمرؓ کی خلافت میں عطا کی ابتدا اور اس کا انتظام، تاریخ طبری صفحہ ۲۷۵۰ نیز ابن سعد ج ۳ ص ۲۱۲ عمرؓ

"اس پر حضرت عباس بن عبدالمطلبؓ نے ان کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ تم نے صلہ رحم کا لحاظ کیا اس بات نے تمھیں ان سے قریب تر کر دیا۔"[1]

"قبیلہ عدی کے لوگ حضرت عمرؓ کے پاس آئے اور کہا کہ تم رسول اللہؐ کے خلیفہ اور ابوبکرؓ کے جانشین ہو جو رسول اللہؐ کے خلیفہ تھے پھر تم خود وہاں کیوں نہیں رہتے جہاں ان لوگوں نے تمھیں رکھا تھا؟ بولے: شاباش! بنو عدی تم چاہتے ہو کہ میری پشت پناہی پر کھاؤ اور میں تمھارے لیے حسن سلوک قربان کر دوں۔ خدا کی قسم! یہ نہیں ہو سکتا جب تک تمھاری باری نہ آئے تمھارا نام نہیں لکھا جائے گا خواہ دیوان تم ہی پر ختم ہو یعنی چاہے تمھارا نام سب کے آخر ہی لکھا جائے۔ میرے دونوں دوست اسی طریق پر چلتے رہے اگر میں ان کے خلاف کروں تو میرے خلاف کیا جائے گا، خدا کی قسم! ہمیں دنیا میں جو برتری اور بزرگی نصیب ہوئی ہے اور ہم اپنے عمل پر ثواب کی جو کچھ امید رکھتے ہیں وہ صرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے۔ وہی ہمارا شرف ہے پھر وہ ہیں جو آپ سے قریب تر اور قریب ہیں۔ بخدا! اگر عجمی عمل لے کر جائیں اور ہم بے عمل جائیں تو قیامت کے دن محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے قرب کے مستحق ہم سے زیادہ وہ ہوں گے پس جو کوئی عمل میں آپ کی پیروی کرنے سے قاصر رہا نسب اس کو آپ تک نہیں پہنچا سکے گا۔"[2]

غرض تدوین دیوان کے باب میں تمام صحابہ کرامؓ حضرت عمرؓ کی رائے سے متفق ہو گئے، یہ محرم سنہ ۲۰ھ کا واقعہ ہے۔ بنو ہاشم سے ابتداء کی پھر ان کے نام لکھے جو رسول کریمؐ سے قریب تر تھے پھر ان کے جو قریب تھے اور جو قرابت میں مساوی تھے ان میں ان کو پہلے رکھا جو سابق الاسلام تھے یہاں تک کہ انصار کی باری آئی، پوچھا کہ کس سے ابتداء کی جائے

---

[1] - فتوح البلدان صفحہ ۴۴۹ حضرت عمرؓ کی خلافت میں عطا کی ابتداء اور اس کا انتظام۔

[2] - فتوح البلدان صفحہ ۴۵۰ بروایت محمد بن سعد بحوالہ واقدی، ابو یعلی: احکام السلطانیہ صفحہ ۲۲۱ نیز ماوردی: احکام السلطانیہ باب ۱۸ صفحہ ۱۹۹ طبری ص ۲۷۵۱ نیز ابن سعد ج ۳ صفحہ ۲۱۲ عمرؓ

بولے قبیلۂ اوس میں سعد بن معاذ الاشہلیؓ کے گھرانے سے، پھر ان کے نام لکھے جائیں جو سعدؓ سے قریب تر ہیں پھر ان کے جو قریب ہیں[1]۔

حضرت عمرؓ نے جو مردم شماری کرائی تھی اس پر جرمن مستشرق فان کریمر نے بڑے اچھے پیرائے میں تبصرہ کیا ہے لکھتا ہے "ان حقیقتوں پر غور کرتے ہوئے ہم اس بات کے اقرار کرنے میں کچھ بھی پس و پیش نہ کریں گے کہ اس معاملہ میں ہم تاریخ کے ایک نہایت ہی بے نظیر واقعہ سے دو چار ہوتے ہیں۔ یوں تو عام مردم شماری قدیم ایشائی سلطنتوں میں بھی کی جاتی اور سلطنت روما میں بھی کی جاتی تھی لیکن اس کا مقصد جو پیش نظر تھا وہ یہ تھا کہ محصول کے بوجھ کو زیادہ سے زیادہ ایسا بھاری بنایا جائے کہ وصول کنندہ محصول کے آہنی پنجہ سے بچنے کا کوئی بھی موقع نہ رہے حضرت عمرؓ نے بھی مردم شماری کا نفاذ کیا لیکن سراسر ایک دوسرے جذبے کے تحت اس کا مقصد یہ تھا کہ جو کوئی اسلام کا کلمہ پڑھتا اس کو حکومت کی آمدنی میں سے اس کا واجبی حق دیا جائے اور اس زمانے کے مسلمہ تصور کے مطابق وہ اس میں یقینی طور پر اپنا حق رکھتے تھے[2]۔

ابوسفیان بن حرب کی تنقید:- "جب حضرت عمرؓ نے دیوان معین کیا تو ابوسفیان بن حرب نے کہا کیا یہ دیوان ویسا ہی ہے جیسا کہ بنو اصفر (یونانیوں) کا؟ اگر آپ نے لوگوں کے لیے عطا مقرر کی تو وہ دیوان پر بھروسہ کر کے تجارت چھوڑ بیٹھیں گے بولے کہ یہ اس وجہ سے ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کافروں سے جو مال بغیر جنگ کیے دلواتا ہے اس کی مقدار بہت ہو گئی ہے[3]۔

تقسیم دولت میں ترجیحی حقوق:-	حضرت عمرؓ کے زمانے میں جب فتوحات کو وسعت ہوئی تو انھوں نے ترجیحی حقوق قائم کیے اور عطا میں فرق مراتب رکھا

[1] - فتوح البلدان صفحہ ۴۹، طبقات ابن سعد ج ۳ ص ۲۱۳ عمرؓ

[2] - فان کریمر: اورینٹ انڈر دی کیلیفس، انگریزی ترجمہ از خدا بخش صفحہ ۸۰

[3] - فتوح البلدان صفحہ ۴۵۰۔ یونانیوں رومیوں کو عرب بنو الاصفر کہتے تھے یعنی زرد فام جیسا کہ آج کل جاپانیوں کو زرد فام (Yellow People) کہا جاتا ہے۔ اسی طرح عرب ایرانیوں کو بنو الاحمر یعنی سرخ فام کہتے تھے۔ تفصیل ابو یوسف: کتاب الخراج صفحہ ۲۴۔

جنگ بدر میں شریک ہونے والوں کا پانچ پانچ ہزار سالانہ مقرر تھا حضرت عمرؓ نے اپنی (خلافت کے زمانے میں) فرمایا کہ ہم بدریوں سے وظیفہ میں کسی کو ترجیح نہیں دیں گے[1]

"حضرت عمرؓ نے اہل دیوان کے لیے عطائیں مقرر کیں اور ان کو ترجیح دی جو سابق الاسلام تھے اور غزوات میں شریک ہوئے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ تقسیم غنائم میں سب کو برابر رکھتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے خلاف کیا تو لوگوں نے ان سے کہا، انھوں نے کہا کہ میں رسول اللہؐ سے جنگ کرنے والوں کو ان کے برابر قرار نہیں دے سکتا جنھوں نے آپ کے ساتھ ہو کر جنگ کی، اس بنا پر انھوں نے مہاجرین و انصار میں سے شرکاء بدر سے ابتدا کی اور ہر ایک کے لیے پانچ پانچ ہزار اور ان کی اولاد کے لیے دو دو ہزار سالیانہ مقرر کیا۔ اس میں ان کے حلیف اور آزاد کردہ غلام ان کے ساتھ برابر کے شریک تھے۔ مہاجرین حبشہ میں شرکائے اُحد کے لیے اور ان کے لیے جو اسلام لانے میں اہل بدر کے برابر تھے چار چار ہزار مقرر کیے"

"حسن و حسین رضی اللہ عنہما کے لیے رسول اللہؐ سے قرابت کی بنا پر اتنا ہی مقرر کیا جتنا ان کے والد حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے لیے مقرر کیا یعنی دونوں کے لیے پانچ پانچ ہزار اور عباس بن عبدالمطلبؓ کے لیے رسول اللہؐ سے ان کی قرابت کی بنا پر پانچ ہزار مقرر کیے بعض کہتے ہیں کہ ان کے لیے سات ہزار لکھے لیکن تمام لوگ یہی کہتے ہیں کہ رسول کریمؐ کی ازواج مطہرات کے سوا جن کے لیے بارہ بارہ ہزار درہم مقرر کیے اور انھیں کے ساتھ حضرت جویریہ بنت حارث اور صفیہ بنت حیی بن اخطب کو بھی شامل کیا، اہل بدر پر کسی کو ترجیح نہیں دی، فتح مکہ سے پہلے جن لوگوں نے ہجرت کی ان میں سے ہر ایک کے لیے تین تین ہزار درہم اور فتح مکہ کے دن جو لوگ اسلام لائے ان کے لیے دو دو ہزار درہم مقرر کیے اور ان ہی کے برابر مہاجرین کے چھوٹے چھوٹے بچوں کی عطاء مقرر کی"[2]

خاص خصوصیات اور خدمات کے صلہ میں بھی حضرت عمرؓ بعض کو بعض پر

ص ۴۵۱

[1] - بخاری ج ۲ کتاب المغازی النبی، تاریخ طبری صفحہ ۲۴۱۲ جلد ۵ [2] بلاذری، فتوح البلدان طبری صفحہ ۲۴۱۳

ترجیح دیتے تھے چنانچہ "آپ نے عمرو بن العاصؓ کے دوسو دینار مقرر کیے کیونکہ وہ امیر لشکر تھے، عمر بن وھب الجمحیؓ کو دوسو دیے اس لیے کہ وہ نرغہ میں ثابت قدم رہے تھے۔ بسر بن ابی ارطاۃؓ کو دوسو دیے کہ وہ صاحب فتح تھے اور کہا کہ اللہ نے ان کے ہاتھ پر کئی فتوحات عطا کیں۔ ابو عبیدہ نے کہا کہ ان اعداد سے دینار مراد ہیں[1] "حضرت عمرؓ نے عمرو بن العاص کو لکھا کہ بیعت رضوان کے شرکا کی عطاء، دو دوسو مقرر کر دو، یعنے دو سو[2] دینار اور خود اپنے لیے بھی اسی وجہ سے کہ تم امیر ہو اسی درجہ میں رکھو اور خارجہ بن حذافہ کے لیے ان کی شجاعت کے لحاظ سے بڑے درجہ کی عطا مقرر کرو[3]

"اس کے بعد عام لوگوں کی باری آئی اور ان کے لیے ان کے مراتب اور ان کی قرأت قرآن اور ان کے جہاد کے لحاظ سے عطا مقرر کی اور باقی لوگوں کو ایک درجہ میں رکھا جو مسلمان مدینہ منورہ آیا اس کے لیے ۲۵ دینار مقرر کیے۔ یمن والوں کے لیے اور قبیلہ قیس میں جو لوگ شام اور عراق میں تھے ان میں سے ہر ایک کے لیے دو ہزار[۲] سے ایک ہزار اور نو سو[۹] اور پانچسو[۵] اور تین[۳] سو کی عطائیں مقرر کیں اور تین سو[۳] سے کم کسی کو نہیں دیا۔ اور کہا اگر مال زیادہ ہوتا تو میں ہر شخص کو اس کے سفر کے لیے چار ہزار[۴]، اس کے ہتھیاروں کے لیے ایک ہزار اس کی سواری اور اس کی نعلبندی کے لیے ایک ہزار دیتا[3]

عربوں اور موالیوں کو مساوی عطائیں۔

آزاد عربوں اور ان کے موالیوں کو مساوی عطائیں عطا کی گئیں تھیں۔ "حضرت عمرؓ عرب مہاجرین اور ان کے موالیوں کو جو بدر میں شریک ہوئے پانچ پانچ ہزار اور انصار اور ان کے موالی جو جنگ بدر میں شریک ہوئے چار چار ہزار مقرر فرمائے[4] "حضرت عمرؓ کے عامل کے پاس ایک جماعت آئی۔ عامل نے ان میں سے عربوں کو

۱ - فتوح البلدان صفحہ ۴۵۶ - ۲ - فتوح البلدان صفحہ ۴۵۶، ۴۵۷ - ابن سعد ج ۳ صفحہ ۲۱۷
۳ - بلاذری: فتوح البلدان صفحہ ۴۵۱ -
۴ - کتاب الاموال صفحہ ۲۲۵ نمبر ۵۶۹ - ابن سعد ج ۳ ص ۲۱۹

دیا مگر موالی کو کچھ نہ دیا حضرت عمرؓ کو معلوم ہوا تو اسی وقت عامل کو لکھا کہ کسی شخص کے لیے اپنے مسلمان بھائی کو حقیر سمجھنا نہایت نازیبا بات ہے[1] تم نے ان کے درمیان مساوات کیوں نہ برتی ؟[1]

اسامہ بن زید کو اپنے بڑے بیٹے پر ترجیح

"حضرت عمرؓ نے اُسامہ بن زیدؓ کو اپنے بیٹے عبداللہ بن عمرؓ پر ترجیح دی ۔ اس پر لوگوں نے عبداللہ بن عمرؓ سے بہت کچھ کہا آخر وہ حضرت عمرؓ کے پاس گئے اور ان سے کہا کیا آپ ایسے شخص کو مجھ پر ترجیح دیتے ہیں جو کسی طرح مجھ سے بڑھ کر نہیں ہے ؟ آپ نے اس کے لیے دو ہزار[2] مقرر کیے اور میرے لیے ایک ہزار پانسو حالانکہ کسی چیز میں بھی وہ مجھ سے بہتر نہیں ۔ حضرت عمرؓ نے کہا یہ میں نے اس لیے کیا ہے کہ زید بن حارثہ کو رسول اللہؐ ، عمرؓ سے زیادہ چاہتے تھے اور اُسامہ کو عمرؓ کے بیٹے عبداللہ سے زیادہ محبوب رکھتے تھے[2] ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ "حضرت عمرؓ نے مہاجرین اولین کا چار چار ہزار درہم وظیفہ مقرر کیا تھا اور عبداللہ ابن عمرؓ کے لیے ساڑھے تین ہزار تو ان سے کسی نے کہا کہ ابن عمرؓ بھی مہاجرین میں ہیں پھر آپ نے اُنہیں چار ہزار سے کم کیوں دیا ؟ حضرت عمرؓ نے کہا کہ انھوں نے تو اپنے ماں باپ کے ساتھ ہجرت کی تھی مطلب یہ کہ وہ ان لوگوں کے مثل نہیں جنھوں نے خود ہجرت کی ہے[3]

عجمیوں کو عطائیں

"حضرت عمرؓ نے قلعداروں (امراء اجناد) کو لکھا کہ حمراء (سرخ فام یعنی عجم اور روم) میں سے جن کو تم نے آزاد کر دیا ہو اگر وہ اسلام لائیں تو ان کے لیے موالی کے برابر عطا مقرر کرو ان کے وہی حقوق ہوں جو موالی کے ہیں اور وہی فرائض ہوں جو موالی پر ہیں[4]

---

[1] ۔ کتاب الاموال صفحہ ۲۴۶ نمبر ۲۲ ۵ نیز فتوح البلدان صفحہ ۴۵۰
[2] ۔ کتاب الاموال صفحہ ۲۳۶ نمبر ۲۳ ۵
[3] ۔ کتاب الاموال صفحہ ۲۲۶ نمبر ۶ ۵ نیز فتوح البلدان صفحہ ۴۵۶ و ابن سعد ج ۳ ص ۲۱۴
[4] ۔ بخاری پ ۱۵ ہجرت

اگر وہ کسی قبیلہ میں داخل ہونا چاہیں تو انھیں نہ روکو اور عطائیں برابر رکھو[1]"

"حضرت عمرؓ نے سلمان فارسی کی عطا چار ہزار درہم مقرر کی تھی[2] اسی طرح حضرت عمرؓ نے "عمار بن یاسر کی عطا چھ ہزار درہم مقرر کی[3]"

"حضرت عمرؓ نے نہر الملک کے دہقان (تعلقدار) اور نخیر خاں کے بیٹے اور الفلالیج کے دہقان بصبہری کے بیٹوں خالد اور جمیل کے لیے اور بابل وخطرنیہ کے دہقان بسطان بن نرسی کے لیے اور العال کے دہقان رفیل کے لیے اور ہرمزان کے لیے اور جفینۃ العبادی کے لیے ایک ایک ہزار مقرر کیے۔ بعض کہتے ہیں کہ ہرمزان کو ان پر ترجیح دی اور اس کے دو ہزار مقرر کیے[4] اس کے سوا بھی "عطا پانے والوں میں پانچ عجمی تھے جن میں سے دو تمیم الداریؓ اور بلالؓ ہیں[5]"

عورتوں کو عطائیں

"حضرت عمرؓ نے اُمہات المومنین کے لیے بارہ بارہ ہزار مقرر کیے[6]"

"حضرت عمرؓ نے مہاجرات اول کے لیے ایک ایک ہزار مقرر کیے انھیں میں اسماء بنت عمیسؓ اور اسماء بنت ابی بکرؓ اور ام عبد یعنی عبداللہ بن مسعودؓ کی والدہ بھی تھیں[7]"

"ہشام الکعبی کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عمرؓ کو دیکھا کہ وہ خود خزانہ کا دفتر لیے ہوئے، قدید پہنچتے، عورت مرد سب ان کے پاس جمع ہو جاتے، نہ کوئی باکرہ ایسی نہ ہوتی جو ان کے پاس حاضر نہ ہو اور نہ ثیبہ سب کو ان کی عطا دست بدست دیتے پھر عسفان جاتے اور وہاں بھی یہی کرتے، ان کا

۱۔ کتاب الاموال صفحہ ۲۳۵ نمبر ۵۷۰ نیز فتوح البلدان صفحہ ۴۵۸۔
۲۔ کتاب الاموال صفحہ ۲۳۶ نمبر ۵۷۶ نیز فتوح البلدان صفحہ ۴۵۷۔
۳۔ کتاب الاموال صفحہ ۲۳۶ نمبر ۵۷۵ نیز فتوح البلدان صفحہ ۴۵۷۔
۴۔ فتوح البلدان صفحہ ۴۵۸۔ ۵۔ فتوح البلدان صفحہ ۴۵۵۔
۶۔ کتاب الاموال صفحہ ۲۴۱ نمبر ۵۹۷۔ ۷۔ کتاب الاموال صفحہ ۲۴۱ نمبر ۵۹۸، نیز ابن سعد ج ۳ صفحہ ۲۱۶۔

یہی دستور رہا تھا کہ اللہ سے جا ملے۔[۱]

بچوں کے لیے عطائیں

فاروق اعظمؓ نے جو "معاشرتی بیمہ" رائج کیا تھا تو اس "سماجی تحفظ" میں بچے بھی شریک تھے اور بچوں کے پیدا ہوتے ہی تنخواہ مقرر ہو جاتی اور مرتے دم تک جاری رہتی تھی و پہلے پہل "حضرت عمرؓ نومولود کے لیے جب تک وہ شیر خوار رہے عطا مقرر نہیں کرتے تھے، لوگ دودھ چھڑانے میں جلدی کرنے لگے جب یہ بات معلوم ہوئی تو منادی کرا دی کہ اپنے بچوں کا دودھ چھڑانے میں جلدی نہ کرو۔ ہم ہر بچہ کے لیے جو آغوش اسلام میں پیدا ہو یوم ولادت سے عطا مقرر کرتے ہیں اور اس کی بابت تمام مملکت میں لکھ بھیجا۔"[۲]

"حضرت عمرؓ نے نوزائیدہ بچوں کے لیے سو درہم مقرر کیے۔ جوں جوں وہ بڑے ہوتے جاتے عطا میں اضافہ کرتے تھے یہاں تک کہ عطا دو سو تک پہنچ جاتی اور بالغ ہونے پر اور اضافہ کرتے۔ جب کوئی بچہ جس کا باپ نہ ہوتا اور گزرگاہ پر ڈال دیا جاتا ان کے پاس لایا جاتا تو وہ اس کے لیے سو درہم مقرر کرتے اور اس کی خوراک اور دوسرے مصارف کے لیے جتنے مال کی ضرورت ہوتی مقرر کرتے اس کا ولی مہینے کے مہینے اس کا ماہانہ آکر لے جاتا خود امیرالمومنین سال کے سال اس کو جا کر دیکھتے اس کے حق میں حسن سلوک کی ہدایت کرتے

۱۔ فتوح البلدان صفحہ ۴۵۲۔ ابن سعد ج ۳ ص ۲۱۴ نیز طبری صفحہ ۲۷۵۲۔

۲۔ کتاب الاموال صفحہ ۲۳۷ نمبر ۵۸۱ نیز فتوح البلدان صفحہ ۴۵۹ نیز ابن سعد ج ۳ ص ۲۱۷

"حضرت عمرؓ ابتدا میں نومولود کا دودھ چھڑانے سے پہلے کچھ مقرر نہ کرتے تھے ایک مرتبہ رات کے وقت ایک عورت کو سنا کہ اپنے بچہ کو دودھ چھوڑنے پر مجبور کر رہی ہے اور بچہ رو رہا ہے آپ نے دریافت کیا تو عورت نے کہا کہ عمرؓ بچہ کا دودھ چھڑانے سے پہلے وظیفہ مقرر نہیں کرتے اس لئے میں زبردستی اس سے دودھ چھڑا رہی ہوں۔ آپ نے فرمایا افسوس! عمر نے گناہوں کی کتنی گٹھریاں باندھ لیں اور اسے خبر تک نہ ہوئی اس کے بعد آپ نے اعلان کرا دیا کہ کوئی اپنی اولاد کا دودھ چھڑانے میں جلدی نہ کرے ہم ہر ایک اسلامی نومولود کا وظیفہ مقرر کرتے ہیں۔" (الاحکام السلطانیہ ماوردی باب ۱۸ ص ۱۹۲

نیز طبقات ابن سعد ج ۳ صفحہ ۲۱۷۔

اور بیت المال سے اس کی شیرخواری اور پرورش کے اخراجات دیئے[۱]

جنگ قادسیہ میں جو شریک ہوئے ان کا کوئی بچہ ایسا نہ رہا جو وظیفہ نہ پاتا ہو "خالد بن عرفطہ العذری حضرت عمرؓ کے پاس آئے، پوچھا جنھیں تم چھوڑ آئے ہو ان کا کیا حال ہے؟ کہا میں نے اس حال میں چھوڑا ہے کہ وہ اللہ سے دعائیں کرتے ہیں کہ وہ ان کی عمریں آپ کی عمر میں جوڑ دے، قادسیہ کو روندنے والوں میں سے ایک بھی ایسا نہیں جسے دو ہزار یا ڈیڑھ ہزار عطا نہ ملتی ہو نہ بچوں میں —— چاہے لڑکا ہو یا لڑکی —— کوئی بچہ ایسا ہے جو سو درہم اور دو جریب ماہانہ نہ پاتا ہو، بولے یہ ان کا حق ہے جسے میں ان تک پہنچا کر سعادت پاتا ہوں اگر یہ مال خطاب (حضرت عمرؓ کے والد) کا ہوتا تو میں انھیں نہ دیتا، میں جانتا ہوں کہ عطا ان کی ضرورتوں سے زیادہ ہے، اگر ان میں سے ہر شخص جب اس کو عطا ملے وہ اس میں سے ایک بکری خرید لیا کرے تو اس سے اس کے سواد میں اضافہ ہوگا اور اس کے بعد اس کی اولاد خالی ہاتھ نہ ہوگی، اس مال میں سے کچھ نہ کچھ اس کے پاس باقی ہوگا، میں نہیں جانتا کہ میرے بعد کیا ہوگا؟ میں ان سب کو جن کے امور کا اللہ نے مجھے نگہبان بنایا ہے نصیحت کرتا ہوں کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا ہے کہ جو اس حال میں فوت ہوا کہ اس نے اپنی رعیت کے ساتھ خیانت کی تو اسے جنت کی بو تک سونگھنی نصیب نہ ہوگی[۲]

یہاں یہ بات باعث دلچسپی ہے کہ اکثر ملکوں میں "سماجی بیمہ" اب عام ہو رہا ہے، حضرت فاروق اعظمؓ نے بچہ پیدا ہوتے ہی جس طرح وظیفہ مقرر کرنا شروع کیا تھا اس کی ہلکی سی نقل فرانس، برطانیہ اور امریکہ میں اب ہو رہی ہے، مالیات عامہ کے باب میں بیمہ، انشورنس کی مزید تفصیل کی گئی ہے۔

دیہاتیوں کے لیے عطائیں	دیہاتیوں کے لیے بھی عطائیں معین کی گئی تھیں

[۱] - بلاذری: فتوح البلدان صفحہ ۴۵۴، طبقات ابن سعد ج ۳ صفحہ ۲۱۴ [۲] - بلاذری: فتوح البلدان صفحہ ۴۵۳، طبقات ابن سعد ج ۳ صفحہ ۲۱۵ -

"حضرت عمرؓ نے عوالی کے عمال کو حکم دیا کہ اہل العوالی کے نام لکھ بھیجیں۔ انھوں نے نام لکھ بھیجے حضرت عمرؓ نے ان سب کے لیے روزینے جاری کر دیے پھر حضرت عثمانؓ نے قوت بسری میں اضافہ کیا اور لباس کسوۃ کے لیے بھی کچھ مقرر کیا۔"[1]

حضرت عمرؓ نے تو عملی تجربہ کر کے دیکھا تھا کہ ہر شخص روزانہ کتنی غذا کھا سکتا ہے پھر اتنی ہی ماہانہ غذا کی مقدار مقرر کر دی چنانچہ "آپ نے ایک جریب غلہ منگوانے کا حکم دیا، اسے گندھوایا، روٹیاں پکوائیں، ان پر تھوڑا سا زیتون لگایا پھر تیس[I] آدمی بلوائے اور انھیں وہ روٹیاں صبح میں کھلائیں یہاں تک کہ وہ شکم سیر ہو گئے پھر رات میں بھی یہی کیا اور کہا ایک آدمی کے لیے دو جریب مہینہ بھر کے لیے کافی ہو سکتے ہیں چنانچہ آپ نے ہر ایک مرد، عورت اور مملوک کے لیے دو دو جریب ماہانہ مقرر کر دیئے۔"[2] "قیس بن رافع کہتے ہیں کہ میں نے سفیان بن وھب کو یہ کہتے سنا کہ حضرت عمرؓ نے ایک ہاتھ میں مد اور ایک ہاتھ میں قسط لے کر کہا کہ میں نے ہر مسلمان کے لیے ماہانہ دو مد گیہوں اور دو قسط سرکہ اور دو قسط زیتون مقرر کیا ہے۔ کسی نے کہا اور غلاموں کے لیے بھی؟ بولے ہاں! غلاموں کے لیے بھی۔"[3]

اسلامی حکومت نے اپنی رعایا کی غذا کی جو ذمہ داری لی تھی اس کا اعلان آپ نے باقاعدہ طور پر منبر سے کیا تھا چنانچہ "عبداللہ بن قیس کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے منبر پر جا کر اللہ کی حمد و ثنا کی پھر کہا: ہم نے تمہارے لیے ماہوار عطاء اور آذوقہ جاری کیا ہے اور آپ کے ہاتھ میں مد اور قسط تھا۔ راوی کا بیان ہے کہ

[1] فتوح البلدان صفحہ ۴۵۲۔

[I] چاند کی گردش کے لحاظ سے قمری مہینہ عموماً ۳۰ دن کا ہوتا ہے تو تیس آدمی ایک دن میں جتنا کھا سکتے ہیں ایک آدمی تیس دن میں اندازاً اسی مقدار میں کھائے گا۔

[2] کتاب الاموال صفحہ ۲۴۷ نمبر ۶۰۸ نیز فتوح البلدان صفحہ ۴۶۰۔ نیز احکام السلطانیہ ماوردی باب ۱۸ صفحہ ۱۹۲ و احکام السلطانیہ ابو یعلی طبقات ابن سعد ج ۳ صفحہ ۲۲۰ عمرؓ۔

[3] کتاب الاموال صفحہ ۲۴۷ نمبر ۶۰۹ نیز فتوح البلدان صفحہ ۴۶۰

پھر آپ نے دونوں کو حرکت دی اور کہا کہ جو کوئی ان میں کمی کرے اللہ بھی اس کے ساتھ ایسا کرے اور اس کو بد دعا دی[1] غرض شہریوں اور دیہاتیوں کے رزق کی کفالت کی گئی تھی۔

غیر مسلموں کے لیے عطائیں یہاں یہ بات بھی بھولنے کی نہیں کہ حضرت عمرؓ نے غیر مسلموں کو بھی نظر انداز نہیں کیا بیت المال سے ان کی بھی بے دریغ امداد کی جاتی تھی اور ان کا بھی سماجی تحفظ کیا گیا تھا "مالیات عالیہ" کے باب میں اس کی پوری تفصیل کی گئی ہے۔

دیوان کی امتیازی خصوصیت اوپر ابوسفیان بن حربؓ کی تنقید پیش کی گئی ہے انھوں نے کہا تھا کہ کیا یہ دیوان ویسا ہی ہے جیسا کہ یونانیوں کا؟ حضرت عمرؓ کے دیوان کو یونانیوں کے دیوان پر جو امتیاز تھا اس کو ایک عیسائی مورخ جرجی زیدان کی زبانی سُن لیجیے وہ لکھتا ہے کہ

> "یونانیوں کی یہ خصوصیت صرف شہر ایتھنز یا دوسرے مرکزی شہروں تک محدود تھی لیکن مسلمانوں نے اس میں ایسی وسعت پیدا کی کہ اسے ہر شہر اور طبقہ تک عام کر دیا"[2]

عہد عثمانی اور عہد حیدری میں دولت کی تقسیم حضرت عمرؓ نے دیوان کے ذریعے جو سماجی تحفظ کیا تھا وہ عہد خلافت راشدہ اور بعد کے زمانے میں بھی جاری رہا۔

حضرت عمرؓ کے بعد بچوں کو عطا دینے کا طریقہ بھی مدتوں جاری رہا" ابو اسحاق کہتے ہیں کہ ان کے دادا خیار حضرت عثمانؓ کے پاس گئے، پوچھا بڑے میاں! تمھارے بال بچے کتنے ہیں؟ کہا اتنے، بولے ہم تمھارے اور تمھارے اہل و عیال کے لیے سو، سو درہم مقرر کرتے ہیں[3]"

---

[1] کتاب الاموال صفحہ ۲۴۷ نمبر ۶۱۰ نیز فتوح البلدان صفحہ ۴۴۰۔ [2] تاریخ تمدن اسلامی ج ۱ صفحہ ۹۶
[3] کتاب الاموال صفحہ ۲۳۸ نمبر ۵۸۳ نیز فتوح البلدان صفحہ ۴۵۹۔

اسی طرح سفیان ثوری، ابو الجحاف سے روایت کرتے ہیں کہ "قبیلۂ خثعم میں سے کسی نے مجھ سے کہا کہ میرے ہاں بچہ پیدا ہوا، میں اس کو حضرت علیؓ کے پاس لے گیا اور انھوں نے اس کے سو درہم مقرر فرما دیئے[1]"

"امام حسینؓ سے پوچھا گیا کہ بچے کا حصہ کب سے مقرر کیا جائے؟ بولے جب سے وہ رونے لگے[2] (مراد پیدا ہوتے ہی)

"مروان بن شجاع الجزری نے بیان کیا کہ جب میرا دودھ چھڑایا گیا تو عمر بن عبد العزیزؒ نے میرے لیے دس دینار مقرر کیے[3]"

غرض رسول کریمؐ اور خلفائے راشدین کے زمانے میں عام طور سے تقسیم دولت کے وقت مساوات کا طریقہ رائج تھا، رسول کریمؐ تقسیم دولت میں اسی بات کا پورا خیال رکھتے تھے کبھی اپنے اختیار سے بعض کو نظر انداز کر کے بعض کو ان کی غربت وغیرہ کے لحاظ سے زیادہ مال عطا فرما دیتے کبھی تالیف قلوب اور دیگر مصلحتوں کی بناء پر بعض کو بعض پر آپ ترجیح دیتے لیکن اکثر ضروریات اور احتیاجات کا پورا لحاظ فرمایا کرتے تھے۔

حضرت صدیق اکبرؓ دولت کو برابر تقسیم کرتے اور تقسیم دولت میں چھوٹے بڑے، آزاد غلام مرد اور عورت کے درمیان مساوات برتتے تھے آپ نے جو عطائیں تقسیم کیں ان کی مقدار تھوڑی ہی تھی اور ہر ایک کو گو چند ہی درہم ملے تاہم اس سے آپ کا تقسیم دولت میں جو اصول تھا وہ واضح ہے، آپ کی رائے یہ تھی کہ معاش کے معاملے میں مساوات ہی بہتر ہے۔

حضرت عمر فاروقؓ کے زمانے میں فتوحات کو وسعت ہوئی اور بہت سا مال آیا تو آپ نے تقسیم دولت میں ابتداءً ترجیحی حقوق قائم کیے اور یہ آپ کا اجتہاد تھا۔

"حضرت صدیق اکبرؓ سبقت اسلام کا اعتبار نہ فرماتے تھے، سب کے

۱؎ کتاب الاموال صفحہ ۲۳۸ نمبر ۵۸۲ نیز فتوح البلدان صفحہ ۴۵۹ ۲؎ کتاب الاموال صفحہ ۲۳۷ نمبر ۵۸۰ ۳؎ کتاب الاموال صفحہ ۲۸۳ نمبر ۵۸۶ نیز فتوح البلدان ۴۵۹۔

وظائف مساوی قرار دیتے تھے حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے بھی اپنی خلافت میں ایسا ہی کیا امام شافعیؒ اور امام مالکؒ کا اسی پر عمل ہے، اور حضرت عثمانؓ، حضرت عمرؓ کی رائے پر عامل تھے چنانچہ امام ابو حنیفہؒ اور عراق کے دوسرے فقہاء نے اس کو اختیار کیا ہے۔[1]

اسلامی ماخذوں کا تفصیلی مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مال غنیمت اور مال فئے میں حضرت عمرؓ بھی مساوات ہی کا لحاظ کرتے تھے[2] البتہ دیوان میں فرق مراتب رکھا تھا۔

پھر جب اسلامی بیت المال کی آمدنی کافی بڑھی اور عراق اور مصر کے زرخیز علاقوں کی مالگذاری وصول ہونے لگی اور رسول اللہؐ کی یہ بشارت پوری ہو گئی کہ "جب کسریٰ ہلاک ہو جائے گا تو اس کے بعد کوئی کسریٰ نہ ہو گا اور جب قیصر ہلاک ہو جائے گا تو پھر کوئی قیصر نہ ہو گا۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ تم لوگ قیصر و کسریٰ کے خزانے اللہ کی راہ میں خرچ کرو گے"[3] تو حضرت عمرؓ نے بھی آخر زمانہ میں ایسی رائے اختیار کر لی جو حضرت ابو بکرؓ کی رائے سے ملتی جلتی تھی۔

"اگر میں آئندہ سال تک زندہ رہا تو پہلے لوگوں کو اور آخر لوگوں کو یقیناً ملا دوں گا یہاں تک کہ وہ عطا میں برابر ہو جائیں"[4]

صـ ۲۲۲

۱۔ ماوردی: احکام السلطانیہ باب ۱۱ صفحہ ۱۹۰۔ نیز ابو یعلی: احکام السلطانیہ فصل فی وضع الدیوان۔

۲۔ ایک بدو نے پارچہ کی تقسیم سے متعلق جو سوال کیا تھا وہ باب ۲ میں آزادی تقریر کے سلسلہ میں صفحہ ۱۴۰ پر گذر چکا نیز اجرت کے اسی باب میں لباس میں مساوات کے تحت صفحہ ۴۳۸ پر گذر چکا۔ ۳۔ بخاری ۱۲ کتاب الجہاد بخاری کے علاوہ مسلم وغیرہ میں بھی یہ حدیث موجود ہے۔

۴۔ کتاب الاموال صفحہ ۲۶۴ نمبر ۶۴۹ بروایت زید بن اسلم نیز ابو یوسف: کتاب الخراج صفحہ ۲۷۔

نئے سال میں حضرت فاروق اعظمؓ کو اپنے معاشی پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کی ابھی نوبت بھی نہ آئی تھی کہ اسلامی سال کے آخری دنوں میں افسوس ہے کہ حضرت عمرؓ کی شہادت ہوگئی۔ گو آپ کا پروگرام عملی صورت نہ اختیار کرسکا پھر بھی آئندہ آپ کا جو مقصد تھا اور جو لائحہ عمل آپ بنانا چاہتے تھے اس کا تذکرہ اب بھی قدیم مستند کتابوں میں موجود ہے چنانچہ اسود بن قیس اپنے شیخ سے روایت کرتے ہیں کہ "میں نے حضرت عمرؓ کو یہ کہتے سنا کہ اگر میں سال آئندہ تک زندہ رہا تو مہاجرین میں ادنیٰ سے ادنیٰ کو دو ہزار دوں گا[1] حضرت عمرؓ نے "تین سو سے کم کسی کو نہیں دیا اور کہا کہ اگر مال زیادہ ہوتا تو میں ہر شخص کو اس کے سفر کے چار ہزار، اس کے ہتھیاروں کے لیے ایک ہزار، اس کے بعد اس کے بال بچوں کے لیے ایک ہزار اور اس کی سواری اور نعلبندی کے لیے ایک ہزار دیتا[2] خود بخاری شریف میں ہے کہ "حضرت عمرؓ نے کہا کہ اگر خدا نے مجھے سلامت رکھا تو میں اہل عراق کی بیوہ عورتوں کی حالت ایسی سدھار دوں گا کہ وہ میرے بعد کبھی کسی کے محتاج نہ ہوں عمرو بن میمونؒ (جو کہ راوی حدیث ہیں) کہتے ہیں کہ اس بات کو کہے ہوئے چوتھا ہی دن تھا کہ وہ شہید کر دیے گئے ......[3]

حضرت عمرؓ کا ارادہ بھی تسویۂ دولت کا تھا۔

اشتراکیین شدومد سے اس کا پرچار کرتے ہیں کہ دولت تمام بنی نوع انسان میں مساوی تقسیم ہونی چاہیئے واقعی بنی نوع انسان کے لیے اس سے بہتر ہمدردانہ تصور اور کیا ہوسکتا ہے! لیکن اس پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کے لیے روس میں خونی انقلاب ہوا اور اس انقلاب کے ختم پر صرف مزدوروں اور کسانوں کا طبقہ باقی رہ گیا۔ دوسرے لفظوں میں پورا امیر طبقہ ختم ہوکر غریب طبقہ باقی رہ گیا تو گویا اشتراکیین نے سب کو غریب بنا دیا اور حضرت عمرؓ امارت میں

۱۔ فتوح البلدان ۴۵۰ نیز ماوردی: الاحکام السلطانیہ باب ۱۸ ص ۱۹۱ نیز ابن سعد ج ۳ ص ۲۱۹ عمرؓ

۲۔ بلاذری: فتوح البلدان صفحہ ۴۵۱ ۔ ابن سعد ج ۳ ص ۲۱۴ عمرؓ ۔ ۳۔ بخاری پ ۱۴ فضائل عثمانؓ۔

تسویۂ دولت کے قائل تھے کہ سب کو دولت مند بنا دیا جائے۔ تسویۂ دولت کی دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں، غربت میں تسویہ یا امارت میں تسویہ۔ حضرت عمرؓ آخری صورت کے قائل تھے یعنے اگر قومی دولت اتنی زیادہ ہو جس سے سب امیر ہو سکتے ہوں تو اس وقت تسویۂ دولت میں حرج نہیں غریبوں کا معیارِ زندگی اور اُن کی آمدنی کو اتنا بڑھایا جائے کہ وہ بھی دولت مندوں کے مثل خوش حال زندگی بسر کرنے لگیں۔

پانچواں باب

مبادلہ دولت

خلاصہ :- اس باب میں مبادلۂ دولت کی بحث میں یہ بتایا گیا ہے کہ رسول کریمؐ بارٹر کے قدیم طریقہ سے ہٹ کر صرف نقد سے مبادلہ کے طریقے کو رائج کرنا چاہتے تھے۔

پھر خرید و فروخت کی مختلف صورتوں کو بتاتے ہوئے بین الممالک بیع سلم کی نظیریں پیش کی گئی ہیں۔

احتکار کے مسئلہ پر اسلامی معاشیات کے نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ عام حالات میں حکومت کو نرخ اشیاء میں دخل دینے کا کوئی اختیار نہیں لیکن خاص حالات میں فلاح عام کی خاطر حکومت کو دخل دہی کا حق حاصل ہو جاتا ہے۔

تخمین، وسعت بازار اور مبادلہ دولت کے عنوانوں پر بحث کرتے ہوئے راتب بندی کے سلسلہ میں بتایا گیا ہے کہ یہ کوئی نئی چیز نہیں۔ حضرت یوسفؑ، رسول کریمؐ، حضرت عمرؓ اور حضرت امیر معاویہؓ کے عہد میں راتب بندی پر عمل ہو چکا ہے۔

پھر مبادلہ دولت کے انتظامات کی تشریح کی گئی ہے۔

زر کے سلسلہ میں ظاہر کیا گیا ہے کہ اسلامی مملکت نے تسکیک کو اپنے ہی ہاتھ میں رکھا تھا۔ اور عام مورخین کا یہ خیال کہ عبدالملک نے اسلامی سکہ جاری کیا صحیح نہیں کیونکہ حضرت عمرؓ اور دوسرے خلفاء راشدین اور نیز امیر معاویہؓ نے سونے اور چاندی کے سکے جاری کیے تھے البتہ اجرائے زر میں عادت کا لحاظ رکھا جاتا تھا یہاں تک کہ امیر معاویہؓ کے سکے شبیہ سے خالی نہ تھے۔

پھر زر کاغذی و نیابتی پر بحث کرتے ہوئے بتایا ہے کہ حضرت عمرؓ نے چمڑے کے سکے یا چمڑے کے نوٹ جاری کیے تھے نیز اسلامی عہد میں نوٹوں کا جو بدل تھا اسے پیش کر کے بتایا گیا ہے کہ اسلامی معاشیات میں زر کی بحث کے سلسلہ میں جو امتیازی چیز ہے وہ بین الممالک سکے کا رواج ہے۔

اس کے بعد اعتبار کی مختلف شکلیں پیش کی گئی ہیں، ہنڈی یا سفتجہ (بل آف ایکسچینج) کے سلسلے میں بتایا گیا ہے کہ ہنڈی کا صحابہ کے عہد ہی میں رواج ہو گیا تھا پھر پرامیسری نوٹس، خارجہ ہنڈی اور حوالہ (Novation) وغیرہ کی وضاحت کے بعد آخر میں بتایا گیا ہے کہ پہلے پہل حضرت عمرؓ ہی نے چک جاری کیے اور اسلامی عہد میں چکوں کا بکثرت رواج تھا، چک غالباً عربی صک ہی کا بگڑا ہوا لفظ ہے۔

بیت المال سے بھی بحث کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ وہ مسلمانوں کی مشترکہ ملک سمجھا جاتا تھا، حضرت عمرؓ وغیرہ کے زمانے میں اس کی کئی نظیریں ملتی ہیں کہ لوگ اپنی تنخواہوں کی ضمانت پر سرکاری خزانے سے پیدآور اور غیر پیدآور دونوں اغراض کے لیے قرضے لیا کرتے تھے۔

پھر رہن، ضمانت، ودیعت (ڈپازٹ) اور امانت سے بحث کی گئی ہے۔

(۱) مبادلۂ دولت کی عام صورتیں

مناسب طریقہ پر دولت کی تقسیم کے بعد باہم اشیاء کے باہمی تبادلہ کا سوال پیدا ہوتا ہے اگرچہ ہر شخص اپنی ہی احتیاجات پوری کرنے کے لیے محنت کر کے دولت پیدا کرتا ہے لیکن بعض صورتوں میں وہ اپنی پیدا کردہ اشیاء سے براہِ راست استفادہ نہیں کرتا بلکہ اپنی پیدا کردہ اشیاء کا دوسروں کی پیدا کی ہوئی اشیاء سے تبادلہ کرتا ہے۔

قدرت نے ہر ایک انسان کو دوسرے کا دست نگر بنایا ہے اور وہ الگ تھلگ زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ اسی طرح ایک ملک میں قدرت کے جو ذخیرے پائے جاتے ہیں وہ دوسرے ملک میں یا خطۂ ارض میں نہیں ہوتے۔ لامحالہ مبادلۂ دولت کی ضرورت پڑتی ہے۔ تقسیم عمل کی ترقی سے مبادلۂ دولت میں بھی مزید وسعت ہوتی ہے۔

مبادلہ دولت کی تعریف : — عام طور پر فقہ کی کتابوں میں مبادلہ یا بیع و شرا کی یہ تعریف کی گئی ہے کہ "اپنے مال کو دوسرے کے مال سے باہمی رضامندی سے بدلنا"۔ "باہمی رضامندی" کا لفظ اس لیے بڑھایا گیا ہے تاکہ یہ معلوم ہو کہ مبادلہ بغیر جبر و اکراہ کے عمل میں آیا ہے۔

اجناسی مبادلت (بارٹر) کے طریقہ کی موقوفی اور زر کا رواج

دنیا کے دوسرے حصوں کی طرح قدیم عرب میں بھی اشیاء کو اشیاء سے بدلنے (بارٹر)[1] کا رواج تھا چنانچہ "حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے عصیفر نام کا اپنا اونٹ بیس اونٹوں کے بدلے میں بیچا تھا"[2]

---

[1] - عربی میں بارٹر جنسی مبادلت کے لیے مقایضہ کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔

[2] - امام مالک؛ موطا، کتاب البیوع باب بیع الحیوان بعضہ ببعض بروایت حسن بن محمد بن علی کرم اللہ وجہہ۔

لیکن رسول کریمؐ بارٹر کے طریقے سے ہٹا کر صرف زر سے مبادلہ کے طریقہ کو رائج کرنا چاہتے تھے۔ حضرت ابو سعید خدریؓ صحابی کی اس روایت پر غور کیجئے فرماتے ہیں کہ "رسول کریمؐ نے ایک شخص کو خیبر کا عامل مقرر کیا جب وہ (خیبر سے) مدینہ آیا تو وہ تھوڑی سی بہترین قسم کی کھجوریں آپ کے پاس لایا۔ رسول کریمؐ نے اس سے پوچھا کہ کیا خیبر کی سب کھجوریں ایسی ہی ہوتی ہیں؟ اس نے کہا نہیں واللہ اے رسول خداؐ! ہم ان کھجوروں کا ایک صاع اور کھجوروں کے دو صاع کے عوض ہیں، اور ان کھجوروں کے دو صاع اور کھجوروں کے تین صاع کے عوض بدل لیتے ہیں۔ رسول کریمؐ نے فرمایا کہ ایسا نہ کرو، تم ان کھجوروں کو درہموں کے عوض میں بیچ کر درہموں سے عمدہ کھجوریں مول لیا کرو۔لہ

زر ہی سے اشیاء کی قیمتیں ٹھیک طور پر معین ہوتی ہیں ورنہ بارٹر (جنسی مبادلت) کے اس طریقہ میں علاوہ دوسری عملی دشواریوں کے ایک بڑی دشواری یہ ہے کہ چیزوں کی قیمت کا کوئی صحیح پیمانہ معین نہ ہو سکے گا باوجود وحدت جنسی کے محض صفاتی فرق کی وجہ سے بزیادتی چیزوں کا مبادلہ کیا جائے تو جیسے کھجوروں کا مبادلہ کھجوروں سے تو کھلی ہوئی بات ہے کہ یہ ربوا یعنی سود کی شکل ہو جائے گی۔ اس بارے میں آنحضرتؐ نے یہی فرمایا کہ یہ تو ربوا (سود) ہے چنانچہ ابو سعید الخدریؓ ہی روایت کرتے ہیں کہ "رسول کریمؐ کے پاس حضرت بلالؓ برنی کھجوریں لائے۔ رسول کریمؐ نے ان سے پوچھا کہ یہ کہاں سے لے آئے؟ بلالؓ نے کہا کہ ہمارے پاس کچھ خراب کھجوریں تھیں ہم نے ان کے دو صاع کے عوض یہ ایک صاع کھجوریں لی ہیں تاکہ ہم اپنے نبیؐ کی خدمت میں پیش کریں" یہ سن کر رسول کریمؐ نے بیزاری ظاہر کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ تو نرا سود ہے ایسا نہ کرو۔ جب تم عمدہ قسم کی کھجوریں (مثل برنی وغیرہ) خریدنا چاہو تو خراب کھجوریں

لہ۔ بخاری پ۹ کتاب الوکالۃ نیز بخاری پ۸ کتاب البیوع نیز بخاری پ۱۷ کتاب المغازی نیز بخاری پ۳۰ کتاب الاعتصام بخاری کے علاوہ موطا، مسلم وغیرہ کے ابواب البیوع میں بھی یہ حدیث پائی جاتی ہے۔

کسی اور شئے کے عوض میں بیچ کے اس شئے کے مبادلہ میں عمدہ کھجوریں خرید لیا کرو۔[1]

"اس زمانے کا متمدن معاشرہ، قدیم طریقہ بارٹر (جنسی مبادلت) کی دقتیں اچھی طرح نہیں جانتا اور عجب نہیں کہ ہم کو یہ دقتیں محض خیالی نظر آتی ہوں۔ ہم بچپن ہی سے زر کے استعمال کے عادی ہیں اس لیے ان گسنت فائدوں اور سہولتوں کا جو زر کی بدولت حاصل ہوتی ہیں پورا احساس نہیں کر سکتے۔ البتہ جب ہم کو معاشرہ کے ایک بالکل مختلف اور ادنی تمدن سے دوچار ہونا پڑتا ہے تو ان دقتوں کا اچھی طرح احساس ہوتا ہے جو زر کی عدم موجودگی کی وجہ سے لاحق ہوتی ہیں۔ یہ سن کر ضرور حیرت ہوگی کہ اب تک بہت سی غیر متمدن اقوام میں بارٹر (جنسی مبادلت) ہی تجارت کا واحد اور اہم ذریعہ ہے۔ یہ تضاد بھی کچھ کم حیرت انگیز نہیں کہ خاص لندن میں مشترکہ سرمایہ کی ایک تجارتی کمپنی "افریکن بارٹر کمپنی لمیٹڈ" کے نام سے قائم ہے جس کا کاروبار یہی ہے کہ مغربی افریقہ میں یورپین مصنوعات سے کھوپرے کے تیل، سونے کے ذرات، ہاتھی دانت، قہوہ، کپاس، گوند وغیرہ جیسے خام پیداوار کا تبادلہ کرے۔[2] دوسری متمدن قومیں جیسے جرمنی وغیرہ میں اس کا رواج بین الممالک تجارت کے سلسلے میں بڑھتا جا رہا ہے۔

مبادلہ دولت کے غلط طریقوں کا انسداد

پہلے باب میں بتایا گیا ہے کہ قدیم عرب میں مبادلہ کے مختلف طریقے رائج تھے، رسول کریم ﷺ نے رواج پائے ہوئے ان طریقوں میں سے چند خاص طریقوں کی ممانعت فرمائی۔ ایک طریقہ تو وہ تھا جسے "تلقی جلب" کہتے ہیں، کرتے یہ تھے کہ مال لے کر دیہات سے شہروں کی طرف لوگوں کے آنے کا پتہ چلانے والے پتہ چلاتے رہتے تھے، شئے کے بازار میں پہنچنے سے پہلے ہی نکل کر آگے بڑھ کر ان سے معاملہ کر لیتے اور یوں خود ہی اس مال پر

---

[1] بخاری باب کتاب الوکالۃ۔

[2] جیونز: منی اینڈ میکانزم آف ایکسچینج باب ۱ صفحہ ۳ بارٹر ئیسواں ایڈیشن۔

قبضہ کرکے من مانے داموں پر شہر میں فروخت کرتے۔

اسی طرح بعض لوگ شہروں میں دیہاتیوں کے ایجنٹ بن جاتے اور طے کر لیتے تھے کہ جو مال بھی اس بازار میں کوئی دیہاتی لائے گا اسے ان ہی کے توسط سے فروخت کرے گا اس کی تعبیر حدیثوں میں "بیع الحاضر لباد" کے الفاظ سے کی گئی ہے، اس طریقہ کار میں کبھی شہر والوں کو نقصان اٹھانا پڑتا تھا اور کبھی بیچارے دیہات سے مال لانے والوں کو، "ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریمؐ نے فرمایا کہ غلہ لانے والے قافلہ کی پیشوائی کو نہ جاؤ اور کوئی شہری کسی بیرونی کے لیے بیع نہ کرے۔ طاؤس جو حدیث کے راوی ہیں کہتے ہیں کہ میں نے ابن عباسؓ سے پوچھا کہ اس کا کیا مطلب ہے کہ کوئی شہری کسی بیرونی کے لیے بیع نہ کرے؟ ابن عباسؓ نے کہا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کا دلال نہ بنے"[1]

ان تمام صورتوں کی بنیاد گویا تخمینہ پر رکھی ہے اور تخمینہ پر کاروبار کی ان شکلوں میں اگرچہ عام حالات کے اعتبار سے پیچیدگی کم پیدا ہوتی ہے مگر بعض موقعوں پر چند افراد کا اس طرح مال پر قبضہ کر لینا عام باشندوں کے لیے وبال جان بن جاتا ہے چنانچہ پروفیسر ٹاسگ نے لکھا ہے کہ "تخمین کی اصطلاح کئی معنوں میں استعمال ہوتی ہے عام طور سے اس کے یہ معنی لیے جاتے ہیں کہ ایسے اشخاص کی جانب سے خرید و فروخت کرنا جن کا پیشہ کاروبار نہیں ہے بلکہ کوئی دوسرا پیشہ رکھتے ہیں، مختصر لفظوں میں اغیار کا بازار میں کبھی کبھار آن کر حصہ لینا ہے"[2]

"تخمین کا جو اثر پڑتا ہے اس کو قدیم زمانہ کے تجربوں سے تمثیلاً بیان کیا جا سکتا ہے جب کہ غذا کی قیمت میں بڑے تغیرات عام طور سے ہوتے تھے، موجودہ حالات کے تحت جب کہ رسد کے بڑے بڑے رقبوں کے درمیان ریلوں اور دخانی جہازوں کی سہولت کی وجہ سے مقابلہ ہوتا ہے اکثر اشیائے خورونوش کی

۱؎۔ بخاری نیز کتاب البیوع، بخاری کے علاوہ مسلم، موطا نیز ابوداؤد کے ابواب البیوع

۲؎۔ ٹاسگ: اصول معاشیات ج ۱ باب ۱۱ صفحہ ۱۰۶ تخمین۔

رسد میں اچانک اور غیر متوقع تغیرات بہت کم بلکہ شاذ ہی ہوتے ہیں اگر کسی ایک ملک یا خطہ ملک میں فصل خراب ہو تو اس کا اثر دوسرے ملک یا خطہ ملک کی عمدہ فصل کے ذریعہ سے دور کیا جاسکتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ موسمی رسدوں میں تغیر ہوتا ہے اور ان کے اثرات کے تحت قیمتیں بڑھتی گھٹتی رہتی ہیں پھر بھی یہ تغیرات بہت ہی کم وسیع اور اہم ہوتے ہیں لیکن ایسے حالات میں جیسے کہ اٹھارھویں صدی سے پہلے محدود جغرافی تقسیم عمل کے تحت پائے جاتے تھے اہم تغیرات روزمرہ کا تجربہ تھے۔ اس وقت کوئی ضلع یا شہر اپنی غذا جس رقبہ سے حاصل کرتا تھا وہ رقبہ بہت محدود ہوتا تھا اگر فصل کم ہوئی تو اس کے معنی رسد کی قلت کے تھے اور قلیل رسد کے مطابق صرف میں بھی کمی کرنا لازمی تھا۔ تاجر یا محتمن یا دلال جو اس رسد کو حاصل کرتے تھے اس کے معاوضہ میں فوراً اعلیٰ قیمت طلب کرتے تھے[1]

تجارت میں قماربازی سے نفع اٹھانا

مبادلہ دولت کے سلسلے میں چند اور غلط طریقے جو رائج تھے رسول اللہ صلعم نے ان سے بھی منع فرما دیا۔ ان کا حال ذیل میں بیان کیا جاتا ہے۔

"رسول کریم صلعم نے بیع منابذہ سے منع فرمایا۔ بیع منابذہ یہ ہے کہ ایک شخص اپنا کپڑا بیع کی غرض سے کسی شخص کی طرف ڈال دے بغیر اس کے کہ اس بیع کو ہاتھ میں لے یا اس کی طرف دیکھے اور بیع ملامسہ سے بھی منع فرمایا اور ملامسہ کپڑے کو چھونا بغیر اس کے کہ مبیع کی طرف نظر کرے[2]"

اسی طرح "رسول کریم صلعم نے بیع حبل الحبلی سے بھی منع فرمایا جاہلیت کے زمانے میں یہ ایک قسم کی بیع تھی جیسے ایک شخص اونٹنی اس وعدہ پر مول لیتا تھا کہ جب اس کا بچہ پیدا ہو اور پھر وہ جنے تب میں اس کی قیمت ادا کروں گا[3]"

---

[1] - ٹاسگ: اصول معاشیات ج ۱ باب ۱۱ صفحہ ۱۸۵ تلخیص۔
[2] - بخاری ج ۱ کتاب البیوع بروایت ابوسعید الخدری رض۔
[3] - بخاری ج ۱ کتاب البیوع نیز مسلم، موطا وغیرہ کے ابواب البیوع۔

اسی طرح "رسول کریمؐ نے بیع الحصاۃ سے بھی منع فرمادیا۔ اس بیع میں فروشندہ خریدار سے کہتا کہ جب تو میری طرف کنکریاں پھینکے گا تو میرے اور تیرے درمیان بیع واجب ہو جائے گی یہ جاہلیت کے لوگوں کی ایک بیع کا طریقہ تھا[۱]"

خرید و فروخت کے ایسے عام طریقے جن میں آئندہ جھگڑوں کا اندیشہ ہو اسلام نے ان سب کی ممانعت کر دی ہے۔ مدینہ میں پھلوں اور کھیتوں کو تیار ہونے اور پکنے سے پہلے فروخت کر دیا جاتا تھا۔ رسول کریمؐ نے اس طرح وقت سے پہلے بیچنے کی ممانعت فرمادی۔ "رسول کریمؐ نے کھجوروں کے درخت پر خرید و فروخت کرنے سے منع فرمادیا جب تک کھجوریں گدر نہ ہو جائیں اور کھیت کی بالیوں کی خرید و فروخت سے بھی ممانعت فرمائی یہاں تک کہ سفید نہ پڑ جائیں اور آفت کا خوف باقی نہ رہے[۲]" ایک اور حدیث میں اسی قسم کی بیع کی ممانعت کے ساتھ ساتھ وجہ بھی بتلادی ہے چنانچہ "حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریمؐ نے ایسے پھلوں کی خرید و فروخت سے منع فرمایا جن میں پختگی کے آثار نمایاں نہ ہو جائیں۔ کسی نے عرض کی کہ پختگی کیونکر پہچانی جائے؟ فرمایا یہاں تک کہ سرخ ہو جائیں اور فرمایا بھلا بتاؤ تو اگر خدا پھل کو پکنے اور تیار ہونے سے روک دے تو تم میں سے کوئی شخص اپنے بھائی کا مال کس چیز کے عوض میں لیتا ہے[۳]"

ہمارے ملک میں عام رواج ہو گیا ہے کہ ثمردار درختوں کو پھل آنے سے پہلے فروخت کر دیا جاتا ہے جسے بہار کا بیچنا کہتے ہیں یعنی درختوں میں ابھی مور بھی نہیں آیا یا مور آیا اور کیریاں ابھی کچی ہیں لیکن پکے آموں کا سا سودا کر لیا گیا۔ بہار بیچنے کی صورت میں اکثر ایک نہ ایک فریق گھاٹے میں رہتا ہے۔ سوچتا ہے کچھ، اور ہوتا ہے کچھ، اور گھاٹے کا ضروری نتیجہ ہے

---

[۱] ۔ ترمذی ابواب البیوع ج ۱ صفحہ ۲۳۸ مطبوعہ مصر۔

[۲] ۔ بخاری پ ۸، کتاب البیوع نیز مسلم وغیرہ کے ابواب البیوع۔

[۳] ۔ بخاری پ ۸، کتاب البیوع نیز مسلم، موطا ابوداؤد اور ترمذی کے ابواب البیوع۔

باہمی رنجش جس سے نظام تمدن میں تھوڑا بہت خلل واقع ہوتا ہے اور یہ طریقہ اصول اسلام کے خلاف ہے۔

مذکورہ قسم کی خرید و فروخت میں بعض فقہا نے ہر ملک کے دستور و رواج کا لحاظ کیا ہے لیکن اگر کھیت یا پھل خراب ہو جائیں یا بارش اور اولوں سے گر پڑیں تو یہ عمل درآمد رہا کہ حکومت خریدار کو معاوضہ دلا دیتی تھی جیسا کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے خریدار کو نقصان دلانے کا حکم دیا جب کھیت یا میوہ ناکارہ ہو جائے[1]

فریب دہی اور غلط تشہیر وغیرہ کی ممانعت

عہد جاہلیت میں مدینہ وغیرہ کے تاجر ناپ تول میں بھی ڈنڈی مارتے تھے[2] اس لیے معاملات میں ایمانداری برتنے کے لیے قرآن نے اہم تاکیدیں کی ہیں مثلاً

اَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ۔

ناپ اور تول انصاف سے کیا کرو۔

پ۸ الانعام ۶ ع ۱۹

اَوْفُوا الْكَيْلَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُخْسِرِيْنَ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ۔

پورا ناپ بھر کر دیا کرو اور کم دینے والے نہ بنو۔ اور تولو سیدھی ترازو سے۔ اور لوگوں کو ان کی اشیاء گھٹا کر نہ دیا کرو۔

پ۱۹ الشعراء ۲۶ ع ۱۰

وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ، وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ، اَلَا يَظُنُّ اُولٰٓئِكَ اَنَّهُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ لِيَوْمٍ عَظِيْمٍ يَّوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔

کم دینے والوں کی تباہی ہے کہ لوگوں سے ناپ کر لیں تو پورا پورا لیں اور جب ان کو ناپ کر یا تول کر دیں تو کم کر دیں کیا انھیں اس بات کا خیال نہیں کہ بڑے سخت دن قیامت کے دن یہ اٹھائے جائیں گے اور اس دن لوگ پروردگار عالم کے روبرو (اعمال کی جوابدہی کے لیے) کھڑے ہوں گے۔

پ۳۰ التطفیف ع ۱

---

[1] امام مالک: موطا، کتاب البیوع۔ [2] پہلے باب میں مدینہ کے تحت صفحہ ۹۲ پر تفصیل گزر چکی

مذکورہ آیتوں کے علاوہ قرآن میں اور جگہ بھی معاملات میں ایمان داری برتنے پر زور دیا گیا ہے اس کے علاوہ حدیثوں میں بھی اسی طرح کی ہدایتیں موجود ہیں۔

خرید و فروخت میں ایسے تمام طریقے جن میں فریب اور دھوکہ کی صورتیں نکل سکتی ہوں اسلام نے ان کو منع کر دیا ہے مثلاً دودھ دینے والے جانوروں کی خرید و فروخت میں دھوکہ دینے کا ایک عام طریقہ مصراۃ کا تھا یعنی چند دن یا کسی وقت کے دودھ کو تھنوں میں اکٹھا ہونے کے لیے اس لیے چھوڑ دینا کہ خریدار کو اس کے متعلق غلط اندازہ ہو مثلاً گائے سیر بھر دودھ دینے والی ہے لیکن مصراۃ کا طریقہ اختیار کر کے دکھانے والے دکھائے تھے کہ اُن کی گائے تین چار سیر دودھ دیتی ہے" حضرت ابوہریرہؓ کا بیان ہے کہ رسول کریمؐ نے فرمایا کہ اونٹنی اور بکری کو مصراۃ نہ بناؤ[1]۔ اسی طرح حدیثوں میں نجش کی ممانعت آئی یعنی محض قیمت بڑھانے کے لیے کسی چیز کے دام بڑھا کر کہنا تاکہ دوسرا آدمی دھوکہ میں آکر خرید لے جیسا کہ ہراج کے موقعوں پر اکثر ہوا کرتا ہے۔

اسی طرح غلط بیانی، غلط تشہیر اور دروغ گوئی کی بھی ممانعت ہے۔ قبل ازیں یہ حدیث گذر چکی کہ ایک شخص تر غلہ کو عمدہ غلہ بتا کر فروخت کر رہا تھا معاشی تعلقات کی تصحیح کے پیغمبر کی زبان مبارک سے آواز آئی کہ پھر تم نے اس تر غلہ کو اوپر کیوں نہ رکھا جو فریب کرے وہ ہم سے نہیں ہے[2]۔

خرید و فروخت کے طریقے

اسلامی فقہ اور حدیث کی ہر کتاب میں ایک خاص حصہ "کتاب البیوع" کے عنوان سے پایا جاتا ہے اس میں خرید و فروخت کے مختلف طریقے اور قوانین بیع و شراء (کمرشیل لاز) نہایت ہی مبسوط پیرائے میں بیان کیے گئے ہیں۔ حدیث کی کتابوں میں تو آنحضرتؐ اور صحابہ کرامؓ کے خرید و فروخت کے بیسوں واقعات بیان ہوئے ہیں۔

---

[1] - بخاری ج۱ کتاب البیوع، نیز ابو داؤد ج۲ کتاب البیوع
[2] - مسلم ج۱ کتاب الایمان، پیدائش دولت کے باب ۳ کے ختم پر مذکورہ بالا حدیث گزر چکی ہے

غرض تمام قوانین بیع وشرا میں اصل اصول جو کارفرما ہے وہ یہ ہے کہ حتی الامکان خریدار اور فروشندہ کے درمیان جھگڑے نہ پیدا ہوں۔

بسا اوقات عجلت کی وجہ سے یا جس کے لیے مال خریدا جاتا ہے اس کی عدم پسندیدگی کی وجہ سے خریدار چاہتا ہے کہ معاملہ کو قطعی صورت میں طے نہ کرے، کبھی فروشندہ بھی یہی چاہتا ہے اس لیے "خیار شرط" کا طریقہ اختیار کیا گیا۔ اسی طرح کبھی مال کو بے دیکھے آدمی خرید لیتا ہے چاہتا ہے کہ دیکھنے تک واپسی کے حق کو محفوظ کر لے اس کے لیے "خیار رویت" ہے۔ کبھی یہ ہوتا ہے کہ خریدنے کے بعد چیز میں ایسا عیب یا نقص نکل آتا ہے جس کی وجہ سے مال کو خریدار واپس کرنا چاہتا ہے اس کے لیے "خیار عیب" کا اصول موجود ہے۔ اور کبھی معاملہ طے ہو جانے کے بعد پچھتاتا ہے تو اس کے لیے "اقالہ" کا طریقہ رائج ہوا۔

لین دین خرید و فروخت میں بعض شرطوں کے ساتھ دو صورتیں بھی اختیار کی جاتی ہیں جیسے تولیہ اور مرابحہ کہتے ہیں، یعنی جس دام پر چیز لی گئی ہے فروشندہ باور کرائے کہ اسی دام پر خریدار کو دے رہا ہے تو اس کو تولیہ کہتے ہیں اور نفع رکھ کر سنئے کو بیچے تو اس کا نام مرابحہ ہے

ہراج یا نیلام
(بیع مزایدہ)

نیلام کے ذریعہ سے بھی اشیاء فروخت کی جا سکتی ہیں خود رسول کریمؐ نے نیلام کے ذریعے سے اشیاء بارہا فروخت کی ہیں، مشہور واقعہ ہے کہ ایک انصاری نے رسول کریمؐ کے پاس سوال پیش کیا۔ رسول کریمؐ نے دریافت کیا کہ آیا تمھارے پاس کسی قسم کی کوئی چیز ہے؟ عرض کی کہ جی ہاں! ایک کمبل ہے جس کا کچھ حصہ پہنتا ہوں اور کچھ حصہ اوڑھتا ہوں اور ایک پیالہ ہے جس میں پانی پیتا ہوں، آپ نے فرمایا کہ اسی کو لے آؤ، وہ لے آئے، حضورؐ نے خود اپنے دست مبارک میں دونوں چیزوں کو لے کر ہراج کرنا شروع کیا۔ ایک صحابی نے ایک درہم لگایا، آپ نے فرمایا کہ اس سے زیادہ کوئی دینے والا ہے؟ کسی صحابی نے دو درہم دام

لگائے، حضورؐ نے اُن ہی کے حوالے کر دیا[1] اسی طرح رسول کریمؐ نے نعیم بن نحام کے ہاتھ ایک شخص کے غلام کو ہراج کے ذریعے سے فروخت کیا تھا[2]۔ عام طور سے مال غنیمت بھی اسی طرح بیچا جاتا تھا۔

خرید و فروخت کی چار صورتیں

خرید و فروخت کی عقلاً چار صورتیں ممکن ہیں

(۱) دام دے کر مال خریدنا یعنی قیمت اور شئے دونوں نقد دست بدست لینی اور دینی۔

(۲) دام بعد کو دینا اور مال پہلے لینا جسے اُدھار اور نسیہ کہتے ہیں۔

(۳) دام پہلے ادا کرنا اور مال بعد کو لینا جسے سلم کہتے ہیں۔

(۴) نہ دام ہی لیے جائیں اور نہ مال ہی لیا جائے لیکن معاملہ کر لیا جائے اُسے "بیع الکالی بالکالی" کہتے ہیں۔ یہ چوتھی صورت اسلام میں ناجائز ہے قیمت و شئے دونوں یہاں مجہول ہیں جہالت کی وجہ سے طرح طرح کے جھگڑے اُٹھ کھڑے ہونے کا اندیشہ ہے اس لیے ممانعت کی گئی ہے باقی تین صورتوں کو جائز قرار دیا گیا ہے البتہ کچھ شرطیں ضرور عائد کی گئی ہیں۔ ان سے غرض یہی ہے کہ جہاں تک ہو سکے جھگڑوں کا دروازہ بند ہو جائے۔

بیع سلم

اسلامی قانون تجارت کی رو سے کسی شئے کو خریدتے وقت اس شئے کا فروشندہ کے قبضہ میں ہونا ضروری ہے پیشگی دام دے کر بھی مال خریدا جا سکتا ہے جس کو بیع سلم کہتے ہیں اور آرڈر پر بھی مال سپلائی کیا جا سکتا ہے جس کو بیع استصناع کہتے ہیں لیکن معاملہ میں معاہدہ کرنے والوں کو چند باتوں کا کہہ دینا ضروری ہے تاکہ بعد میں اختلاف نہ ہو۔ امام ابو حنیفہؒ نے اس کے لیے یہ سات شرطیں ضروری قرار دی ہیں (۱) جنس کا تذکرہ (۲) نوع کا تذکرہ (۳) صفت کا تذکرہ (۴) مقدار کا تذکرہ (۵) راس المال کی مقدار

---

[1] ۔ اس حدیث کی پوری تفصیل کو پیدائش دولت باب ۳ کے آخری حصہ میں بیان کیا گیا ہے۔

[2] ۔ بخاری ج ۲۸ کتاب الاکراہ تفصیل کے لیے "عرب کا قدیم معاشی نظام" باب ۱ صفحہ ۹۳ ملاحظہ فرمائیے۔

(۶) جس مقام پر مال حوالے کیا جائے گا اس کی صراحت (۷) حوالگی اور فراہمی کی میعاد کا تذکرہ۔

ایک نئی مثال سے ہم مذکورہ شرطوں کو واضح کریں گے۔ فرض کیجیے کہ حیدرآباد کا ایک تاجر لندن کی کسی فرم کو موٹر کی سپلائی کا آرڈر دیتا ہے اب شرائط میں یہ طے پانا ضروری ہے کہ موٹر کا تذکرہ ہو کہ آیا آسٹن کار ہوگی یا اور کسی قسم کی نیز موٹر کا ماڈل کہ کس سنہ کی فراہم کی جائے گی، اس کی ایسی قوت اور رفتار نیز اس کی قیمت کا تذکرہ ہو کہ وہ کس قدر رقم لے گا؟ آیا پونڈ میں لے گا یا حیدرآبادی زر میں نیز یہ کہ موٹر حیدرآباد میں سپلائی کی جائے گی یا صرف بمبئی تک نیز کتنی مدت میں ایک ماہ بعد یا ایک سال بعد فراہم کی جائے گی؟ غرض عام اصول یہ ہے کہ "بیع سلم ہر ایسی شئے میں جائز ہے جس کی صفت کو تحریر میں لایا جا سکتا ہو اور اس کی مقدار کا اندازہ ہو سکتا ہو کیونکہ ان میں جھگڑا پیدا نہیں ہو سکتا"[۱]

بین الممالک بیع سلم کی نظیر

اسلام آزاد تجارت کا حامی ہے اس کی تفصیل آئندہ بیان کی جائے گی البتہ یہاں صرف یہ کہہ دینا کافی ہے کہ اسلامی ماخذوں سے بین الممالک بیع سلم کی کافی نظیریں ملتی ہیں چنانچہ مبسوط وغیرہ میں لکھا ہے کہ آنحضرت ؐ نے ابوسفیان کو فتح مکہ بلکہ صلح حدیبیہ سے بھی پہلے مدینے کی کھجوریں دے کر معاوضے میں کھالیں اور چمڑے طلب کیے[۲]

احتکار

عہد جاہلیت میں مکے اور مدینے وغیرہ کے تاجر احتکار کیا کرتے تھے کاروانوں کی پیشوائی کو مالدار تاجر یا ان کے دلال جاتے اور غلہ کا سارا ذخیرہ خرید کر اپنے قبضے میں کر لیتے بعد میں رسد کو روک کر من مانی قیمت پر فروخت کرتے[۳] جدید معاشئین نے احتکار کو اجارہ کی ہی

۱؎ ہدایہ ج ۳ کتاب البیوع، باب السلم۔

۲؎ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو مبسوط سرخسی جلد ۱۰ صفحہ ۹۲ نیز شرح سیر کبیر سرخسی ج ۱ ص ۔

۳؎ تفصیل پہلے باب "عرب کے قدیم معاشی نظام" میں گزر چکی۔

ایک شکل قرار دی ہے۔ "تخمین (اسپیکیولیشن) کا میلان اور شوق رکھنے والے اس قسم کے کاروبار میں حصہ لینے کی کوشش کرتے ہیں یعنی وہ کسی شئے کی کل رسد کو خرید کر اس پر قابو جما لیتے ہیں اور اس کے بعد اگر ممکن ہو تو اس کو بہت زیادہ منافع پر فروخت کر دیتے ہیں"[1]

امام اوزاعی المتوفی ۱۵۷ھ جو شام کے بڑے مفتی گذرے ہیں کہتے ہیں کہ

اَلْمُحْتَكِرُ مَنْ يَعْتَرِضُ السُّوقَ۔

محتکر وہ شخص ہے جو بازار کے کاروبار میں مداخلت کرتا ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم احتکار کو ناپسند فرماتے تھے چنانچہ معمر کہتے ہیں کہ رسول کریمؐ نے فرمایا کہ

مَنْ احْتَكَرَ فَهُوَ خَاطِئٌ[2]

جو شخص احتکار کرتا ہے وہ گنہگار ہے۔

محتکر کی نفسیات بھی آپ نے بیان فرما دی ہے۔

بِئْسَ الْعَبْدُ الْمُحْتَكِرُ اِنْ اَرْخَصَ اللّٰهُ الْاَسْعَارَ حَزِنَ وَاِنْ اَغْلَاهَا فَرِحَ[3]

محتکر بڑا ہی برا بندہ ہے اگر خدا نرخوں کو ارزاں کر دیتا ہے تو غمگین ہوتا ہے اور گراں کرتا ہے تو خوش ہوتا ہے۔

صراحت سے رسول اللہ نے غلہ کے احتکار کی ممانعت بھی فرمائی ہے۔

نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ يُحْتَكَرَ الطَّعَامُ[4]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غلہ میں احتکار کرنے کی ممانعت کر دی تھی

احتکار کے متعلق خلفاء راشدین کا طرز عمل

حضرت عمرؓ اپنی خلافت کے دوران میں تاجروں کو احتکار کرنے سے روکتے تھے آپ نے فرمایا تھا کہ "ہمارے بازار میں کوئی احتکار نہ کرے اور جن لوگوں کے ہاتھ میں زاید روپیہ ہے وہ کسی غلہ کو جو ہمارے ملک میں آئے اسے خرید کر

۱۔ ٹاسگ: اصول معاشیات ج ۱ باب ۵ صفحہ ۲۱۰۔ ۲۔ ابو داؤد، کتاب البیوع

۳۔ مسلم: کتاب البیوع۔

۴۔ بیہقی: کتاب البیوع۔

احتکار نہ کریں لیکن جو شخص مصیبت اٹھا کر ہمارے ملک میں گرمی یا جاڑے میں غلہ لائے تو وہ (خلیفہ) عمرؓ کا مہمان ہے اور وہ سوداگر جس طرح اللہ کو منظور ہو فروخت کرے اور جس طرح اللہ کو منظور ہو رکھ چھوڑے"[1]

حضرت عثمانؓ نے بھی اپنی خلافت کے دوران میں احتکار سے منع کر دیا تھا چنانچہ موطا میں ہے کہ "حضرت عثمان بن عفانؓ احتکار سے منع کرتے تھے"[2]

چونکہ عامۃ الناس پر احتکار کی زد پڑتی ہے اور لامحالہ انھیں گراں قیمت پر اشیاء خریدنی پڑتی تھیں اس لیے اسلامی مملکت نے تاجروں کو احتکار کرنے سے روک دیا تھا "عوام ان تخمینی احتکاروں سے بالکل بے تعلق نہیں رہتے عوام کی بعض ضرورتیں ایسی ہوتی ہیں جو ملتوی نہیں ہو سکتیں اور ان ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے بازاری قیمت پر اشیا خریدنا ناگزیر ہوتا ہے"[3]

صحابہ کا طرز عمل "معمر بن ابی معمر جو کہ بنو عدی بن کعب سے ہیں روایت کرتے ہیں کہ رسول کریمؐ نے فرمایا کہ احتکار کرنے والا خاطی گنہگار ہے۔ میں نے سعید بن المسیبؓ سے کہا کہ ارے تم احتکار کرتے ہو تو انھوں نے کہا کہ معمر بھی احتکار کرتے تھے چنانچہ وہ کھجور کی گٹھلیوں، دھاگہ سوت اور بیج (بزر) کا احتکار کیا کرتے تھے"[4]

محدث ابو عیسیٰ ترمذی المتوفی ۲۷۹ھ مذکورہ بالا حدیث درج کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ "فقہاء کے ہاں یہ عمل در آمد رہا ہے کہ انھوں نے غلہ میں احتکار کرنے کو ناپسند کیا ہے البتہ بعض فقہا نے غلہ کے سوا دیگر اشیا میں احتکار کرنے کی اجازت دی ہے چنانچہ امام اعظمؒ اور امام مالکؒ کے شاگرد ابن مبارکؒ کہتے ہیں کہ روئی (قطن = کاٹن) دباغت کیے ہوئے چمڑے اور اس جیسی اشیا

---

[1] امام مالک: موطا کتاب البیوع الحکرۃ والتربص

[2] امام مالک موطا کتاب البیوع، الحکرۃ والتربص

[3] ٹاسگ: اصول معاشیات ج ۱ باب ۱۵ ص ۲۱۲ قدر اجارہ۔

[4] ابو داؤد ج ۲۳ کتاب البیوع

احتکار کریں تو کچھ حرج نہیں ہے[1]

لیکن اس سلسلہ میں واضح ہو کہ یوں معتدل حالات میں غلّہ کے سوا اور اشیاء جو ایک مدت تک اچھی حالت میں رہ سکتی ہیں اور دُور دراز راہ سے آ سکتی ہیں تو ان میں احتکار کرنا عام طور سے دشوار ہے۔ تاجر کو سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے دوسرے حریف تاجر اس سنہری موقع سے فائدہ اٹھانے کے لیے اشیاء کی بھرمار شروع کر دیتے ہیں کیونکہ "جب کوئی شئے زرعی پیداواروں کے مثل موسمی پیدائش کے تابع نہ ہو بلکہ مسلسل تیار کی جاتی ہو تو پھر احتکار قائم کرنے کی راہ میں بڑی مشکلوں کا سامنا ہوتا ہے ۱۸۸۷ء تا ۱۸۸۸ء میں فرانسیسی سٹہ بازوں کی ایک مشہور جماعت نے جس کا سرگروہ سکریٹن تھا تانبے کا احتکار کرنے کی کوشش کی مگر دنیا کے ہر حصے سے اور تمام غیر معلوم اور نیم کندیدہ معدنوں سے تانبے کی بوچھار ہونے لگی اور رسد کی مقدار میں اضافہ ہو گیا۔ یہ احتکار کئی مہینوں تک قیمت کو بڑھائے رکھ کر اور ان لوگوں کو پریشان اور زیر بار کر کے جنھیں اس زمانہ میں لازماً خریداری کرنی پڑتی تھی، تباہ کن طریقہ پر ناکام رہا، نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے بانی نے مجبور ہو کر خودکشی کر لی اور ایک بڑے فرانسیسی بنک کو جس نے اس شخص کو بڑی بڑی رقمیں بطور قرض کے دی تھیں مجبوراً رقمی مطالبات کی ادائی موقوف کرنی پڑی"[2]

احتکار سے متعلق فقہاء کی رائے

فقہا نے عام طور سے کھانے پینے کی چیزوں میں احتکار کو ناجائز قرار دیا ہے چنانچہ صاحبِ ھدایہ لکھتے ہیں "آدمیوں اور جانوروں کی قوت میں احتکار کرنا مکروہ ہے بشرطیکہ یہ ایسے شہر میں ہو جہاں کہ لوگوں کو احتکار مضر ہو اور اسی طرح تلقی (غلہ لانے والے قافلہ سے جا کر ملنا) بھی مکروہ ہے پھر اگر احتکار یا تلقی مضر نہ ہو تو مضائقہ نہیں ہے"[3]

---

[1] ترمذی ابواب البیوع ج ۵ صفحہ ۲۰۲ مطبوعہ مصر۔

[2] پروفیسر ٹاسگ: اصول معاشیات جلد اول باب ۱۵ صفحہ ۲۱۳

[3] ھدایہ ج ۴ کتاب الکراھیہ نیز ھدایہ ج ۳ کتاب البیوع فصل فیما یکرہ

غرض اکثر فقہاء اور خاص کر امام ابو حنیفہؒ احتکار کی مختلف شکلوں کو ہر حال میں ناجائز نہیں کہتے۔ انھوں نے احتکار کو اقوات مثلاً گیہوں، جَو، سوکھی گھاس اور ہری گھاس تک محدود رکھا ہے۔ لیکن امام ابو یوسفؒ کی رائے میں ہر ایسی چیز جس کے روکنے سے عام لوگوں کو ضرر پہنچے احتکار میں داخل ہے چاہے وہ سونا چاندی اور کپڑا ہی کیوں نہ ہو۔[1]

اجارہ

یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ احتکار اجارہ[2] (مونوپولی) کی ہی ایک شکل ہے۔ اجارہ سے متعلق وہ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ اجارہ دولت کی تقسیم کو غیر مساوی بنا دیتا ہے لیکن اکثر یہ خیال صحیح نہیں ہوتا۔[3] امام ابو حنیفہؒ کا بھی یہی خیال ہے اس لیے وہ تلقی جلب اور بیع الحاضر البادہ وغیرہ کی شکلوں کو ہر حال میں ناجائز نہیں کہتے۔ "گو بظاہر اشیاء کی قیمت کا تعین اجارہ داری کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور طلب کے مطابق وہ رسد کو بازار میں لاتا ہے لیکن اگر قیمتوں میں واقعی بہت زیادہ اضافہ ہو اور شئے کی طلب تغیر پذیر ہو تو خریداریوں میں بھی سرعت کے ساتھ تخفیف ہوگی اور اجارہ دار کو بہت جلد معلوم ہو جائے گا کہ وہ ایک مقررہ رسد کو اعلیٰ قیمتوں پر فروخت نہیں کر سکتا۔[4] لامحالہ" اس طرح وہ مجبور ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی قیمتوں کو گھٹائے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا مقابلہ بہتر ہے یا انفرادی اقتدار (اجارہ) اس تفریق میں کاروبار کی نوعیت کو بھی دخل ہے، ہر حال ملک کے عام باشندوں کا فائدہ ملحوظ رہنا چاہیے مثلاً ٹیلیفون کا انتظام اکثر ملکوں میں

۱۔ ہدایہ جلد ۴ کتاب الکراہیہ۔

۲۔ اجارہ، مونوپولی "کسی شئے کی تجارت کا انفرادی اقتدار"

۳۔ بنہام: اکنامکس صفحہ ۲۲۵ مونوپولی۔

۴۔ ٹاسگ: اصول معاشیات باب ۱ صفحہ ۲۰۷ فقرہ اجارہ۔

اجارہ کی شکل رکھتا ہے چاہے وہ سرکاری ملکیت میں ہو یا خانگی اس کا انتظام اجارہ کے اصول پر ہونا ضروری ہے[1] اسی طرح ٹیلی گراف، ڈاک، برق، آب رسانی وغیرہ کا انتظام ہے۔ تسکیک کو اسلامی حکومت نے ہمیشہ اپنے ہی ہاتھ میں رکھا تھا۔

حکومت کی مداخلت

فقہاء لکھتے ہیں احتکار کرنے والے کا فعل چونکہ عام لوگوں کو نقصان پہنچاتا اور ان کے حق کو باطل قرار دیتا ہے اس لیے اس کا یہ فعل حکومت کی نظر میں مکروہ (ناپسندیدہ) قرار دیا جائے گا۔

احتکار کرنے سے جب عامۃ الناس کو ضرر پہنچتا ہو تو پھر حکومت مداخلت کر سکتی اور اسے محتکر کو سزا دینے کا اختیار حاصل ہو جاتا ہے "جب امر حاکم عدالت کے سامنے پیش کیا جائے تو وہ محتکر کو حکم دے گا کہ وہ اپنی قوت اور اپنے اہل وعیال کی قوت کو فراخی کے ساتھ اندازہ کرے اور جو کچھ زائد ہو وہ فروخت کرے اور حاکم عدالت اس کو احتکار کرنے سے منع کر دے اگر دوبارہ حاکم عدالت کے سامنے محتکر پیش ہو تو حاکم عدالت اس صورت میں قید کرنے کا حکم دے کر اس کو اپنی رائے سے سزا دے گا تاکہ لوگوں سے ضرر دور ہو[2]"

عام حالات میں حکومت کو نرخ میں مداخلت کا اختیار نہیں۔

فقہاء کی یہ عام رائے ہے کہ حکومت کو عام حالات میں نرخ مقرر کرنے کا اختیار حاصل نہیں۔

وَلَا يَنْبَغِي لِلسُّلْطَانِ أَنْ يُسَعِّرَ عَلَى النَّاسِ۔ — سلطان کو نرخ مقرر کرنا سزاوار نہیں ہے

اس کی دلیل میں وہ پہلے ایک حدیث بیان کرتے ہیں کہ "رسول کریمؐ کے عہد میں

---

[1] ٹاسگ: اصول معاشیات باب ۵۱ صفحہ ۲۰۶

[2] ھدایہ ج ۴ کتاب الکراہیۃ

اناج کا بھاؤ بڑھ گیا لوگوں نے کہا کہ کیا آپ ہمارے لیے نرخ مقرر نہ فرمائیں گے تو آپ نے فرمایا کہ "غلہ کا نرخ مقرر کرنے والا خود خدا ہے وہی تنگی پیدا کرتا ہے وہی کشادگی وہی روزی دینے والا اور نرخ اس کے قبضہ قدرت میں ہے[1]"

دوسری دلیل وہ یہ پیش کرتے ہیں کہ "ثمن قیمت فروخت کا مقرر کرنا معاہدہ کرنے والے کا حق ہے اور اس کے مقرر کرنے کا اختیار اسی کو حاصل ہے۔ پس امام (صدر حکومت) کو سزاوار نہیں کہ اس کے حق میں دخل دے مگر اس وقت جب کہ ضرر عامہ دفع کرنا مقصود ہو[2]"

پھر اگر غلہ والے تحکم کرتے ہوں (کہ ہم اسی نرخ سے دیں گے چاہے لو یا نہ لو) اور قیمت میں حد سے بڑھ کر تجاوز کرتے ہوں اور مسلمانوں کے حقوق محفوظ رکھنے سے حاکم عدالت عاجز ہوگیا ہو تو ایسی صورت میں اہل الرائے اور اصحاب بصیرت کے مشورہ سے نرخ مقرر کرنے میں کچھ ہرج نہیں ہے[3]

اس بارے میں ابن القیم نے طویل بحث کے بعد یہ معقول توجیہہ کی ہے کہ پڑتال سے کم پر بیچنے کے لیے تاجر کو حکومت مجبور نہ کرے گی لیکن اگر وہ عمداً مہنگا یا بعض کو نقصان پہنچانے کے لیے سستا بیچیں تو حکومت مداخلت کر سکتی ہے۔

بردہ فروشی کے ظالمانہ پہلو کا انسداد

رسول کریمؐ نے بردہ فروشی میں جو ظالمانہ پہلو تھے ان کو ختم کر دیا آپ نے کسی ماں کو اس کے بچے سے یا کسی بھائی کو اس کے بھائی سے الگ کرکے فروخت کرنے کی ممانعت فرما دی اور اس بات کی تنبیہ کی کہ "جو شخص ماں اور اس کے بچے کو جدا کرتا ہے تو قیامت کے دن خدا بھی اس کے اور اس کے دوستوں کے درمیان جدائی کر دے گا[4]"

---

[1] ترمذی، ابواب البیوع ج ۶ صفحہ ۵۳۔ [2] ہدایہ ج ۴ کتاب الکراھیۃ
[3] ہدایہ ج ۴ کتاب الکراھیۃ۔ [4] ترمذی، ابواب البیوع ج ۵ صفحہ ۲۸۳ بروایت ابو ایوب انصاریؓ۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ اپنا ایک واقعہ بیان فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ "رسول کریمؐ نے مجھے دو غلام عنایت فرمائے جو آپس میں بھائی تھے، میں نے ان میں سے ایک کو فروخت کر دیا۔ رسول کریمؐ نے پوچھا کہ اے علی! تم نے اپنے غلام کو کیا کیا؟ میں نے اس کی اطلاع دی۔ آپ نے فرمایا کہ واپس لے لو، واپس لے لو[1]"

معاشی فوائد کی ترجیح

اسلام کے بنیادی اصولوں کے منجملہ ایک اصول یہ ہے کہ معاشرہ اور ملت کے فائدوں کو خالص خانگی فائدوں پر ترجیح حاصل ہے چنانچہ شراب اور جوے کے متعلق کہا گیا ہے کہ

فِيهِمَا إِثْمٌ كَبِيرٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَإِثْمُهُمَا أَكْبَرُ مِن نَّفْعِهِمَا۔ ان میں بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے لیے کچھ فائدے بھی ہیں مگر ان کے فائدوں کے مقابلے میں ان کا نقصان بڑھا ہوا ہے

پ بقرع ۲۷

اسی لیے شراب کی تجارت ممنوع قرار دی گئی ہے۔ اس طرح حدیثوں میں ہے کہ رسول کریمؐ نے فرمایا کہ

لَا تَبِيعُوا الْمُغَنِّيَاتِ وَلَا تَشْتَرُوهُنَّ[2] گانے والی کنیزوں کو نہ تو فروخت کرو اور نہ خریدو۔

غرض اسلام نے سٹہ بازی، غلے کے احتکار، ذخیرہ اندوزی، غلط ناپ تول، سود، چوری، ڈاکہ زنی، شراب فروشی اور اسی طرح شراب سازی کی ممانعت فرما دی ہے گو کہ ان سے بعض افراد کو کچھ فائدہ پہنچ سکتا ہے تاہم مجموعی حیثیت سے چونکہ مذکورہ امور معاشرہ کے لیے نقصان رساں ہیں اس لیے ان کی ممانعت کر دی گئی ہے۔

وسعت بازار

قرآن مجید میں بری اور بحری حمل و نقل کی ان سہولتوں کا ذکر ہے

---

[1] ۔ترمذی، ابواب البیوع ج ۵ صفحہ ۲۸۳ نیز ھدایہ ج ۳ کتاب البیوع فصل فی ما یکرہ۔

[2] ۔ترمذی، ابواب البیوع ج ۵ صفحہ ۱۰۱ مطبوعہ مصر بروایت ابو امامہ۔

جن سے ایک ملک کی تجارت دوسرے ملک سے ہوتی ہے ان سے مقامی اور غیر مقامی، قومی اور بین الاقوامی ہر قسم کی تجارتی تعلقات کی طرف بھی اشارہ ہوتا ہے[1] پھر حدیثوں میں بطور پیشین گوئی کے آنحضرت صلعم نے فرمایا ہے کہ "صنعاء (پایۂ تخت یمن) سے حجاز تک ایک عورت سونا اچھالتی ہوئی آئے گی۔" پھر سڑکوں کی درستی کی طرف اس طرح راہ نمائی کی گئی ہے۔

اَمَاطَةُ الاَذیٰ عَنِ الطَّرِیقِ صَدَقَةٌ[2] — راستہ سے ایذا دینے والی چیز کا دُور کر دینا گویا صدقہ دینا ہے۔

حتیٰ کہ قرآن مجید میں جہاں کہیں ابن السبیل کا ذکر ہے اس میں راستوں کی درستی و حفاظت پلوں کی تیاری وغیرہ داخل سمجھے گئے ہیں۔

ان سہولتوں اور امن راہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ آمد و رفت کے دائرے میں بڑی وسعت پیدا ہوئی

وسعت بازار کے متعلق بھی خلافت راشدہ کے عہد میں بہت کچھ کام کیا گیا تھا۔ حضرت عمرؓ کے عہد میں جو نہر مصر میں کھدوائی گئی تھی اس سے تجارت کی وہ گرم بازاری ہوئی کہ مصر اور مدینہ کی منڈیوں کا نرخ ایک ہو گیا[3] خلفائے راشدین خصوصاً حضرت عمرؓ نے سڑکیں تیار کرائیں نہریں بنائیں اور وہ سہولت بہم پہنچائی جو سواریوں کی تیز رفتاری میں ممد و معاون ہو۔" اس زمانہ میں تجارت بالکل آزاد تھی، درآمد پر بہت خفیف محصول لیا جاتا تھا اور غیر معاہد حکومتوں کے تاجروں سے صرف اتنا ہی محصول وصول کیا جاتا تھا جتنا اس ملک میں مسلمان تاجروں سے، درآمد کبھی ممنوع نہیں کی گئی حتیٰ کہ وہ چیزیں بھی جو مسلمانوں کے ہاں حرام تھیں غیر مسلم رعایا کے لیے برابر درآمد ہوتی رہتی تھیں[4]

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو مقالہ ہذا کا تیسرا باب "پیدائش دولت" صفحہ ۱۹۰ حمل و نقل

[2] مشکوٰۃ ج ا کتاب الایمان بحوالہ بخاری و مسلم۔

[3] "فکان سعر المدینة کسعر مصر" ذہبی؛ تاریخ کبیر ۲۳ھ کے واقعات (قلمی نسخہ) نیز تاریخ یعقوبی جلد ۲ صفحہ ۱۷۵ مطبوعہ لائیڈن۔

[4] ڈاکٹر حمید اللہ: آنحضرت اور خلفائے راشدین کا تعلق تجارت سے، رسالہ تجلی ج ا نمبر ا۔

محصول درآمد سے متعلق تفصیل تو مالیاتِ عامہ میں بیان کی جائے گی البتہ یہاں اتنا اشارہ کردینا کافی ہے کہ جو قلیل محصول درآمد وصول کیا جاتا تھا اس میں بھی بعض اوقات اقتضائے وقت اور حالات کو دیکھ کر کمی بیشی کی جاتی تھی تاکہ درآمد میں مزید اضافہ ہو۔

اِنَّ عُمَرَ بن الخَطّاب کَانَ یَاخُذُ مِنَ النَّبطِ[1] مِنَ الحِنطَةِ وَ الزَّیتِ نِصفَ العُشرِ یُرِیدُ بِذٰلِکَ اَنْ یَکثُرَ الحَملُ اِلَی المَدِینَةِ ۔	حضرت عمرؓ نبطیوں سے گیہوں اور تیل کا بیسواں حصہ لیتے تھے تاکہ مدینہ میں اس کی رسد زیادہ ہوئے
وَیَاخُذُ مِنَ القِطنِیَةِ العُشرَ[2]	اور قطنیہ (روئی کے کپڑوں) سے دسواں حصہ لیتے تھے۔

"جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں کہ کسی شے کی رسد اس کی قدر پر بہت قریبی اور گہرا اثر ڈالتی ہے۔ اگر کسی مقررہ وقت میں ایک شئے کی مقدار میں اضافہ ہو جائے تو اس کی قیمت کم ہوجاتی ہے اور اگر اس شئے کی رسد میں کمی ہوجائے تو اس کی قیمت بڑھ جاتی ہے"[3] بایں ہمہ امام ابو یوسفؒ لکھتے ہیں کہ کمی مال کے باوجود سستا ہونا اور کثرت کے باوجود مہنگا ہونا ممکن ہے۔

وَالرُّخصُ وَالغَلَاءُ بِیَدِ اللّٰہِ تَعَالٰی لَا یَقُومَانِ عَلٰی اَمرٍ وَاحِدٍ وَکَذٰلِكَ وَظِیفَةُ الدَّرَاهِمِ مَعَ اَشیَاءَ تَدخُلُ	ارزانی اور گرانی خدا کے ہاتھ میں ہے ان کی بنیاد کوئی ایک متعین شئے نہیں ہے اس کا تعلق اسی سے ہے

---

[1] ۔ نبط ایک قوم تھی جو عرب کے شمال میں عراق سے فلسطین تک پھیلی ہوئی تھی اور اس سے مراد عموماً اس علاقے کے یہودی ہوتے ہیں۔ نبط اور انباط دونوں معنے کسان کے ہوتے ہیں چنانچہ مکے کے تاجر مدینے والوں کو طنزاً انباط کہتے تھے۔

[2] ۔ امام مالکؒ موطا ، کتاب الزکوٰۃ عشر اہل الذمہ بروایت عبداللہ بن عمرؓ نیز کتاب الاموال صفحہ ۵۲۳ نمبر ۱۶۶۰ ۔

[3] ۔ ٹاسگ : اصول معاشیات جلد اول باب ۹ صفحہ ۱۶۶ ۔

فِي ذَالِكَ تَفْسِيرُهَا يَطُولُ - وَلَيْسَ لِلرُّخْصِ وَالْغَلَاءِ حَدٌّ يُعْرَفُ وَلَا يُقَامُ عَلَيْهِ - إِنَّمَا هُوَ أَمْرٌ مِنَ السَّمَاءِ لَا يُدْرَىٰ كَيْفَ هُوَ، وَلَيْسَ الرُّخْصُ مِنْ كَثْرَةِ الطَّعَامِ وَلَا غَلَاؤُهُ مِنْ قِلَّتِهِ، إِنَّمَا ذَالِكَ أَمْرُ اللّٰهِ وَقَضَاؤُهُ. وَقَدْ يَكُونُ الطَّعَامُ كَثِيرًا غَالِيًا وَقَدْ يَكُونُ قَلِيلًا رَخِيصًا [1]

اس اجمال کی تفصیل طوالت چاہتی ہے کہیں حد کو ہم گرانی اور ارزانی کے لیے مقرر نہیں کر سکتے اور نہ متعینہ حد ہمیشہ برقرار رہ سکتی ہے یعنی ایک ہی حد ہر وقت گرانی اور ارزانی کی نہیں ہو سکتی یہ صرف امر سماوی یعنے اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت کی شئے ہے غلہ کی کثرت نہ ارزاں ہونے کی علت ہے اور نہ اس کی کم پیداآوری گرانی کا حقیقی سبب یہ صرف اللہ تعالیٰ کے حکم میں ہے بہت غلہ ہو کر بھی بہت گراں ہوتا ہے اور بسا اوقات غلہ کی کمی کے باوجود نرخ ارزاں رہتا ہے۔

بازار کے ہر ایک تاجر کو حکم تھا کہ سب تاجروں کا ساتھ دے اور بازار کے بھاؤ کو برقرار رکھے تاکہ دوسرے تاجروں کو نقصان نہ پہنچے چنانچہ سعید بن المسیب بیان کرتے ہیں کہ ایک روز "حضرت عمرؓ حاطب بن ابی بلتعہ کے پاس سے گزرے وہ منقہ (زبیب) بازار میں بیچ رہے تھے حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ یا تو تم نرخ بڑھا دو یا ہمارے بازار سے اُٹھ جاؤ"[2] اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر ایک فروشندہ دوسروں کی بہ نسبت کم دام وصول کرنے پر آمادہ ہو تو تمام فرمائشیں اسی کو ملنے لگتی ہیں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دوسرے تاجر گھاٹے میں رہتے ہیں اور یوں بازار بھی نامکمل کہلاتا ہے جبکہ کسی شئے کی قیمت بازار میں ایک سی نہ ہو۔

"مسلمان بے حد سادہ زندگی بسر کرتے تھے اور خود بھی اور عمال کے ساتھ کام انجام دیتے تھے اور ارزاں ترین نرخ پر مال تیار کرتے تھے اور سستے مشتہر ہوتے تھے ان کا طریقہ یہ تھا کہ اپنے ملک کی پیداوار یا وہ چیزیں جن کو وہ مہیا کر سکتے ہیں لیے لیے ہر مقام پر جا نکلتے تھے۔ جہاں مستقل گاہک ملتے ان سے

---

[1] ابو یوسف: کتاب الخراج صفحہ ۲۸ مطبوعہ بولاق مصر
[2] امام مالک: موطا کتاب البیوع الحکرۃ والتربص۔

راست تعلقات پیدا کر لیتے۔ شام عربوں کی جولان گاہ اسی وجہ سے بنا تھا۔ یہ طریقہ اب بھی رائج ہے، یورپی اور جاپانی ایجنٹ نمونے لیے ہوئے ہر جگہ گھومتے ہیں[1]۔

راتب بندی

جنگ اور مابعد جنگ میں راتب بندی کے مسئلہ نے خاص اہمیت حاصل کر لی ہے اس لیے اس فصل میں اس کا بھی کچھ تذکرہ کیا جاتا ہے۔ عام حالات میں اسلامی حکومت غلے کے نرخ وغیرہ مقرر کرنے میں دخل نہیں دیتی تھی خود رسول کریمؐ نے یہ فرمایا تھا کہ "غلے کا نرخ مقرر کرنے والا صرف اللہ تعالیٰ ہے، وہی تنگی پیدا کرتا ہے وہی کشادگی پیدا کرتا ہے وہی روزی دینے والا ہے اور نرخ اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے[2]"۔ لیکن غیر معمولی حالات مثلاً جنگ یا قحط کے زمانے میں حکومت کو یہ اختیار حاصل ہوتا ہے کہ وہ غلے کے معاملہ کو اپنے ہاتھ میں لے کر راتب بندی کا ایسا انتظام کرے کہ ہر ایک کو غلہ مل سکے۔

یوسف علیہ السلام کے زمانہ میں راتب بندی

راتب بندی کوئی نئی چیز نہیں ہے خود قرآن مجید میں تفصیل موجود ہے کہ جب مصر میں سخت قحط پڑا تھا تو حضرت یوسف علیہ السلام نے آج سے کئی ہزار سال قبل مصر میں راتب بندی نافذ کی تھی۔ حضرت یوسفؑ نے بادشاہ مصر کے خواب کی بناء پر یہ تعبیر کی کہ اب سے سات برس بعد سات سال تک بڑا بھاری کال پڑنے والا ہے تم لوگ ان پہلے سات برس تک کے دوران میں زراعت پر خوب محنت کرو اور حاصل شدہ پیداوار میں سے ضرورت کے موافق کھاؤ اور ضرورت سے زیادہ غلے کو قحط کے دنوں کے لیے ذخیرہ کرتے جاؤ اور غلّے کو اس کی بالوں میں ہی رہنے دو تاکہ غلہ خراب نہ ہو[3]۔

شاہ مصر نے ان کی گفتگو سے خوش ہو کر ان سے خواہش کی کہ خزانے اور

---

[1] ڈاکٹر حمید اللہ: آنحضرتؐ اور خلفائے راشدین کا تعلق تجارت سے رسالہ تجلی ج ۱ نمبر ۱۔
[2] ترمذی ج ۶ ابواب البیوع صفحہ ۵۳۔ [3] قرآن پ۱۳ سورۂ یوسف ع ۲۲ ملاحظہ ہو۔

رسد کا کام اپنے ذمہ لیں۔
غرض حضرت یوسف علیہ السلام مصر کے وزیر مال اور رسد بن کر سات سال تک غلہ کا ذخیرہ کرتے رہے اور بعد کے سات سال تک راشن بندی کا انتظام کرتے رہے جس کا تذکرہ قرآن مجید اور نیز توریت میں بھی موجود ہے۔[۱]

---

[۱] ۔ قرآن مجید اور توریت میں حضرت یوسف علیہ السلام کو ایک بڑے معاملہ فہم معاشی کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ توریت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے مصر سے رفتہ رفتہ زمینداری نظام کو صرف اپنے حسن تدبیر سے ختم کر دیا اور مصر کی تمام اراضی اور مویشی وغیرہ کو شاہی یا بالفاظ دیگر سرکاری ملک قرار دیا اور کاشت کاروں سے لگان وصول کرنے لگے "اور یوسف علیہ السلام نے ساری نقدی جو ملک مصر اور کنعان کی سرزمین میں موجود تھی اس غلہ کے بدلے میں جو لوگوں نے مول لیا جمع کی اور یوسف علیہ السلام اس نقدی کو فرعون کے گھر لے آئے۔"
"اور جب ملک مصر اور کنعان کی سرزمین میں نقدی کم ہوئی تو سارے مصریوں نے آکر یوسف علیہ السلام سے کہا کہ ہمیں روٹی دے کہ تیرے ہوتے ہوئے ہم کیوں بھوکے مریں کیونکہ نقدی ختم ہو گئی۔ یوسف علیہ السلام نے کہا کہ اپنے مویشی دو۔ اگر نقدی ختم ہو گئی ہے تو میں تمہارے مویشیوں کے بدلے تمہیں دونگا۔ وہ اپنے مویشی یوسف علیہ السلام کے پاس لے آئے اور یوسف علیہ السلام نے گھوڑوں بھیڑ بکری اور گائے بیل کے گلوں اور گدھوں کے بدلے ان کو روٹیاں دیں اور اس نے ان کے سب چوپایوں کے بدلے میں انھیں اس سال پالا۔"
"جب وہ سال بھی گذر گیا تو وہ دوسرے سال اس کے پاس آئے اور اس سے کہا کہ ہم اپنے مالک سے نہیں چھپاتے کہ ہمارا روپیہ پیسہ ختم ہو چکا۔ پھر ہمارے سردار نے ہمارے مویشیوں کے گلے بھی لیے اور ہمارے مالک کی نگاہ میں ہمارے جسموں اور زمینوں کے سوا کچھ باقی نہیں۔ پس ہم اپنی زمین سمیت تیری آنکھوں کے سامنے کیوں ہلاک ہوں۔ ہم کو اور ہماری زمین کو روٹی پر مول لے اور ہم اپنی زمین سمیت فرعون کے خادم بنکر رہیں گے اور ہمیں بیج دے تاکہ ہم جیئیں اور زمین کہ زمین ویران نہ ہو جائے۔"
"اور یوسف علیہ السلام نے ساری زمین فرعون کے لیے مول لی کیونکہ مصریوں میں سے ہر شخص نے اپنی زمین بیچی کیونکہ کال نے انھیں بڑا مجبور کر دیا تھا غرض وہ زمین فرعون کی ہو گئی اور لوگوں کو اس نے شہر دینا مصر کی اطراف کی ایک حد سے دوسری حد تک بسا دیا۔ اس نے صرف پجاریوں کی زمین مول نہ لی کیونکہ

رسول کریمؐ کے زمانہ میں راتب بندی ہجرت مدینہ کے بعد رسول کریمؐ نے قریشی تجارت کو نیچا دکھانے کے لیے ان کی معاشی ناکہ بندی شروع کی۔ اس ناکہ بندی کے لیے آپ مختلف لشکروں کو قریشی قافلوں کی گھات میں لگے رہنے کے لیے بھجوایا کرتے تھے ایک مرتبہ ایک لشکر میں غلہ ختم ہو گیا مجبور ہو کر سپہ سالار لشکر حضرت ابو عبیدہؓ نے راتب بندی جاری کی چنانچہ حضرت جابر بن عبداللہؓ کا بیان ہے کہ رسول کریمؐ نے ایک مرتبہ ایک لشکر سمندر کے کنارے بھیجا اور ان پر ابو عبیدہ بن الجراحؓ کو سردار لشکر مقرر کیا، اس لشکر میں تین سو آدمی تھے، میں بھی ان ہی میں تھا غرض ہم چلے یہاں تک کہ راستہ کے کسی مقام پر زاد راہ ختم ہو گیا۔ ابو عبیدہؓ نے حکم دیا کہ اس لشکر میں جتنا زاد راہ ہو سب جمع کر لیا جائے جب وہ سب اکھٹا کر لیا گیا تو وہ کھجوروں کی دو گٹھریوں سے زیادہ نہ نکلا اس لیے اس میں سے روزانہ تھوڑی تھوڑی کھجوریں دیتے تھے یہاں تک کہ وہ بھی ختم ہو گئیں۔ ہمیں ایک ایک کھجور ملتی تھی میں کہتا تھا کہ ایک کھجور کیا کافی ہو گی۔ حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ اس کی قدر ہم کو اس وقت معلوم ہوئی جب وہ بھی ہو گئی [1]

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) وہ پجاری فرعون کی دی ہوئی جاگیر رکھتے تھے اور اپنی جاگیر جو فرعون نے انھیں دی تھی کھاتے تھے اس لیے انھوں نے اپنی زمینوں کو نہ بیچا۔"

تب یوسفؑ نے لوگوں سے کہا دیکھو میں نے آج کے دن تم کو اور تمہاری زمین کو فرعون کے لیے مول لیا تو یہ بیج تمھارے لیے ہے کھیت میں غلہ بوؤ اور جب یہ اناج زیادہ ہو تو اس میں سے پانچواں حصہ فرعون کا ہو گا اور چار حصے کھیت میں بیج بونے کے لیے اور خود تمھاری خوراک اور تمھارے گھر والوں اور تمھارے بچوں کی خوراک کے لیے ہوں گے، وہ بولے کہ تو نے ہماری جانیں بچا لیں، ہم اپنے خداوند کی نظر میں رحم کے سزاوار ہیں اور ہم فرعون کے خادم ہوں گے اور یوسفؑ نے ساری مصر کی زمین کے لیے یہ آئین جو آج تک جاری ہے مقرر کیا کہ فرعون پانچواں حصہ لے مگر فقط پجاریوں کی زمین فرعون کی نہ ہوئی۔" (توریت: پیدائش باب ۴۷ نمبر ۱۴ تا ۲۶)۔

[1] - بخاری پ ۹ کتاب الشرکت نیز بخاری پ ۱۷۔

اس کے علاوہ حدیبیہ اور تبوک کی دوسری بہت سی نظیریں حدیثوں اور تاریخوں میں ملتی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ خود رسول کریمؐ کو بھی اس قسم کے واقعات جنگ کے دوران میں پیش آئے اسی لیے آپ کو راتب بندی کرنی پڑی چنانچہ سلمہ بن الاکوعؓ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ "ہم رسول کریمؐ کے ہمراہ لڑائی پر نکلے۔ وہاں ہمیں کھانے کی تکلیف ہوئی اور ہم نے اپنے چند اونٹوں کو ذبح کرنے کا ارادہ کیا۔ رسول کریمؐ نے ہمیں حکم دیا کہ ہم اپنے توشوں کو حاضر کریں چنانچہ ایک چمڑا بچھایا اور اس پر سب لوگوں کے توشے اکٹھے ہوئے ہم چودہ سو آدمی تھے پھر سب لوگوں نے خوب پیٹ بھر کر کھالیا اس کے بعد اپنے اپنے توشہ دان بھر لیے"[۱]

حضرت عمرؓ کے زمانہ میں راتب بندی

حضرت عمرؓ کی خلافت کا زمانہ تھا ۱۸ھ میں حجاز میں بڑا سخت قحط پڑا جو اسلامی تاریخوں میں عام الرمادہ کے نام سے مشہور ہے۔ حضرت عمرؓ نے بڑی جانفشانی سے غلہ کا انتظام فرمایا اور اپنے مختلف صوبہ داروں کے نام غلہ کی رسد روانہ کرنے کے لیے احکام بھیجے عمرو بن العاصؓ (گورنر مصر) نے جواب میں لکھا کہ "میں اتنے اونٹوں پر غلہ لدوا کر بھیج رہا ہوں کہ جب اس قطار کا پہلا اونٹ مدینہ منورہ پہنچے گا تو آخری اونٹ مصر سے نکل رہا ہو گا"[۲] حضرت عمرؓ نے سمندر کی راہ سے مدینہ کو جار کی بندرگاہ پر غلہ روانہ کرنے کے لیے لکھا تاکہ عام مسلمانوں کے لیے کافی ہو۔ عمرو بن العاصؓ نے بحیرۂ قلزم کی راہ سے بیس جہاز روانہ کیے اور ہر ایک جہاز پر کم و بیش تین تین ہزار اردب[۳] غلہ تھا۔ یہاں تک کہ جب یہ (مدینہ کی بندرگاہ)

۱۔ مسلم کتاب اللقطہ باب: استحباب خلط الازواد اذا قلت والمواساۃ فیہا، بیہقی کی روایت میں ہے یہ واقعہ غزوہ حدیبیہ کا ہے۔

۲۔ سیوطی: حسن المحاضرہ فی اخبار مصر والقاہرہ نیز ابن عبدالحکم: فتوح مصر نیز ابن سعد ج ۳ صفحہ ۲۲۴۔

۳۔ ایک اردب کم و بیش دو من کا ہوتا ہے۔

جار پر لنگر انداز ہوئے تو خود حضرت عمرؓ چند صحابہ کے ساتھ جار کی بندرگاہ پر تشریف لے گئے، جہازوں کو دیکھا۔ پھر جس کے ذمہ غلہ سپرد کرنا تھا اس کے ذمہ داری کیا تحویل کیا اور غلہ رکھنے کے لیے وہاں دو بڑے بڑے گودام بنوائے اور زید بن ثابتؓ کو حکم دیا کہ لوگوں کے نام ان کے مرتبہ کے موافق لکھے جائیں پھر

وَاَمَرَهٗ اَنْ يَكْتُبَ لَهُمْ صِكَاكًا مِنْ قَرَاطِيسَ ثُمَّ يَخْتِمُ اَسَافِلَهَا۔ فَكَانَ اَوَّلُ مَنْ صَكَّ وَخَتَمَ اَسْفَلَ الصِّكَاكِ [۱]

آپ نے انھیں حکم دیا کہ لوگوں کے لیے کاغذوں پر چک (صک یہاں مراد کوپن) لکھے جائیں پھر اس کے نیچے مہر کی جائے۔ اور پہلے پہل آپ ہی نے چک جاری کیے اور چکوں کے نیچے مہر ثبت کی۔

مورخین نے اور خاص کر ابن سعد نے راتب بندی کے انتظامات کے متعلق بہت دلچسپ واقعات لکھے ہیں [۲] مثلاً خود امیر المومنین حضرت عمرؓ نے گوشت کھانا ترک کر دیا تھا اور گھی کی جگہ صرف تیل کا استعمال کرتے تھے جس سے امیر المومنین کے چہرہ کی رنگت بدل گئی تھی، جو لوگ دار الخلافہ (مدینہ) تک نہیں پہنچ سکتے تھے انھیں مہینہ پر آٹا، کھجوریں وغیرہ گھر، گھر بھجواتے تھے اور تمام گاؤں والوں کے لیے سامان سے لدے ہوئے اونٹ بھیجے جاتے تھے۔

حضرت امیر معاویہؓ کے زمانہ میں راتب بندی

حضرت امیر معاویہؓ کی امارت میں جبکہ مروان بن الحکم (المتوفی ۶۵ھ) مدینہ میں گورنر تھا تو وہاں راتب بندی جاری کر کے کوپن تقسیم کیے گئے تھے۔ کچھ لوگ ان کوپنوں کو بیچ ڈالتے تھے جیسے آج کل پٹرول اور شکر کے کوپن چور بازار میں بیچے جاتے ہیں۔

---

[۱] ۔ تاریخ یعقوبی ج ۲ صفحہ ۱۷۷ مطبوعہ لیڈن

[۲] ۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو طبقات ابن سعد ج ۳ صفحہ ۲۲۱ تا ۲۳۴ مطبوعہ لیڈن نیز تاریخ طبری صفحہ ۲۷۵۳ مطبوعہ لیڈن۔

اِنَّ صُکُوکًا خَرَجَتْ لِلنَّاسِ فِی زَمَانِ مَرْوَانَ بْنِ الْحَکَمِ مِنْ طَعَامِ الْجَارِ فَتَبَایَعَ النَّاسُ تِلْکَ الصُّکُوکَ بَیْنَھُمْ قَبْلَ اَنْ یَّشْتَوْفُوْھَا۔

مروان بن حکم کے زمانے میں لوگوں کو جارکی بندرگاہ کے غلے کے چک (یعنی کوپن) کے جاری کیے گئے لوگوں نے ان چکوں کو ایک دوسرے کے ہاتھ غلے کو اپنے قبضہ میں لانے سے پہلے ہی بیچ ڈالا۔

فَدَخَلَ زَیْدُ بْنُ ثَابِتٍ وَرَجُلٌ مِنْ اَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰہِ عَلٰی مَرْوَانَ بْنِ الْحَکَمِ فَقَالَا: اَتُحِلُّ بَیْعَ الرِّبَا یَا مَرْوَانُ؟

زید بن ثابتؓ اور رسول اللہ کے ایک اور صحابی مروان کے پاس گئے اور اس سے کہا کہ اے مروان! کیا تو نے ربا کو جائز کر دیا؟

فَقَالَ: اَعُوْذُ بِاللّٰہِ وَمَا ذَالِکَ. فَقَالَا: ھٰذِہِ الصُّکُوْکُ تَبَایَعَھَا النَّاسُ ثُمَّ بَاعُوْھَا قَبْلَ اَنْ یَّشْتَوْفُوْھَا۔

اس نے کہا معاذ اللہ! یہ تم کیا کہتے ہو۔ انھوں نے کہا کہ یہ اتنے کوپن ہیں جن کو لوگوں نے خرید کر دوبارہ غلہ لینے سے پہلے ہی بیچ ڈالا۔

"مروان نے چوکیداروں کو روانہ کیا کہ وہ لوگوں سے ان کو چھین کر کوپن والوں کے حوالے کر دیں"[1]

تاجروں کی مجلس

ہارون الرشید کے عہد میں "تاجروں کی مجلسیں قائم کر دی گئی تھیں جن کا فرض یہ تھا کہ تجارتی معاملات کی جانچ اور فریب و دغابازی کا انسداد کریں"[2]

---

[1] - امام مالک: موطا کتاب البیوع۔

[2] - موسیو لی بان: تمدن عرب، مترجمہ سید علی بلگرامی باب دوم فصل اول صفحہ ۷۰ مطبوعہ مفید عام آگرہ ۱۸۹۸ء۔

(۲) مبادلۂ دولت کے انتظامات

زر - اعتباری تمسکات - بیت المال

الف زر

سکہ کی ابتداء تمدن کے ابتدائی دور میں چیزیں چیزوں سے بدلی جاتی ہیں اور جب زندگی کی ابتدائی منزلیں طے ہو جاتی ہیں تو کسی نہ کسی آلہ مبادلہ کے استعمال کی ابتدا ہوتی ہے[۱]۔ اسلام میں اور اسلام سے پہلے بطور زر پیسوں کے بدلے میں چیزیں استعمال کی جاتی تھیں انڈے، روٹی کے ٹکڑے، چاندی، درختوں کی چھال، سمندر سے نکلی ہوئی کوڑیاں ان کے علاوہ اور اور چیزیں بھی[۲]۔ لیکن انسان سونے چاندی کے ڈھیر کا بڑا دلدادہ تھا اس لیے آخر ان کی چند خوبیوں کی بنا پر ان دونوں دھاتوں کا آلہ مبادلہ کے طور پر رواج ہوا۔

سکہ کی تعریف عربی زبان میں "سکہ" ٹھپے کو کہتے ہیں جو لوہے کا بنایا جاتا ہے اور درہم و دینار اس میں مسکوک ہوتے ہیں لیکن پھر مجازاً سکہ کے نقش کو بھی سکہ ہی کہنے لگے یعنے ان حروف اور تصویروں کو جو درہم پر نقش کی جاتی ہیں[۳]۔

پروفیسر جیونز کے الفاظ میں "سکے دھات کے ایسے ٹکڑے ہوتے ہیں

---

[۱] ٹاسگ: اصول معاشیات ج ۱ باب ۴ صفحہ ۱۱۰/۱۱۵

[۲] مقریزی: النقود الاسلامیہ صفحہ ۱۸ مطبوعہ قسطنطنیہ

[۳] مقدمہ ابن خلدون صفحہ ۲۴۴ مختصات السلطانیہ نیز ماوردی: الاحکام السلطانیہ باب ۱۴ صفحہ ۱۴۹

جن کے وزن اور کھرے پن کی تصدیق ان نقوش کے اعتبار سے ہوتی ہے جو ان ٹکڑوں کی سطحوں پر ثبت کیے جاتے ہیں[1]

پُرانے زمانہ میں سکہ سازی کا جو طریقہ تھا اس کو مورخ ابن خلدون نے یوں بیان کیا ہے کہ "ٹھپہ میں اولٹی تصویریں یا دوسرے کلمات کھدے ہوئے ہوتے ہیں اور جب درہم و دینار کو ٹھپہ میں رکھ کر گھن کی چوٹ لگاتے ہیں تو وہ تصویریں یا حروف درہم و دینار کے گول ٹکڑوں پر سیدھے اُتر آتے ہیں اس سے پہلے کہ درہم و دینار کے گول ٹکڑوں کو ٹھپہ میں سے نکالا جائے یکے بعد دیگرے سیم و زر کو پگھلا کر ان کی چاشنی اچھی طرح دیکھ لی جاتی ہے کہ آیا مقررہ معیار پر ہے یا نہیں اور ٹکیاں وزن معین اصطلاحی میں پوری ہیں یا کم و بیش ان مدارج کی دیکھ بھال کے بعد جب درہم و دینار مسکوک ہو جاتے ہیں تو از روئے شمار لوگ ان سے اپنے معاملات طے کرتے ہیں"[2]

سکہ کی قدامت قرآن مجید میں بتایا گیا ہے کہ آج سے کئی ہزار برس پہلے دنیا میں سکہ کا رواج ہو چکا تھا چنانچہ اصحاب کہف کے قصہ میں یہ تذکرہ ہے

فَابْعَثُوا أَحَدَكُم بِوَرِقِكُمْ هَٰذِهِ إِلَى الْمَدِينَةِ فَلْيَنظُرْ أَيُّهَا أَزْكَىٰ طَعَامًا فَلْيَأْتِكُم بِرِزْقٍ مِّنْهُ۔	کسی ایک کو اپنا یہ روپیہ دے کر شہر بھیجو تاکہ وہ دیکھے کہ کونسا کھانا اچھا ہے، پس تمھارے لیے اس میں سے کچھ غذا لے آئے۔
پ ۱۵ الکہف ۱۸ ع ۳	

یوسف علیہ السلام کے قصے میں بھی چاندی کے کھوٹے سکوں کا کچھ ذکر ہے

وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍ بَخْسٍ دَرَاهِمَ[3] مَعْدُودَةٍ وَكَانُوا فِيهِ مِنَ الزَّاهِدِينَ۔	انھوں نے اس کو گنتی کے کچھ درہموں میں بیچ ڈالا اور وہ اس سے بیزار تھے۔
پ ۱۲ یوسف ۱۲ ع ۲	

---

[1] جیونز: منی اینڈ میکانزم آف ایکسچینج باب ۸ صفحہ ۵۔ [2] مقدمہ ابن خلدون صفحہ ۲۴۷ مختصات السلطانیہ۔ [3] دراہم، واحد درہم۔ درم (فارسی) اور یونانی زبان میں (Drachma) چاندی کا سکہ۔

اسی طرح شعیب علیہ السلام کی قوم کے تذکرے میں ہے کہ وہ سکوں کو کاٹتے تھے[1]

اسلام میں سکہ کی اہمیت

رسول کریمؐ کے طرزِ عمل سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بارٹر کے طریقہ کو بتدریج کم کرکے آپ زر سے مبادلہ کے طریقہ کو رائج کرنا چاہتے تھے[2] اس طرح زر اشیاء کے قدر کے لیے معیار ٹھیرا جس کے ذریعہ لوگ لین دین کے معاملے طے کیا کرتے ہیں۔

اسلامی شریعت میں زر کی اس وجہ سے بھی اہمیت ہے کہ اس کے ذریعہ زکات، مہر، حدود، ہرجانہ اور تاوان جیسی قانونی ضرورتوں میں درہم و دینار سے کام لیا جاتا ہے نیز خراج (لگان) جزیہ اور عشر (محصول کروڑگیری) وغیرہ جیسے دوسری قسم کے محصول زر ہی کی شکل میں وصول کیے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ اجرت، مضاربت اور شرکت وغیرہ جیسے معاہدہ کے لیے بھی فقہائے بدل کو ضروری قرار دیا ہے جس کا معیار عموماً زر ہی ہوتا ہے۔

"تسکیک کا منصب ملک و سلطنت کے لیے ضروری ہے کیونکہ یہی وہ منصب ہے جو لوگوں میں قلب و دغل کے رواج کو روک کر خالص سکوں کو رواج دیتا ہے اور سلطانی سکہ کے لیے کھوٹ سے محفوظ ہونے کا ثبوت ہوتا ہے"[3]

اسلامی سکہ کی ابتداء

زمانہ جاہلیت میں طائف، مکے اور مدینے کے بازاروں میں خرید و فروخت میں عام طور پر رومی دینار (سونے کا سکہ) اور ایرانی درہم (چاندی کا سکہ) اور کچھ یمنی سکوں خاص کر تانبے کے سکوں کا رواج تھا، چونکہ لوگ ان کے کونے کتر لیتے تھے اس لیے عرب ان سکوں کو بجائے شمار کے وزن کے اعتبار سے تول کر خرید و فروخت کرتے تھے[4]

اسلام کی ابتداء میں یہی سکے رائج تھے اور رسالتمآبؐ کے عہد مبارک اور

---

[1] ملاحظہ ہو تفسیر طبری ج ۱۲ آیت: وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ أَشْيَاءَهُمْ۔
[2] تفصیل اس باب کے ابتدائی حصہ میں گذر چکی۔ [3] مقدمہ ابن خلدون صفحہ ۲۱۲، المختصات السلطانیہ۔ [4] پہلے باب میں صفحہ ۶۹ پر تفصیل گذر چکی۔

عہدِ صدیقی میں بھی انہی سکوں کا رواج رہا۔

جب امیر المومنین حضرت عمرؓ خلیفہ ہوئے اور اللہ نے ان کے ہاتھ پر مصر، شام اور عراق فتح کیا تو انھوں نے بھی سکوں کے معاملے میں پہلے کچھ دخل نہ دیا۔ "سنہ ۱۸ھ میں حضرت عمرؓ نے ہر شخص کے لیے ایک جریب غلہ اور دو درہم مقرر کرنے کا انتظام کیا اور اسی زمانہ میں آپ نے درہم (چاندی کے سکے) جاری کیے اور ان کا نقش اور سکوں کی وضع کسریٰ شاہ ایران کے سکے کی سی تھی، انھوں نے بعض سکوں پر "الحمد للہ" اور بعض پر "محمد رسول اللہ" اور بعض سکوں پر "لا الہ الا اللہ وحدہ" کندہ کرایا تھا، حضرت عمرؓ کے آخر زمانہ میں دس درہموں کا مجموعی وزن چھ مثقال کے برابر رکھا گیا[1] خود حضرت عمرؓ نے سکہ کا وزن مقرر کیا تھا" "ایران میں تین قسم کے درہم تھے، آٹھ دانگ کا بغلی، چار دانگ کا طبری، تین دانگ کا مغربی اور ایک دانگ کا یمنی تو حضرت عمرؓ نے حکم دیا کہ سب سے اعلیٰ اور سب سے ادنیٰ کو جن کا زیادہ چلن ہو جمع کر و، بغلی اور طبری چونکہ زیادہ چلتے تھے ان کا مجموعہ بارہ دانگ ہوا، دونوں کو ملا کر ان کا نصف چھ دانگ لے کر اسلامی درہم ڈھلوائے گئے اور چھ دانگ کا اسلامی درہم قرار پایا[2]

"پھر حضرت عثمانؓ نے بھی اپنی خلافت کے دوران میں درہم مضروب کرائے جن پر "اللہ اکبر" کندہ تھا[3]

تاریخی واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ یہ سکے گنتی میں کم ڈھالے جاتے تھے نیز قدیم سلطنتوں کے سکے منسوخ بھی نہیں کیے گئے بلکہ ساتھ ساتھ وہ بھی چلتے ہی رہے البتہ "حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ بیت المال کے کھوٹے سکوں کی کھوٹ نکلوا کر ان کو خالص چاندی کا سکہ بنا دیتے تھے[4]

---

[1] تقی الدین احمد المقریزی: النقود الاسلامیہ صفحہ ۵ مطبوعہ قسطنطنیہ۔

[2] ماوردی: الاحکام السلطانیہ باب ۱۲ صفحہ ۱۴۷ نیز ابویعلی: الاحکام السلطانیہ صفحہ ۱۶۲

[3] المقریزی: النقود الاسلامیہ صفحہ ۵ [4] بلاذری: فتوح البلدان صفحہ ۴۶۹۔

بہر حال عہد فاروقی میں سکوں کا یہی حال رہا، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کی خلافت میں بھی سکوں کی طرف کسی خاص توجہ کا پتہ نہیں چلتا بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ خالد بن ولیدؓ نے بھی فوجی ضرورتوں کے لیے تانبے کے سکے ڈھلوائے تھے۔

امیر معاویہؓ کے سکے

تاریخوں میں امیر معاویہؓ کے زمانہ کے اس عجیب و غریب واقعہ کا ذکر ہے۔

وَضَرَبَ مَعَاوِيَةُ اَيضاً دَنَانِيْرَ عَلَيهَا تِمْثَالٌ مُتَقَلِّدٌ سَيفاً[1]

حضرت معاویہؓ نے دینار (سونے کے سکے) بھی ضرب کرائے جن پر ~~ان~~ کی شبیہ تلوار لٹکائے ہوئے بنی ہوئی تھی۔

عبداللہ بن زبیرؓ کے سکے

حضرت معاویہؓ کے بعد کچھ عرصہ تک مسلمانوں میں خانہ جنگی ہوتی رہی اور خلافت کے مختلف دعویدار پیدا ہوئے۔ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے مکہ میں خلافت کا دعویٰ کیا اور عراق وغیرہ پر قبضہ کر لیا" عبداللہ بن زبیرؓ کے حکم سے ٧٠ھ میں مصعب بن زبیر نے ایرانی درہموں کے نمونے پر درہم ڈھلوائے جن پر "اللہ" اور برکت کے کلمات کندہ کیے گئے تھے[2] نیز "مصعب نے درہموں کے ساتھ دینار بھی ضرب کرائے[3]

عبدالملک کے سکے

بہر حال سب سے پہلے اسلامی سکہ کی تاریخ میں عبدالملک بن مروان اموی خلیفہ کا نام اہمیت کے ساتھ لیا جاتا ہے ٧٦ھ میں اس نے بڑے پیمانہ پر سونے اور چاندی کے نقش زدہ سکے رائج کیے[4] اور ساتھ ہی ساتھ قدیم غیر اسلامی سکوں کو منسوخ قرار دیا اس سے پہلے یہ

---

[1] مقریزی: النقود الاسلامیہ صفحہ ۵ ۔ [2] بلاذری: فتوح البلدان صفحہ ٤٦٨ نقود نیز ماوردی: احکام السلطانیہ باب ١٣ صفحہ ١٤٨ نیز ابو یعلی احکام السلطانیہ صفحہ ١٦٥

[3] ۔ بلاذری: فتوح البلدان صفحہ ٤٦٩ نقود، بروایت واقدی ۔

[4] ۔ فتوح البلدان صفحہ ٤٦٧ نقود ۔

ہوتا تھا کہ اسلامی سکے جاری ہوئے ان میں سے اچھے سکے جلد بازار سے غائب ہو جاتے تھے اور ناقص زر بازار میں رہ جاتا تھا نیز یہ سکے کم ڈھالے جاتے تھے اس لیے بعض مورخین کو یہ غلط فہمی ہوئی کہ عبدالملک نے ہی سب سے پہلے دینار اور درہم جاری کیے لیکن یہ بات واقعات کے خلاف ہے چنانچہ " وہب بن کیسان کا بیان ہے کہ میں نے عبدالملک کے نقش زدہ درہم و دینار سے پہلے کے سادہ درہم و دینار دیکھے ہیں وہ عبدالملک کے منقوش درہموں کے ہم وزن تھے[1] البتہ عبدالملک نے سکہ میں خاص اصلاحیں کیں اور نقش زدہ سکے جاری کیے اور ساتھ ہی" اس نے زمانہ جاہلیت کے سکوں کو نیست و نابود کرکے دوسرے نئے سکے بنوائے[2]

" عبدالملک نے دیناروں (سونے کے سکوں) پر آیات کلام اللہ لکھوا کر مسکوک کرائے مصعب کا قول ہے کہ عبدالملک کے دینار کی ایک طرف " قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ " لکھا ہوا تھا اور دوسری طرف "لا اله الا الله" اور اس کے گرد چاندی کا حلقہ بنا ہوتا تھا اور اس میں ضرب شہر " فلاں " اور حلقہ کے باہر " مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللّٰهِ اَرْسَلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ " لکھا رہتا تھا[3]

اسلامی سکہ کی اجرائی کی وجہ

مورخین نے ان دیناروں کے جاری ہونے کی یہ وجہ لکھی ہے کہ " قراطیس (ایک قسم کے کاغذ جو مصر میں بنتے تھے) مصر کی سرزمین سے روم کے شہروں کو جاتے تھے اور روم سے عربوں کے پاس دینار آتے تھے پھر عبدالملک نے اس تحریر کی ابتدا کی جو طوامیر (مراسلوں) کے سروں پر قل ہو اللہ احد وغیرہ ذکر الٰہی کے قسم سے لکھی جاتی تھی۔ اس پر روم کے بادشاہ نے اس کو لکھا کہ تم نے اپنے قراطیس پر

۱۔ بلاذری: فتوح البلدان صفحہ ۴۶۷ نقود بروایت واقدی

۲۔ مقدمہ ابن خلدون صفحہ ۲۴۸ مختصات السلطانیہ وعلامتہا۔

۳۔ سیوطی: تاریخ الخلفاء صفحہ ۸۳ عبدالملک بن مروان۔ مطبوعہ مصر۔

ایسے کلمے لکھنے شروع کیے ہیں جن کو ہم ناپسند کرتے ہیں اگر تم ان کا لکھنا چھوڑ دو تو بہتر ہے ورنہ ہم دیناروں پر تمھارے نبی کی نسبت کچھ ایسا لکھنا شروع کر دیں گے جو تمھارے لیے ناپسندیدہ ہوگا۔ راوی کا بیان ہے کہ عبدالملک پر یہ بات بہت شاق گزری۔ اسے ایک ایسی سنت حسنہ کا چھوڑنا جسے وہ جاری کر چکا تھا بہت ناگوار ہوا۔ اس نے خالد بن یزید بن معاویہ کو بلایا[1] اور اس سے کہا کہ (اے ابو ہاشم!) ایک بڑی مشکل آپڑی ہے یہ کہہ کر پورا واقعہ بیان کیا۔ اس نے کہا کہ اے امیرالمومنین! آپ اندیشہ نہ کیجئے۔ ان کے دیناروں سے کاروبار کرنے کی ممانعت فرما دیجئے۔ اپنے ہاں سکے ڈھلوائیے اور ان کافروں کو اس چیز سے الگ رہنے نہ دیجئے، جو کہ وہ مراسلوں (طوامیر) میں پسند نہیں کرتے۔ عبدالملک نے کہا کہ تم نے میری مشکل آسان کر دی خدا تمھاری مشکل آسان کر دے!

"خالد بن یزید نے عبدالملک کو رومیوں کے دیناروں سے کاروبار کی ممانعت نیز قراطیس کی قسم سے کسی چیز کے روم کے شہروں میں جانے کی بندش کا مشورہ دیا تھا، چنانچہ ایک زمانہ تک قراطیس کا وہاں جانا بند رہا"[2]

الغرض عبدالملک نے "دو سکوں کی تشکیل کے لیے حجاج بن یوسف کو لکھا جو اس وقت عراق میں تھا چنانچہ اس نے سکّے ڈھلوائے اور انھیں مدینہ منورہ روانہ کیا جہاں اس وقت تک کئی صحابہ کرامؓ زندہ تھے انھوں نے اس کو تو ناپسند نہیں کیا البتہ اس کے نقش کو اس لیے ناپسندیدہ ٹھیرایا کہ اس میں تصویر بنی ہوئی تھی۔ سعید بن المسیبؒ برابر ان کی خرید و فروخت کرتے تھے اور انھیں یہ بات ناگوار نہ تھی"[3]

---

[1] دمیری نے لکھا ہے کہ اس مشکل کو حل کرنے کے لیے عبدالملک نے حضرت امام باقر علیہ السلام کو بلایا تھا اور انھوں نے یہ مشورہ دیا۔ دوسری روایتوں میں اور لوگوں کے نام بھی ہیں۔

[2] بلاذری: فتوح البلدان صفحہ ۲۴۰ قراطیس کا معاملہ۔ نیز عسکری کتاب الاوائل نیز سیوطی تاریخ الخلفاء صفحہ ۳۰۸ عبدالملک بن مروان۔ مطبوعہ مصر۔

[3] مقریزی النقود الاسلامیہ صفحہ ۶۔

"تشکیک کا یہ واقعہ عام الجماعت ۷۴ھ کا ہے"[1]

سکہ ڈھالنے کے انتظامات

"حجاج نے ایرانیوں کے تشکیکی عمل کی نسبت لوگوں سے پوچھا پھر دارالضرب قائم کیا اور اس میں طباع جمع کیے مختلف صوبوں سے جو مال اس کے پاس آتا یا خراب ناقص اور جعلی سکوں سے جو سونا چاندی نکالی جاتی اس سے وہ سلطان (عبدالملک) کے لیے سکے ڈھلواتا تھا۔ پھر اس نے حکم دیا کہ تاجر وغیرہ اجرت دے کر درہم مسکوک کرا سکتے ہیں، اس نے یہ اُجرت سرکاری آمدنی قرار دی وہ اسی سے صنّاعوں اور طبّاعوں کو اجرتیں دیتا تھا اور فاضلات کو ابواب شاہی میں داخل کرتا تھا، اس نے بنظر احتیاط ٹھپہ لگانے والوں کے ہاتھوں پر مہریں لگا دی تھیں"[2]

"پھر جب یزید بن عبدالملک کی جانب سے عمر ابن ھبیرہ عراق کے گورنر ہوئے تو انھوں نے خالص چاندی استعمال کرنے کا اپنے پیشرو سے زیادہ اہتمام کیا۔ عمدہ اور خوشنما درہم ڈھلوائے اور مبادلہ کے لیے زیادہ سخت قاعدے بنائے گئے"

"اس کے بعد ہشام بن عبدالملک کی جانب سے خالد بن عبداللہ البجلی عراق کے گورنر ہوئے تو انھوں نے سکوں کے معاملہ میں ابن ھبیرہ سے بھی زیادہ سختی کی اور امور تشکیک کو نہایت منظم اور محکم کر دیا"

"اس کے بعد یوسف بن عمر گورنر ہوئے تو انھوں نے طباعین و اصحاب عیار (صرافوں) پر بڑی سختی کی۔ ان کے ہاتھ کاٹے اور ان کی جلد پر داغ لگائے اسی وجہ سے بنو امیہ کے بہترین سکے ھبیری، خالدی اور یوسفی سمجھے جاتے تھے۔ ابوجعفر المنصور (خلیفہ عباسی) خراج (مالگذاری) میں ان کے سوا بنو امیہ کا کوئی سکہ قبول نہیں کرتا تھا"[3]

---

[1] ۔ ابویعلی: احکام السلطانیہ صفحہ ۱۶۴ نیز فتوح البلدان صفحہ ۴۶۷ نقود۔

[2] ۔ بلاذری: فتوح البلدان صفحہ ۴۶۹ نقود۔

[3] ۔ بلاذری: فتوح البلدان صفحہ ۴۶۹ نقود، نیز ابویعلی: احکام السلطانیہ صفحہ ۱۶۵۔

عباسی دور اور بعد کے دور میں تسکیک میں جو بھی اصلاحیں ہوئیں یہاں انھیں حذف کیا جاتا ہے" موحدین کی سلطنت کا زمانہ آیا تو مہدی نے درہم کا سکہ مربع شکل کا بنوایا ہے[1]

زر کے اجراء میں عادت کا اثر

"عادت کی قوت اور عام رسم و رواج کے اثر کو جب تک ذہن نشین نہ رکھا جائے اس وقت تک بہت سے عمرانی مسائل سمجھ میں نہیں آسکتے خاص کر "زر" پر تو یہ حقیقت پوری مطابق ہوتی ہے۔ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ بارہا با اقتدار حکمرانوں نے پرانے سکوں کو واپس لینے یا نئے سکوں کے جاری کرنے کی کوشش کی لیکن لوگوں کی عادتیں اور فطرتی احساس، خود غرضی، قانون اور تعزیرات کی قوت سے بھی بالاتر ثابت ہوئے ہیں[2]

اس بیان کے بعد صاف سمجھ میں آسکتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے جو درہم جاری کیے تھے "اس کا نقش اور وضع کیوں کسروی تھی" اسی طرح امیر معاویہؓ اور عبدالملک نے جو دینار بنائے تھے اس میں قیصر روم کے دینار کی طرح شبیہہ بھی بنائی گئی تھی رفتہ رفتہ سکوں کی وضعیں بدل گئیں کیونکہ "سکوں کو لوگ عام طور سے مانوس وضع کی وجہ سے قبول کر لیتے ہیں اور جو لوگ ناواقف اور جاہل ہوتے ہیں ان میں تو یہ بات اور بھی بڑھی ہوئی ہوتی ہے اسی وجہ سے نئی نئی تسکیکوں میں پرانی مہر اور نقش کو یکساں رکھنے کی ہمیشہ ضرورت ہوتی ہے اور بہت سی صورتوں میں پرانا تسکیک کا سنہ ہی نہیں بلکہ متوفی بادشاہ کی شبیہہ کو بھی نئے سکوں پر برقرار رکھا گیا چنانچہ میریا تھریسا کا ڈالر اب تک آسٹریا کی دارالضرب میں مسکوک ہوتا ہے۔ اور نقش و نگار اور سنہ ٹھیک وہی ہے جو سنہ ۱۷۸۰ء کی پہلی اجرائی کے وقت تھا[3]

---

[1] ۔ فتوح البلدان صفحہ ۴۶۹ ۔

[2] ۔ جیونز: منی اینڈ دی میکانزم آف ایکسچینج باب ۵ صفحہ ۷۸ ۔

[3] ۔ جیونز: منی اینڈ دی میکانزم آف ایکسچینج باب ۵ صفحہ ۷۹ ۔

کاغذی زر یا نیابتی زر

مورخ بلاذری کا بیان ہے کہ حضرت عمرؓ نے اونٹ کی کھال کے درہم بنوانے کا ارادہ کیا تھا۔ اس پر ان سے کہا گیا کہ اس طرح تو اونٹ کا ایک بچہ بھی نہ بچے گا، یہ سن کر انھوں نے اپنا ارادہ ترک کر دیا[1] لیکن علامہ کتانی کا بیان ہے کہ حضرت عمرؓ نے باقاعدہ چرمی سکہ بلکہ کہنا چاہیئے کہ چرمی نوٹ رائج کیے تھے کہ

اِنَّ عُمَرَ بن الخطابؓ کَانَ یَسْتَعْمِلُ الوَرِقَ وَالجلودَ مَکَانَ النقودِ لِلحَاجَۃِ[2]

حضرت عمرؓ ورق اور چمڑے کو روپوں (سکوں) کی جگہ ضرورت کے وقت استعمال کرتے تھے۔

ابو تمام شاعر کے بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ زر طلا (سونے) کی قلت کے باعث حضرت عمرؓ نے نوٹوں کے جاری کرنے کا حکم دیا تھا۔

لم ینتدب عمرُ للابل یجعل من ؛ جلودھا النقد حین عزۃ الذھب[3]

ترجمہ:- کیا حضرت عمرؓ نے اونٹ کے چمڑے کو نقد (سکہ) کی جگہ استعمال کرنے کا حکم نہیں دیا تھا جبکہ سونا نایاب ہو گیا تھا۔

مذکورہ حوالوں سے پتا چلتا ہے کہ ٹسکیک کی طرح نیابتی زر کی اجرائی بھی حکومت ہی کی جانب سے ہونی چاہیے نیز یہ کہ نیابتی زر جاری کیا جا سکتا ہے اور یوں چمڑے کا سکہ بھی کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ "بطرس اعظم کے عہد تک روسی مملکت میں چرمی زر کا رواج تھا قدیم مصنفین نے ایسی کئی روایتیں لکھی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ قرطاجنہ، لیسیڈیمون اور رومۃ الکبریٰ میں پہلے پہل زر چمڑے کا بنا ہوا ہوتا تھا لیکن پہلے اوراق گزشتہ زر کی چھان بین اور کھوج لگانے کے لیے پرانے زمانہ کی خاک چھاننے کی ضرورت نہیں۔ ہڈسن کمپنی اور شمالی امریکہ میں سرخ فام ہندیوں کے درمیان اب تک بھی جو تجارت

---

[1] بلاذری: فتوح البلدان صفحہ ۴۷۰ نقود۔

[2] الکتانی: کتاب التراتیب الاداریۃ ج ۱ صفحہ ۴۲۲۔

[3] بحوالہ الکتانی: کتاب التراتیب الاداریۃ ج ۱ صفحہ ۴۲۲۔

ہوتی تھی اس میں بلا لحاظ وسعت و اختلاف وصفی ایک عرصہ تک سمورہی مبادلہ کا ذریعہ تھا[1]

ابن بطوطہ نے بھی اپنے سفر نامہ میں لکھا ہے کہ چین کی مغل حکومت کی طرف سے "بالشت" نامی نوٹ کا عام رواج تھا جو کاغذ سے بنتا تھا اور نقرئی طلائی سکوں کے لین دین کی بہ نسبت لوگ اس نوٹ کو قبول کرتے تھے۔

ہمایوں بادشاہ کے زمانے میں نظام بہشتی نے آدھے دن کی اپنی بادشاہت میں چام[2] کے دام چلائے تھے۔

چونکہ بنیا بھی زر کی قدر حکومت کی عطا کردہ ہوتی ہے اس لیے جب تک حکومت کا وقار باقی رہتا ہے اس قسم کے زر کی قدر بھی باقی رہتی ہے "عام طور سے انھیں "زر" نہیں سمجھا جاتا نوٹ پھر بھی "زر" سمجھے جاتے ہیں چنانچہ روزمرہ کی بول چال کا معمول جو اپنے اندر سب معمولات کی طرح مسلمہ عام روایتوں کی جھلک رکھتا ہے اس خاص تحفظ کی توجیہہ کر دیتا ہے جو نوٹ کے قابضوں کے لیے کیا گیا ہے"[3]

نوٹوں کا بدل

اسلام کی ابتدائی صدیوں میں نوٹوں کا ایک اور بدل موجود تھا اور وہ یہ کہ "جب کوئی شخص دور دراز سفر کا ارادہ کرتا اور اگر مثلاً کسی کے پاس دس ہزار دینار ہوتے تو بجائے اس سونے یا چاندی کو لے جانے کے وہ اس کے بدلے اتنے جواہرات جن کو آسانی سے جیب میں رکھا جا سکتا ہے خرید لیتا پھر منزل مقصود کو پہنچ کر ان جواہرات کو بیچ ڈالتا اور اس کی جو قیمت حاصل ہوتی اس کو خرچ کرتا"[4]

۱۔ جیونز : منی اینڈ دی میکانزم آف اکسچینج باب ۴ صفحہ ۲۰

۲۔ چام کے دام، چمڑے کا روپیہ (وہ چمڑے کا گول روپیہ جس میں نظام نامی سقہ نے ہمایوں بادشاہ کے عہد میں اپنی خیر خواہی کے صلہ میں نصف روز کی بادشاہی لیکر سونے کی کیل جڑ کر چلایا تھا) فرہنگ آصفیہ جلد دوم۔

۳۔ ٹاسگ : اصول معاشیات ج ۱ باب ۲۷ صفحہ ۳۸۴۔

۴۔ جرجی زیدان : تاریخ التمدن الاسلامی ج ۵ صفحہ ۱۰۸ مطبوعہ مصر

اوپر کی عبارت کے بعد جرجی زیدان لکھتا ہے۔

كَمَا يَفْعَلُ النَّاسُ الْيَوْمَ بِتَحَاوِيلِ الْمَصَارِفِ الْمَالِيَةِ اَوِ الْبَنْكِ نوٹ[1] — جیسا کہ آج کل لوگ بنک کے نوٹ سے کام چلاتے ہیں۔

بین الممالک سکہ

اسلامی معاشیات میں زر کی بحث کے سلسلہ میں بین الممالک سکہ کا مسئلہ امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔

طلوع اسلام کے وقت مدینہ اور مکہ کے بازاروں میں ایرانی، رومی اور یمنی سکے بھی آتے تھے۔ جو تاجر تجارت کی غرض سے کسی ملک کو روانہ ہوتا تو اس ملک کے زر کا خواہشمند ہوتا۔ جو لوگ صرافہ کا کاروبار کرتے وہ ایک ملک کے زر کو دوسرے ملک کے سکے سے مبادلہ کرتے وقت بٹہ کاٹتے تھے۔

بخاری وغیرہ کی روایتوں[2] نیز فقہاء کے بیانوں سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کی زائد رقم یا بٹاون کو انھوں نے سود قرار دیا تھا۔ سود نہ صرف ادھار (ربوا النسیہ) میں بلکہ نقد (ربوا الفضل) میں بھی ایسے ہی ہوتا ہے جیسے بٹاون کے طریقہ میں۔

حدیثوں سے رسول کریمؐ کا منشاء مبارک صاف طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر ایک ملک کے زر کی قدر دوسرے ملک کے زر کی قدر کے مساوی ہو تو مبادلہ مساوی مساوی دست بدست عمل میں آنا چاہیئے حضرت عثمانؓ سے روایت ہے کہ

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَا تَبِيْعُوا الدِّيْنَارَ بِالدِّيْنَارَيْنِ وَلَا الدِّرْهَمَ بِالدِّرْهَمَيْنِ[3] — رسول کریمؐ نے فرمایا کہ ایک دینار کو دو دینار کے بدلے میں اور ایک درہم کو دو درہم کے بدلے میں فروخت نہ کرو۔

نیز حضرت ابو ہریرہؓ کا بیان ہے کہ

---

[1] جرجی زیدان: تاریخ التمدن الاسلامی ج ۵ صفحہ ۱۰۸ مطبوعہ مصر۔
[2] ملاحظہ ہو بخاری کتاب البیوع نیز بخاری کتاب الصرف
[3] امام مالکؒ: موطا کتاب البیوع نیز بخاری شریف کتاب البیوع۔

اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ قَالَ: اَلدِّیْنَارُ بِالدِّیْنَارِ وَالدِّرْھَمُ بِالدِّرْھَمِ لَا فَضْلَ بَیْنَھُمَا۔[1]

رسول کریمؐ نے ارشاد فرمایا کہ دینار کا دینار ہی کے بدلے اور درہم کا درہم ہی کے بدلے مبادلہ کرو اور ان دونوں میں (کمی) زیادتی نہ ہونے پائے۔

ممکن ہے کہ جو شخص صرافہ کے طریقے نہ جانتا ہو مذکورہ روایتوں پر ایک سرسری نظر ڈال کر یہ پوچھ بیٹھے کہ بھلا کون ایسا ہوگا جو دو دینار دے کر ایک دینار لینا یا مثلاً ۱¼ روپیہ دے کر ایک روپیہ لینا قبول کرے گا؟ لیکن معاشیات کا ایک مبتدی بھی سمجھ سکتا ہے کہ مذکورہ دونوں حدیثوں کا کیا مطلب ہے۔

عام طور پر ایک ملک کے چاندی سونے کے سکے کو دوسرے ملک کے چاندی سونے کے سکے سے بدلا جاتا ہے لیکن مختلف سکے حاصل کرنے کے لیے بٹاون دینا پڑتا ہے جیسا کہ حالی دکلدار میں ہوتا ہے۔ رحمۃ للعالمینؐ کی بین الاقوامی نظر تمام دنیا میں بین الاقوامی سکے رائج کرنا چاہتی تھی۔ اُس زمانہ میں بھی رومی سکے گراں ہوتے تھے اور ان کی قدر ایرانی سکوں کے مقابلے میں زیادہ ہوتی تھی کیونکہ ایرانی سلطنت کمزور ہونے سے اس کی ساکھ گر رہی تھی۔

غرض بٹاون لگانے کی صورت میں چونکہ یہ مدعا فوت ہو جاتا ہے جس کے حل کی راہ اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ جیسے سال و ہفتہ کے ایام تقریباً تمام ممالک میں یکساں ہیں اسی طرح بین الاقوامی طور پر تمام حکومتیں اپنے نقرئی اور طلائی سکوں کو ہم وزن کر دیں اور بٹاون کے رواج کو روک دیا جائے، ایکسچینج (صرافہ) کے مغالطوں سے کاروباری دنیا کو آئے دن جو تکلیف اٹھانی پڑتی ہے خاص کر محکوم قوموں کے ساتھ حاکم قومیں اس بات میں جو سلوک کر رہی ہیں وہ معاشیات کے ماہرین سے چھپا ہوا نہیں ہے اور رسول کریمؐ کا بحیثیت پیغمبر عالم کے دنیا سے یہ مطالبہ اس کا مستحق ہے کہ ماہرین معاشیات اس کے فائدوں اور ثمرات اور اس کی مخالف موجودہ شکل کے نقصانات پر غور کریں۔

عصری ماہرین کی شہادت

اِس سلسلے میں دو ایک عصری معاشی ماہرین کے

---

[1] امام مالکؒ: موطا کتاب البیوع۔

نظریے پیش کیے جاتے ہیں جن سے رسول کریمؐ کی مذکورہ حدیث کی شرح ہوتی ہے چنانچہ پروفیسر جیونز نے لکھا ہے "مسائل زر کے مباحث میں ہم کو ایک عام نظام زر کے رواج کا خیال ذہن نشین رکھنا چاہیے۔ دنیا میں گو جنگ و جدل سے چھٹکارا نہیں اور لڑائیاں ناگزیر ہیں پھر بھی قوموں کے باہمی تعلقات کی رفتہ رفتہ اصلاح ہو ہی جائے گی۔ آخر تصنیف کا حق، مجرموں کی تحویل، بحری اشاروں کے ضابطے، ڈاک کے عام قاعدے اور جنگی مصائب کی تخفیف کے بین الاقوامی معاہدے موجود ہی ہیں۔ مدت ہوئی کہ قوموں نے الگ تھلگ رہنا اور صرف اپنی بھلائی اور ہمسایہ قوموں کی بدخواہی چھوڑ دی ہے۔ آزاد تجارت کی ترقی کے ساتھ ساتھ ریل، جہاز، تار برقی، ٹیلیفون، اخبارات وغیرہ سے رسل و رسائل میں بھی ترقی ہوتی جا رہی ہے۔ کبھی نہ کبھی آخر وہ زمانہ آ ہی جائے گا جبکہ بنی نوع انسان کی مختلف جماعتوں کے تمام اختلافوں کو تا امکان ناپید کرنے کی خواہش اور فکر ہونے لگے گی۔"[1]

پروفیسر موصوف کے بعد تو دنیا آمد و رفت کے وسیلوں میں ہوائی جہاز کے ذریعہ اور پیام رسانی میں دور نمائی (ٹیلی وژن) لاسلکی اور ٹرنک ٹیلی فون کے ذریعہ تو اور بھی ترقی ہوئی ہے۔ پروفیسر مذکور نے اپنی کتاب (منی اینڈ دی میکانزم آف ایکسچینج) میں بین الممالک زر کے فائدوں کی خاص طور پر وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "کوتاہ نظر لوگ بین الاقوامی زر کی تمام تجویزوں پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اس مقصد میں اگر کامیابی ہو بھی جائے تو اس سے صرف ان چند لوگوں کو سہولت ہو جائے گی جو دوسرے ملکوں میں سفر کرتے ہیں حالانکہ اعتراض کرنے والے یہ نہیں سمجھتے کہ یہ تو ان فائدوں میں جو زر کی عمومیت سے حاصل ہونے والے ہیں سب سے ادنیٰ ہے۔ پہلے یہی دیکھ لیجئے کہ ایک عام پیمانہ قدر کے حوالے سے جو اعداد و شمار، قیمتیں اور حساب کتاب مرتب ہوا کریں گے ان کا آسانی سے سمجھا جانا ہی کچھ کم خوبی کی بات نہیں ہے۔ آج کل اعداد و شمار کے ماہروں کو روپیہ، قرش، فرانک، پونڈ، ڈالر، تھیلر، ہیلر، گذ، ایلس،

---

[1] جیونز: منی اینڈ دی میکانزم آف ایکسچینج باب ۲۲ صفحہ ۱۶۷۔

ہنڈرڈ ویٹ، کیلو گرام وغیرہ کے سے طرح طرح کے پیمانوں کے حوالہ سے عام معلومات کے تختوں کی ترتیب میں جو کچھ دقت ہوا کرتی ہے وہ محتاج بیان نہیں۔"

"تاجروں اور کاروباری آدمیوں کے لیے بھی قسم قسم کے زر اور پیمانے بڑی پیچیدگی کا باعث ہوتے ہیں اور بعض ملک کے حصول میں تو زر کی ٹھیک قدر ہی نہیں معلوم ہوتی۔ ان ملکوں سے داد وستد اور تجارت کی وہی جرأت کر سکتے ہیں جن کو مقامی حالات زر اور پیمانوں سے پوری آگاہی ہو۔ نظامات زر کے اعلیٰ اختلافوں اور تفاوت سے تبادلہ خارجہ کے حسابات بھی چیستان بنے ہوئے ہیں۔ وہی لوگ کچھ فائدہ میں ہیں جن کو اس قسم کے حسابات میں کچھ مہارت حاصل ہے۔"

"ایک سہولت تو یہ ہے کہ اگر ایک ملک کا سکہ دوسرے ملک کے چلن میں یا راست منتقل کر دیا جائے تو مبادلہ خارجہ کے حسابوں کے تصفیے نہایت آسانی اور عجلت سے ہو جایا کریں گے۔"

"دوسرا فائدہ بین الاقوامی زر کا یہ ہوگا کہ بیش قدر دھاتیں زیادہ تر سکوں ہی کی شکل میں رہیں گی ورنہ آج کل تو ایک ملک کے سکوں کو دوسرے ملک میں برآمد کر کے گلا دیتے ہیں اور پھر کچھ نفع کے ساتھ از سر نو مسکوک کر لیتے ہیں گو کہ انگریزی ساورن، امریکن ایگل، فرانسیسی نپولین اور میکسیکن ڈالر وغیرہ کے سے سکوں کی فروخت صرف بنکوں ہی کے ذریعہ ہوا کرتی ہے، لیکن اگر سکوں کا نظام ایک ہی رہے تو سونے اور چاندی کا تمام ذخیرہ مسکوک شکل ہی میں رہے گا اور ہر وقت چلن میں شامل کر دیا جا سکے گا۔ تسکیکی مصارف کی تخفیف بھی بہت زیادہ نہ سہی تھوڑی بچت کا ضرور موجب ہوگی لیکن اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ موجودہ صورت حال میں خام دھات کے بیوپاریوں اور ان لوگوں کے لیے جو خام دھات کی حمل ونقل کی دشواریوں کے طفیل میں نفع کما لیتے ہیں بہت کم موقع باقی رہے گا۔"

"سیاحوں کو پریشانی اور نقصان سے جو نجات ملے گی وہ بھی نظر انداز کرنے کے قابل نہیں کیونکہ بین الاقوامی رسل و رسائل کے ذریعوں کی ترقی کے ساتھ ساتھ

سیاحوں کی تعداد بھی بڑھتی جائے گی۔ اس لیے ضروری ہے کہ تمام دقتوں کو دُور کر دیا جائے۔[1]

"بین الاقوامی زر کے رواج کا امکان اس واقعہ سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ بہت سی قوموں کے سکّے بغیر کسی بین الاقوامی معاہدہ کے غیر ممالک میں بطورِ زر قانونی تسلیم کر لیے جاتے ہیں چنانچہ انگریزی ساورن نہ صرف برطانوی نوآبادیات اور مقبوضات بلکہ پرتگال، مصر، برازیل اور غالباً اور ملکوں میں مقبول ہے اسی طرح نپولین کا بھی یورپ کے اکثر ملکوں میں بے روک ٹوک چلن رہا ہے۔"[2]

وہ شخص جو دنیا سے رخصت ہونے سے پہلے انسانی بہبودی کے لیے کچھ کرنا چاہتا ہو تو اسے چاہیے کہ بین الممالک زر کی اجرائی کے لیے کوشش کرے اور یوں بھی ایک عرصہ سے معاشئین اور مملکتوں کے پیش نظر یہ کوشش کانفرسوں کی شکل میں جاری ہے۔

جعل سازی وغیرہ کا انسداد

تسکیک میں بدعنوانیوں کی روک تھام کے لیے اسلامی حکومت نے تسکیک کو اپنے ہی قابو میں رکھنے کا خاص انتظام اور اہتمام کیا تھا "ٹکسالی اور کھرے وہی سکّے ہیں جو کھوٹ سے خالی ہوں اس لحاظ سے ڈھالے ہوئے سرکاری سکّے، چاندی اور سونے کے پتروں کی بہ نسبت زیادہ بھروسے کے قابل اور اطمینانی ہوتے ہیں ان میں مہر کی وجہ سے کھوٹ ملانے کا احتمال نہیں رہتا"[3] اسی اہمیت کی بناء پر فقہاء نے جعل سازی میں تعزیر کو ضروری قرار دیا ہے۔[4]

"عمر بن عبد العزیزؒ کے پاس ایک شخص لایا گیا جو سکّے ڈھالا کرتا تھا۔ انھوں نے اس کو سزا دی، قید کیا اور اس کا سانچہ لے کر آگ میں ڈال دیا۔"[5]

---

[1] ۔ جیونز: منی اینڈ دی میکانزم آف ایکسچینج باب ۱۴ صفحہ ۱۶۸ ۔

[2] ۔ جیونز: منی اینڈ دی میکانزم آف ایکسچینج باب ۱۴ صفحہ ۱۷۰

[3] ۔ ماوردی: الاحکام السلطانیہ باب ۱۳ ۱۴۸ [4] ۔ ماوردی: الاحکام السلطانیہ باب ۱۳ ۲۹

[5] ۔ بلاذری: فتوح البلدان صفحہ ۴۷۱ نقود

سکّوں کو کاٹنے اور ان میں خلط ملط کرنے کا رواج قدیم سے چلا آیا ہے چنانچہ فقہا نے جس طرح سکہ کی جعلسازی میں تعزیر کو ضروری قرار دیا ہے اسی طرح انھوں نے سکہ کو توڑنے یا اس کے کونے کترنے کی بھی ممانعت کی ہے دلیل میں انھوں نے قرآن مجید کی ایک آیت کو بھی پیش کیا ہے۔ شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم کو ہدایت کی تھی کہ ناپ تول میں انصاف کیا کریں اور زمین پر فساد نہ پھیلائیں۔ ان کی قوم کو اس قسم کی دخل دہی سے اچھا ہوا اور کہا تعجب ہے کہ تم بڑے باوقار اور نکوکار ہو کر ایسے احکام دیتے ہو۔

أَوْ أَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ أَمْوَالِنَا مَا نَشَاءُ وْا۔ کیا ہم اپنے مالوں میں جو کرنا چاہیں اسے چھوڑ دیں۔

پ ۱۲ ہود ۱ ع ۸

اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے "ابن زید کہتے ہیں کہ انھوں نے انھیں دینار اور درہم توڑنے سے منع کیا تھا۔ ان کی قوم والوں نے کہا یہ تو ہمارا مال ہے اسے ہم جو چاہیں گے کریں گے۔ چاہیں تو توڑ ڈالیں گے، چاہیں تو جلا دیں گے اور چاہیں تو ہم انھیں پھینک دیں گے۔[1] حضرت شعیب علیہ السلام نے جواب دیا کہ

وَمَآ أُرِيْدُ أَنْ أُخَالِفَكُمْ إِلٰى مَآ أَنْهٰكُمْ عَنْهُ إِنْ أُرِيْدُ إِلَّا الْإِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ۔ میں تمھاری مخالفت کرنی نہیں چاہتا لیکن جس بات سے روکتا ہوں اس سے تمھاری ہی امکانی اصلاح پیش نظر ہے۔

پ ۱۲ ہود ۱۱ ع ۸

"درہم اور دیناروں کے توڑنے میں فقہاء کا اختلاف ہے۔ امام مالکؒ (المتوفی ۱۷۹ھ) اور اکثر مدنی فقہا کی رائے ہے کہ سکہ کو توڑنا مکروہ ہے کیونکہ یہ ایک طرح کا فساد فی الارض ہے ایسا کرنے والے کو دھمکایا جائے۔[2]

ابوداؤد کہ ایک روایت میں بھی سکہ توڑنے یا اس کے کونے کترنے کی ممانعت پائی جاتی ہے جیسے کہ

صـ ۱۴۹

---

[1] تفسیر طبری ج ۱۲ صفحہ ۵۸ آیت مذکور نیز فتوح البلدان صفحہ ۴۷ نیز ماوردی الاحکام السلطانیہ

[2] ماوردی الاحکام السلطانیہ باب ۱۳ صفحہ ۱۴۹

نَھَی رَسُوْلُ اللّٰہِ اَنْ تُکْسَرَ سِکَّۃُ الْمُسْلِمِیْنَ[1] رسول کریمؐ نے مسلمانوں کے سکے توڑنے کی ممانعت فرمائی ہے۔

"جس حدیث سے اس کی ممانعت ہوئی ہے اس کو محمد بن عبداللہ انصاری بصرہ کے قاضی نے اس پر محمول کیا ہے کہ سکہ کو پترا بنا کر چلانے کے لیے توڑنے کی ممانعت ہے اور دوسروں کے نزدیک اس پر محمول ہے کہ توڑ کر برتن اور آرائش کی چیزیں بنانے کی ممانعت ہے اور ایک جماعت کہتی ہے کہ ادھر ادھر سے کترنے کی ممانعت ہے کیونکہ اسلام کی ابتدا میں لوگ ان کو گن کر معاملہ کرتے تھے اور اطراف کے کونے کترنے سے اس میں کمی آجاتی تھی۔"

گو کوئی تاجر یا شخص سرکاری روپیہ کو قبول کرنے سے انکار نہیں کر سکتا پھر بھی "ٹوٹے ہوں درہموں اور دیناروں کا لینا خلط والتباس کے احتمال کی وجہ سے ضروری نہیں یہی وجہ ہے کہ سالم سکہ کی بہ نسبت ان کی قیمت کم ہوتی ہے"[3]

"بیع وثمن میں دغل اور کھوٹ ملانا بھی معاملات سے تعلق رکھتا ہے محتسب اس کا انسداد کرے اور حسب ضرورت تادیب کرے رسول کریمؐ نے ارشاد فرمایا ہے کہ کھوٹ ملانے والا ہم میں سے نہیں ہے"[4]

اسی طرح "اگر کوئی شخص سرکاری مہر شدہ باٹ کی طرح جعلی باٹ یا پیمانہ بنائے تو وہ جعلی درہم اور دینار بنانے والے کی طرح مجرم ہے"[5]

"اگر شہر میں کاروبار کی ترقی سے ضرورت ہو کہ ناپ تول کرنے والے اور روپیہ وغیرہ پرکھنے والے مقرر کیے جائیں تو ان کا انتخاب محتسب کرے۔ جب تک کہ وہ

1۔ ابوداؤد، کتاب البیوع بروایت عبداللہ بن عمرؓ

2۔ ماوردی: الاحکام السلطانیہ باب ۲۰ صفحہ ۱۴۹ نیز ابویعلی: الاحکام السلطانیہ صفحہ ۱۶۸

3۔ ماوردی: الاحکام السلطانیہ باب ۲۰ صفحہ ۱۴۹

4۔ ماوردی: الاحکام السلطانیہ باب ۲۰ صفحہ ۲۴۰ نیز الاحکام السلطانیہ صفحہ ۱۶۸

5۔ ماوردی: الاحکام السلطانیہ باب ۲۰ صفحہ ۲۴ نیز الاحکام السلطانیہ صفحہ ۱۶۸

کسی معتبر امانت دار شخص کو مقرر نہ کرے کوئی اور شخص یہ کام نہ کرے اور بیت المال (سرکاری خزانہ) سے بشرط گنجائش ان کی تنخواہیں مقرر کرے اور اگر گنجائش نہ ہو تو ان کی اجرت معین کر دے تاکہ کمی بیشی نہ ہو کیونکہ کمی بیشی کی صورت میں ان کو کم تولنے اور کم ناپنے کی رغبت ہوگی[1]

غرض اسلامی نظام معیشت نے مبادلہ دولت میں ہر طرح کی سہولتیں مہیا کی ہیں۔ جنسی مبادلت کی جگہ زر کو رواج دیا اور زر کے مبادلہ کے صحیح اصول قائم کیے۔

(ب) اعتباری تمسکات

اگلے صفحوں میں اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ پہلے پہل بارٹر (جنسی مبادلت) کے ذریعہ سے اشیاء کا اشیاء سے مبادلہ ہوتا تھا۔ اس کے بعد زر کا رواج ہوا۔ یہاں یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ اشیاء اور خدمات کا بجائے نقد ادائی کے ادھار پر صرف اعتباری تمسکات سے بھی لین دین ہو سکتا ہے فروشندہ کو ان تمسکات پر اعتبار ہوتا ہے اس لیے وہ ان کے قبول کرنے میں کچھ بھی پس و پیش نہیں کرتا۔ تجارت کی وسعت اور ترقی سے اعتباری تمسکات کا رواج بھی آئے دن بڑھ رہا ہے۔ عہد حاضر میں جب کہ خریدار ایک مقام پر اور فروشندہ دوسرے مقام پر رہتا ہے نیز بڑے پیمانہ پر بین الاقوامی تجارتی کاروبار کرنے والے تاجر محض اعتباری تمسکات اور بھروسہ پر کاروبار کرتے ہیں۔

اعتبار[2] یا ساکھ کی تعریف

"اعتبار محض ادائی کی برآمدگی کا نام ہے مثلاً اگر میں اپنے قرضخواہ کو اس بات پر راضی کر لوں کہ وہ میری جانب سے واجب الادا رقم کو آج کے بجائے ایک مہینے بعد

---

[1] ماوردی: الاحکام السلطانیہ باب ۲۰ صفحہ ۲۴۱ ، نیز ابو یعلی: الاحکام السلطانیہ صفحہ ۲۸۳

[2] اعتبار (کریڈٹ) وجاہت پرانا لفظ ہے جو قدیم فقہ کی کتابوں میں استعمال ہوا ہے صناع دستکار وغیرہ بغیر سرمایہ کے جو اتحاد قائم کرتے ہیں اس کو شرکت الوجوہ سے تعبیر کیا جاتا ہے جس کا بیان شرکت میں گذر چکا۔

وصول کرے گا تو گویا میں اپنے قرضخواہ کے دل میں اپنا اعتبار یا اپنی ساکھ قائم کرتا ہوں۔ اسی طرح اگر میں نے اپنے مقروض کو قرضہ کی ادائی کے لیے مہلت دی تھی گویا میں نے اس سے اس کا اعتبار حاصل کیا۔ پروفیسر لاک نے ان الفاظ میں اعتبار کی نہایت صحیح تعریف کی ہے کہ "ایک محدود مدت میں زر کی ادائی کی امید ہی اعتبار ہے"[1]

اعتباری تمسکات مستقبل میں رقم کی ادائی کا وعدہ کرنا ہی گویا اعتبار پیش کرنا ہے۔ ھنڈی، چیک، سرکاری پرامیسری نوٹ نیز بنک کے جاری کیے ہوئے نوٹ اور اسی طرح پوسٹل آرڈر اور منی آرڈر وغیرہ اعتبار ہی کی مختلف شکلیں ہیں اور ڈاکٹر تھامس کے الفاظ میں "اعتباری تمسکات حقیقت میں زرِ نقد کا بدل ہیں"[2] اعتباری تمسکات کی خوبی یہ ہے کہ ان کے ذریعہ ایک تو مبادلہ بڑے پیمانہ پر ہو سکتا ہے اور ساتھ ہی قرضوں کی ادائی میں سہولت ہوتی ہے۔

اسلام کی ابتدا میں اعتبار کے جو مختلف طریقے رائج تھے انھیں ذیل میں بیان کیا جاتا ہے۔

ھنڈی، سُفتجہ[3] اعتباری تمسکات کی ایک شکل ہنڈی "بل آف ایکسچنج ہے" سچ پوچھو تو ہنڈی محض ایک شخص کی جانب سے دوسرے کے نام تحریری حکم نامہ ہے جس میں یہ ہدایت کی جاتی ہے کہ مندرجہ رقم کسی تیسرے شخص کو ادا کی جائے۔ اسی طرح ہنڈی کے لیے تین جماعتیں ضروری ہیں یعنی ہنڈی لکھنے والا، ہنڈی قبول کرنے والا یا سکارنے والا، اور ہنڈی کی رقم

---

[1] - جیونز: منی اینڈ دی میکانزم آف ایکسچنج باب ۱۴ صفحہ ۲۴۸ -

[2] - ڈاکٹر اس، تھامس: ایلیمنٹس آف اکنامکس باب ۲۵ صفحہ ۳۹۸ - نواں اڈیشن -

[3] - عربی زبان میں ہنڈی، بل آف ایکسچنج کو سَفتجہ یا سُفتجہ بھی کہتے ہیں اس کی جمع سفاتج ہے سُفتجہ فارسی زبان کے لفظ کا معرب ہے، فارسی میں سُفتہ کھوکھلی لکڑی کو کہتے ہیں قدیم عرب میں یہ دستور تھا کہ لاٹھی وغیرہ کو کھوکھلی کرکے اس میں روپیہ پیسہ رکھ کر سفر میں لیجاتے تھے

ادا کرنے والا ہے[1]

"ہنڈی اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ وہ ہنڈی لکھنے والے کی جانب سے ہنڈی قبول کرنے والے یا جس کے نام بھی یہ مرتب کی گئی ہے اس کے نام صرف ایک حکم ہوتا ہے کہ اتنی رقم اس مدت میں فلاں شخص کو ادا کر دی جائے۔ اور جب کبھی ہنڈی لکھی جاتی ہے تو اس سے یہ لازم آتا ہے کہ ہنڈی لکھنے والے کی کچھ رقم اس شخص سے وصول شدنی ہے جس کے نام ہنڈی بنائی گئی ہے۔ موسوم الیہ ہنڈی پیش ہونے پر اگر اسے منظور کر لے تو یہ منظوری گویا قرضے کے وجود کا اقرار ہے گو کہ ہنڈی ہمیشہ کسی خاص شخص ہی کے نام لکھی جاتی ہے لیکن اگر اس پر ظہری عبارت منتقلی کی بابت لکھ دی جائے تو منتقل ہو بھی جاتی ہے۔ اور اس طرح یہ اس قابل سمجھی جاتی ہے کہ جس کے ذریعہ وہ کسی آئندہ تاریخ میں ایک دور دراز ملک میں سکاری جا سکے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ اسی قسم کے مساوی المقدار قرضہ کی ادائی میں منتقل ہونے کی قابلیت رکھتی ہے"[2]

عربی زبان میں ہنڈی کو سفتجہ کہا جاتا ہے یہ تجارتی کاروبار کی اصطلاح ہے اس لیے اس کو "سفاتج التجار" کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔ یہ وہی ہنڈی ہے جو اب بھی دنیا میں اس لیے رائج ہے کہ روپیہ کی منتقلی میں اس سے آسانی ہوتی ہے حفاظت کے اخراجات کی کفایت ہوتی ہے نیز راستہ کے خطروں سے مال بھی محفوظ ہو جاتا ہے اور روپیہ بھی بیکار پڑا نہیں رہتا۔

عہد نبوت میں سفتجہ کے لفظ کا پتا نہیں ملتا البتہ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد صحابہؓ ہی میں اس کا رواج ہو گیا تھا[3] چنانچہ عبداللہ بن زبیرؓ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) تاکہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے پائے کہ فلاں شخص کے پاس روپیہ موجود ہے اس طرح اس کا روپیہ راستہ کے خطرے سے محفوظ ہو جاتا تھا چونکہ سفتجہ کے ذریعہ راستہ کا خطرہ دور ہو جاتا اس لیے تمسکوں کی دستاویز کے ذریعہ رقم بھجوانے کو بھی سفتجہ کہا جانے لگا۔

[1] ۔ پروفیسر ٹاسگ اصول معاشیات ج ۱ باب ۲۲ صفحہ ۴۸۴ مبادلات خارجہ۔

[2] ۔ جیونز: منی اینڈ دی میکانزم آف ایکسچینج باب ۲۲ صفحہ ۳۰۰

لوگوں سے مکہ میں درہم لیتے تھے اور ان کی بابت [illegible] ابن زبیرؓ کو عراق [illegible]
لکھتے تھے تو لوگ ان سے وہاں وصول کر لیتے تھے[1]

ابن ابی شیبہ المتوفی ۲۳۵ھ اپنے مصنف میں لکھتے ہیں کہ [illegible]
تاجروں کو یہاں مال دیا کرتے اور دوسری سرزمین پر وصول کر لیا کرتے تھے[2]

اسی مصنف میں حضرت امام حسنؓ کا بیان درج ہے کہ وہ حجاز میں رقم
لیتے تھے اور عراق میں ادا کیا کرتے تھے یا عراق میں لیتے اور حجاز میں ادا کرتے۔
عبدالرحمٰن بن الاسودؓ حجاز میں درہم لیا کرتے تھے اور عراق میں ادا کیا کرتے تھے[3]

سرکاری رقم بھیجنے کا ایک اور طریقہ

حضرت عمرؓ کے زمانہ میں سرکاری رقم کے بھیجنے کے چند طریقوں میں سے ایک طریقہ
یہ بھی تھا کہ معتبر تاجروں کے ذریعہ رقم مرکزی خزانہ (بیت المال) کو بھیجی جاتی
تھی اور اس اثناء میں تاجر اس سے کاروبار کر کے نفع اٹھانے کے عادی تھے۔

"حضرت عمرؓ کے دونوں صاحبزادے عبداللہ وعبیداللہ ایک لشکر کے
ساتھ عراق روانہ ہوئے۔ جب لوٹے تو بصرہ کے حاکم ابو موسیٰ الاشعری کے
پاس گئے انھوں نے خوش آمدید کہا۔ پھر کہا کہ کاش! میں تمھیں کچھ نفع
پہنچا سکتا تو ضرور پہنچاتا۔ پھر کہا کہ کیوں نہیں۔ میرے پاس کچھ خدا کا مال ہے
جسے میں امیر المومنین کی خدمت میں بھیجنا چاہتا ہوں اس روپیہ کو تمھیں
قرض دیتا ہوں اور تم دونوں اس سے عراق کا سامان خرید لو۔ اور
مدینہ میں جا کر بیچ ڈالو اصل (راس المال) امیر المومنین کو دے کر نفع تم
لے لینا۔ انھوں نے کہا کہ ہم بھی یہی چاہتے ہیں غرض ابو موسیٰ نے ایسا ہی
کیا اور حضرت عمرؓ کو لکھا کہ ان سے رقم وصول کر لیجیئے گا۔ جب یہ دونوں
مدینہ کو آئے تو انھوں نے سامان کو بیچ کے نفع کمایا۔ پھر اصل لیکر حضرت عمرؓ

---

[1] بیہقی: السنن الکبریٰ کتاب البیوع ج ۵ صفحہ ۳۵۲ باب ما جاء فی السفاتج مطبوعہ حیدرآباد دکن
[2] مصنف ابن ابی شیبہ ج ۲ صفحہ ۸۰ قلمی نسخہ کتب خانہ سعیدیہ حیدرآباد دکن۔
[3] مصنف ابن ابی شیبہ ج ۲ صفحہ ۸۰ قلمی نسخہ کتب خانہ سعیدیہ حیدرآباد دکن۔

کے پاس پہنچے۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا کہ کیا لشکر کے ہر شخص کو تمھاری طرح قرض دیا گیا؟ انھوں نے کہا کہ نہیں تو حضرت عمرؓ نے کہا کہ پھر تم کو امیر المومنین کے بیٹے سمجھ کر روپیہ دیا اس لیے اصل اور نفع دونوں داخل کرو۔ عبداللہ تو خاموش رہے مگر عبیداللہ نے کہا کہ اے امیر المومنین! آپ کو ایسا نہ کرنا چاہیئے۔ اگر مال تلف ہو جاتا یا (اس میں کچھ) نقصان ہو جاتا تو ہم تاوان دیتے حضرت عمرؓ نے کہا نہیں، داخل کرو۔ غرض عبداللہ تو خاموش رہے مگر عبیداللہ نے پھر اسی جواب کو دہرایا۔ حضرت عمرؓ کے ہم نشینوں سے کسی نے کہا کہ اے امیر المومنین آپ اس کو مضاربت کر دیں تو بہتر ہے۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ (اچھا) میں نے (منظور) کیا۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے اصل (راس المال) اور آدھا نفع لے لیا اور عبداللہ اور عبیداللہ نے آدھا نفع لیا۔[1]

سفتجہ کے متعلق فقہاء کی بحث

سفتجہ (ہنڈی، بل آف ایکسچینج) کے جواز اور عدم جواز سے متعلق اکثر فقہا نے بحث کی ہے لیکن اس معاملہ میں ان کی کوئی متفقہ رائے نہیں ہے۔ اس لیے اس اختلافی مسئلہ کو کچھ تفصیل سے بیان کیا جاتا ہے۔ حدیثوں سے یہ معلوم ہو چکا ہے کہ عبداللہ بن زبیرؓ مکہ میں لوگوں کی جانب سے ہنڈی بناتے تھے اور ان کے بھائی مصعب بن زبیرؓ جو کہ عراق کے گورنر تھے ہنڈی کی رقم لوگوں کو ادا کرتے تھے" حضرت ابن عباسؓ سے اس (ہنڈی) کی بابت پوچھا گیا۔ انھوں نے اس میں کچھ حرج نہ جانا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی بھی یہی رائے تھی۔[2] محدث بیہقی نے ایک اور بڑے فقیہ ابن سیرین المتوفی ۱۱۰ھ کی بابت لکھا ہے کہ۔

إِنَّهُ لَا يَرَىٰ بِالسَّفْتَجَاتِ بَأْسًا إِذَا كَانَ عَلَى الْوَجْهِ الْمَعْرُوفِ[3]	انھوں نے ہنڈیوں کے بارے میں کچھ اندیشہ نہ کیا جبکہ وہ عرف عام کے طریقہ سے ہوں۔

---

[1] امام مالکؒ: موطا کتاب القراض نیز مبسوط السرخسی ج کتاب الحوالہ
[2] بیہقی: السنن الکبریٰ۔ کتاب البیوع ج ۵ صفحہ ۳۵۲ باب ما جاء فی السفاتج۔
[3] بیہقی: السنن الکبریٰ۔ کتاب البیوع ج ۵ صفحہ ۳۵۲ باب ما جاء فی السفاتج۔

محدث ابن ابی شیبہ کے بیان سے مذکورہ رایوں کی تائید ہوتی ہے کہ

اِنَّ عَلِیًّا قَالَ: لَابَاسَ اَنْ یُعْطِیَ الْمَالَ بِالْمَدِیْنَۃِ وَیَاْخُذَ بِاَفْرِیْقَۃ [1]

حضرت علی کرم اللہ نے فرمایا کہ مدینہ میں مال دیے جانے اور افریقہ میں لیے جانے پر کوئی اندیشہ نہیں۔

"ابن عباسؓ اور ابن زبیرؓ نے اس بات میں کچھ حرج نہ جانا کہ حجاز کی سرزمین میں رقم حاصل کی جائے اور عراق کی سرزمین میں عطا کی جائے۔" [2]

"مگر باوجود ان تمام باتوں کے فقہاء عموماً اور حنفی فقہا خصوصاً کچھ اس شکل کے متعلق تذبذب کا اظہار کرتے رہے۔ تذبذب کے اسباب کیا تھے؟ کیا ان کو اس کا اندیشہ تھا کہ بتدریج ہنڈی کی یہ شکل سود کی صورت شاید اختیار کرلے اور سود کے جن نقصانات کو باوجود منافع کے آج دنیا اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی ہے کیا یہ خطرات ان کے سامنے آگئے تھے! یہ کہنا مشکل ہے۔ جہاں تک فقہ کی کتابوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہنڈی میں ان کو ایک گونہ ربٰوا کی بو آتی تھی، کیونکہ پہلے زمانہ میں بلکہ شاید ایسا اب بھی اس میں زیادہ تر یہ کیا جاتا ہے کہ لوگ ایک شہر میں روپیہ بطور قرض کے لیتے تھے اور ہنڈی لکھ کر قرضخواہ کو دیتے تھے کہ دوسرے شہر میں ان کے نمائندہ سے وصول کرلے۔ قرض دینے والا اس ذریعے سے اپنے روپیوں کو خطرات اور باربرداری کے مصارف سے محفوظ کرلیتا تھا گو حقیقی سود کی تو یہ شکل نہیں ہے لیکن ایک قسم کا غیر مادی نفع قرض دینے والے کو ضرور پہنچتا تھا (نیز ہنڈی کی اجرائی اور رقم کی ادائی کے مابین رقم سے کاروبار اور نفع حاصل کیا جاتا ہے) چونکہ فقہاء میں رسول اکرمؐ کی ایک حدیث مشہور ہے کہ

كُلُّ قَرْضٍ جَرَّ نَفْعاً فَهُوَ رِبٰوا

ہر وہ قرض جس سے نفع حاصل ہو وہ بیاج ہے۔

---

[1] مصنف ابن ابی شیبہ کتاب البیوع ج ۲ صفحہ ۸ اقلمی نسخہ کتب خانہ سعیدیہ

[2] مصنف ابن ابی شیبہ کتاب البیوع ج ۲ صفحہ ۸ اقلمی نسخہ کتب خانہ سعیدیہ

اس حدیث کی بنا پر سفتجہ کو بھی انھوں نے مکروہ قرار دیا تھا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ مندرجہ بالا حدیث خواہ فقہاء میں جس درجہ بھی مشہور رہو مگر محدثین کے اصول سے صحیح نہیں ہے۔ اس کے راویوں میں سوار بن مصعب بھی ایک شخص ہے جس سے حدیث کی روایت محدثین نے ترک کر دی تھی[۱]

رقم بنک میں داخل کر کے چیک یا ڈرافٹ حاصل کرنے اور دوسرے ملک میں اسے سکار لینے تک بنک اس امانتی رقم سے فائدہ اٹھاتا رہتا ہے شاید یہ سفتجہ میں کراہیت کا باعث تھا۔

فقہاء نے سفتجہ کی زیادہ تفصیل نہیں بیان کی

اکثر فقہاء نے ہنڈی (بل آف ایکسچینج) کے مسئلہ کو نہایت ہی اختصار سے بیان کیا ہے۔ ھدایہ جو حنفی مکتب خیال کی بڑی مستند اور ہندوستان میں بہت مشہور متداول ہے اس میں بھی ہنڈی سے متعلق صرف دو ہی سطریں ہیں کہ "اور سفاتج مکروہ ہیں اور وہ ایسے قرض ہیں جن کے ذریعہ قرض دینے والا راستہ کے خطرہ سے محفوظ ہو جانے کا فائدہ حاصل کرتا ہے۔ اور یہ ایسی شکل ہے جس میں فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ اور نبی کریمؐ نے ایسے قرض سے منع فرمایا جس سے نفع حاصل ہو[۲]

قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ اس زمانہ میں جبکہ ھدایہ لکھی گئی لوگ عام طور پر اس نیت سے قرض دیتے تھے کہ کسی کو قرض دے کر اپنے اس مقروض ہی کے توسط سے ہنڈی بھجوا دی جائے اور یوں خود قرض دینے والا باربرداری کے اخراجات اور راستہ کے خطرے سے محفوظ ہو جاتا تھا۔ فقہاء نے اس طرح قرض دے کر ہنڈی بھجوانے کو ناپسند فرمایا ہے اور یوں اگر بغیر کسی شرط کے ہو تو فقہاء اس کے جواز کے قائل ہیں۔

۱؎ ۔ مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی اسلامی معاشیات صفحہ ۴۳۲

۲؎ ۔ ھدایہ ج ۳ کتاب الحوالہ ۔

رَجُل اقرض رُجُلاً عَلیٰ اَن یَکتُبَ لَہٗ بذلِکَ اِلیٰ بلدِ کذا لا یَجُوزُ وَاِنْ اِقرضُ بغیرِ شرطٍ وکتبَ لَہٗ بذلِکَ اِلیٰ بلدٍ آخرَ سفتجۃً جازَ[1]	ایک شخص نے دوسرے شخص کو قرض دیکر کہا کہ فلاں شہر میں لکھ دیا جائے تو جائز نہیں ہے اور اگر بغیر کسی شرط کے قرض دے اور وہ شخص دوسرے شہر میں ہنڈی لکھ دے تو جائز ہے۔

یہ رائے تو فرغانہ کے ایک بڑے فقیہ قاضی خاں (حسن بن منصور المتوفی ۵۹۲ھ) کی تھی۔ لیکن اندلس کے ایک اور بڑے فقیہ قاضی ابوالولید سلیمان بن خلف الباجی المتوفی ۴۹۴ھ کی رائے اس سے مختلف ہے۔ چنانچہ انھوں نے سرکاری رقم کے بھیجنے کے متعلق موطا کی جو روایت اس سے پہلے گذر چکی اس کی شرح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "اگر قرض دینے والا اپنے قرض سے اس طرح نفع اُٹھانے کا ارادہ کرے کہ مقروض کے ذریعہ اپنا مال اس شہر میں جمع کرائے جہاں وہ بھیجنے کا ارادہ رکھتا ہو مثلاً ہنڈیوں کے جن کو مشرق والے استعمال کرتے ہیں تو امام مالکؒ کا مشہور مذہب یہ ہے کہ وہ جائز نہیں۔"

"لیکن ابوالفرج نے ہنڈیوں کو جائز قرار دیا ہے۔ اور انھوں نے جو جائز کہا تو شاید اس سے ان کا ارادہ اس ہنڈی سے ہو جس میں ہنڈی دینے والا بذاتِ خود نفع نہ اٹھائے ورنہ اس کی مخالفت ہے جبکہ قرض دینے والا نفع اٹھانے کا ارادہ رکھتا ہو۔ جس کا ذکر گزر چکا ہے[2]۔ ربوا کے سب قاعدوں کے تحت چونکہ

کل قرضٍ جرَّ نفعًا فھو حرامٌ۔	ہر قرض جس سے کہ نفع حاصل ہو وہ حرام ہے

کے اصول کو تابعین کے عہد میں تسلیم کر لیا گیا تھا جیسا کہ مشہور تابعی حضرت عطاء سے مصنف ابن ابی شیبہ میں منقول ہے۔

---

[1] فتاویٰ قاضی خاں ج ۳ صفحہ ۷۰، ۴ فصل فی مسائل السفتجۃ مطبوعہ کلکتہ ۱۸۳۵ء

[2] کتاب المنتقیٰ شرح موطا ج ۵ صفحہ ۱۴۹ مطبوعہ مصر

قَالَ كَانُوْا يَكْرَهُوْنَ كُلَّ قَرْضٍ جَرَّ مَنْفَعَةً   صحابہ ہر ایسے قرض کو مکروہ سمجھتے تھے جس سے نفع حاصل ہو۔

اسی مصنف میں منقول ہے کہ "دینار کہتے ہیں کہ میں نے حسن سے پوچھا کہ میں صراف کو بصرہ میں درہم دیتا ہوں اور اسی کے مثل درہم کوفہ میں لیتا ہوں۔ انھوں نے کہا کہ چوروں سے ڈر کر ایسا کیا جاتا ہے۔ جو قرض کہ نفع کمائے وہ ٹھیک نہیں ہے"[1]

خود صحابہ کرامؓ قرض کے نام سے لوگوں کو جو رقم دیتے تھے اپنے مقروض سے کسی قسم کے مادی استفادہ کو اس لیے ناپسند فرماتے تھے کہ کہیں سود کا دروازہ نہ کھل جائے ابو بردہ روایت کرتے ہیں کہ "جب میں مدینہ گیا تو عبداللہ بن سلامؓ سے ملا...... انھوں نے کہا کہ تم ایک ایسے ملک میں رہتے ہو جہاں سود کا بہت رواج ہے۔ اس لیے جب کسی شخص پر تمھارا کچھ قرض ہو اور وہ تمھارے پاس تھوڑی سی گھانس یا تھوڑے سے جو یا تھوڑا سا چارہ بھیجے تو اس کو نہ لینا کیونکہ یہ بھی سود ہے"[2] اس لیے ایسے سفتجے جو قرض لینے کے بعد کسی کو دیے گئے ہوں ان کو مکروہ قرار دیا جا سکتا ہے لیکن اگر کوئی اپنا روپیہ کسی بنک یا سیٹھ ساہوکار کی دوکان میں جمع کر دے اور بنک سے چک لے کر یا ساہوکار سے ہنڈی لے کر دوسرے شخص سے وصول کرے یا جیسے آج کل منی آرڈر کا یہ طریقہ ہے کہ آدمی ڈاک خانہ میں روپیہ جمع کرا دیتا ہے۔ ڈاک والے اس کے آرڈر کو مقام مطلوب پر بھیج دیتے ہیں۔ وہاں کا ڈاک خانہ روپیہ ادا کر دیتا ہے۔ بظاہر اس کے ناجائز ہونے کی کوئی وجہ نہیں چنانچہ خود حنفی فقہا نے بیان کیا ہے کہ قرض ہی روپیہ دیا جائے لیکن قرض دینے میں ہنڈی کی شرط نہ ہو اور بعد کو ہنڈی لکھ دی جائے کہ اس قرض کو فلاں شہر میں فلاں شخص کو دکھا کر وصول کر لینا تو جائز ہے قاضی خاں کا حوالہ اوپر

---

[1] مصنف ابن ابی شیبہ کتاب البیوع ج ۲ صفحہ ۱۹ قلمی نسخہ کتب خانہ سعیدیہ حیدرآباد دکن

[2] بخاری ج ۱ مناقب عبداللہ بن سلام

گزر چکا ہے۔ دوسرے فقہانے بھی اس کی صراحت کی ہے چنانچہ ابن ہمام نے "الواقعات" وغیرہ فتاوی سے نقل کیا ہے کہ

اَن اَقْرَضَه بِغَيْرِ شَرْطٍ وَكَتَبَ جَازَ — اگر بغیر شرط کے قرض دے اور وہ شخص (ہنڈی) لکھ دے تو جائز ہے۔

کفایۃ البیہقی ابن ہمام سے ابن ہمام ہی نے یہ جزیہ بھی نقل کیا ہے کہ

اَنْ يُقْرِضَ مُطْلَقًا ثُمَّ يَكْتِبَ السَّفْتَجَةَ فَلَا بَاسَ بِهِ۔ — اگر مطلق قرض دے پھر ہنڈی لکھ دیجائے تو کچھ حرج نہیں۔

اور جب قرض کی صورت میں بھی غیر مشروط ہونے کے بعد سفتجہ ہنڈی جائز ہے تو جہاں قرض نہ ہو وہاں اسے بدرجہ اولیٰ جائز ہونا چاہیئے[۲]

ھنڈاون ہنڈی کے بارے میں فقہاء کی بحث بیان کی جا چکی فقہ کی کتابوں نیز حدیثوں میں جہاں کہیں سفتجہ کا ذکر آیا ہے وہاں ہنڈاون یعنی ہنڈی کی اجرت کا کہیں تذکرہ نہ ہونے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں لوگ رضاکارانہ طور پر بے معاوضہ ہنڈیاں لکھ دیتے تھے، بے معاوضہ ہنڈیاں لکھنا درالمختار میں حدیث کے ذریعہ مکروہ بنایا گیا ہے بس ہنڈی بھیجنے کی اجرت اسے مباح کر دے گی، اس کی دلیل میں موطا کی ایک روایت یہ ہے کہ

اِنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ قَالَ فِي رَجُلٍ اَسْلَفَ رَجُلاً طَعَامًا عَلٰى اَنْ يُعْطِيَهُ اِيَّاهُ فِي بَلَدٍ آخَرَ، فَكَرِهَ ذَالِكَ عُمَرُ قَالَ: فَاَيْنَ الْحَمْلُ يَعْنِي حَمْلَانَهُ[۳]

حضرت عمرؓ نے ایک شخص کے بارے میں جس نے کسی کو اناج اس شرط پر قرض دیا تھا کہ فلاں شہر میں ادا کرے گا تو انھوں نے اسکو ناپسند کیا، اور کہا کہ باربرداری یعنی باربرداری کی اجرت کہاں جائے گی؟

۱۔ فتح القدیر جلد ۵ صفحہ ۴۵۲۔

۲۔ مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی: اسلامی معاشیات صفحہ ۴۲۳۔

۳۔ امام مالک: موطا باب مالا یجوز من السلف۔

غرض اگر موجودہ بنک بھیجنے کے مصارف وصول کریں تو کچھ حرج نہیں معلوم ہوتا آخر جب گھر کی حفاظت اور کاروان کی حفاظت کے لیے چوکیدار رکھے جاتے ہیں تو پھر رقم کی حفاظت اور بھیجنے کا معاوضہ کیوں نہ جائز ہو! البتہ ہنڈی کاری کا جو طریقہ رائج ہے اس میں اصلاح کی ضرورت ہے کیونکہ ایک تو تخمین وغیرہ کے ذریعہ ان کی مالیت کو مصنوعی طریقوں سے بڑھایا جاتا ہے دوسرے ان پر بٹہ کاٹا جاتا ہے۔

بٹہ کاٹنے کی ممانعت

ہنڈیوں کی جو رقم ہنڈی والوں کو واجب الادا ہوتی ہے اگر بنک اس کو ادائی کے مقررہ وقت سے قبل ادا کرتے ہیں تو بٹہ کاٹتے ہیں۔ تمام فقہاء اس طرح بٹہ کاٹنے کو ناپسند کرتے تھے حضرت زید بن ثابتؓ نے ـــ جو آنحضرتؐ کے کاتب اور ایک جلیل القدر صحابی گزرے ہیں ـــ بٹہ کاٹنے کی ممانعت فرمائی تھی چنانچہ عبید ابو صالح مولی سفاح اپنا یہ واقعہ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ "میں نے دار نخلہ والوں کے ہاتھ ادھار قیمت پر کپڑے فروخت کیے پھر جب میں کوفہ جانے لگا تو ان لوگوں نے کہا کہ اگر تم قیمت میں کمی کر دو تو ہم ابھی نقد رقم دیے دیتے ہیں۔ میں نے زید بن ثابتؓ سے اس بارے میں دریافت کیا۔ انھوں نے کہا کہ میں تجھے اس روپیہ کے کھانے اور کھلانے کی اجازت نہیں دے سکتا"[1]

مذکورہ روایت کی تشریح کرتے ہوئے ابو الولید سلیمان الباجی لکھتے ہیں کہ "دار نخلہ والوں نے ان (ابو صالح) سے کہا کہ قرض کی ادائی کی مدت پوری ہونے سے پہلے ان کا قرض نقد ادا کر دیں گے اور اس کی مثال ایسی ہی ہے کہ سو دینار ادھار تھے انھوں نے مدت پوری ہونے سے پہلے پچاس دینار نقد ادا کر دیے..... جمہور فقہا نے اس طرح لینے سے منع کیا لیکن نخعیؒ اور زفرؒ نے اس کی اجازت دی ہے ــــ ہم (ابو الولید) نے جو حرام کہا ہے تو اس کے لیے ہماری دلیل یہ ہے کہ ان لوگوں نے سو ادھار (موجلہ) کو پچاس حاضر

---

[1] امام مالک: موطا باب ما جاء فی الربا فی الدین

(معجل) میں خریدا۔ اور یہ دو وجہوں سے ناجائز ہے جنس واحد یعنے زر میں ایک تو تفاضل (نقد اضافہ) ہے اور دوسرے نساء (ادھار) ہے اور انھوں نے پچاس یہ سمجھ کر قرض دیے کہ مدت پر ان کے ذمہ سے پچاس ساقط ہوجائیں گے[1]

بیع وشراء کے قابل پرامیسری نوٹس اور بل آف اکسچنج (سفتجہ)

اسی سلسلہ میں قابل بیع وشرائی دستاویزوں کا مسئلہ بھی سامنے آتا ہے ایک شخص کسی کو معینہ مدت کے لیے قرض دیتا ہے پھر مدیون سے کہتا ہے کہ میری جگہ الف کو قرضہ ادا کیا جائے۔ پھر الف کہتا ہے کہ میری جگہ ب کو ادائی عمل میں لائی جائے وغیرہ۔ اس میں کوئی شرعی مخالفت نہیں۔ کیا یہی بیع وشراء کے قابل دستاویزیں نہیں چنانچہ سر عبدالرحیم نے وضاحت کی ہے کہ "ایک لحاظ سے بیع وشراء قابل پرامیسری نوٹ یا بل آف ایکسچنج (سفتجہ) عام قاعدہ کے مطابق ناجائز سمجھا جائے گا لیکن اگر کسی ملک میں ایسے نوٹوں یا بلوں کا قابل بیع وشراء ہونا اس طور سے رائج ہے کہ قرضدار کو معلوم ہے کہ اس کی بالکنایہ ذمہ داری میں اس طرح شامل ہے کہ وہ اپنے قرضدار کے منتقل الیہ کے ایما پر اس رقم کو ادا کرے تو یہ معاملہ اگرچہ نامناسب متصور ہو مگر قابل نفاذ ہوگا کیونکہ اس دستور کی موجودگی میں قرضدار کی رضامندی اس انتقال کے متعلق بالکنایہ سمجھی جائے گی۔ ممکن ہے کہ تابع کے حقوق یا ذات کے تعلق کا حق شرعی اثر سے کسی تیسرے شخص پر منتقل ہو جیسے بذریعہ توریث یا دیوالیہ ہو جانے کی صورت میں"[2]

حوالہ

اب اعتبار کی ایک اور شکل حوالہ (Novation) کی وضاحت کی جاتی ہے سفتجہ (ہنڈی) میں تو یہ ہوتا ہے کہ پہلے ایک شخص ہنڈی بنانے والے کے پاس رقم پیش کرتا ہے اور وہ اس کو مرتب کر کے تیسرے کے پاس ہنڈی بھیجتا ہے اور وہ اس کو قبول کرتا اور سکھارتا ہے لیکن "حوالہ کی نوعیت

---

[1] ۔ کتاب المنتقی شرح موطا ج ۵ صفحہ ۶۵ مطبوعہ مصر

[2] ۔ سر عبدالرحیم: اصول فقہ اسلام صفحہ ۲۸۹ ۔

یوں ہے کہ الف کو ایک قرضہ (ب) سے ملنا ہے اور (الف) خود (ج) کا مقروض ہے۔ تینوں آدمی اس پر اتفاق کرتے ہیں کہ (ج) بجائے اس کے کہ اپنا قرضہ (الف) سے اور (الف) (ب) سے وصول کرے (ج) رقم قرضہ (ب) سے وصول کرے[1] غرض ایک شخص کے ذمہ سے دوسرے شخص کے ذمہ قرض کی منتقلی یا دوسرے لفظوں میں اعتبار کی منتقلی کا نام حوالہ ہے۔ قرضوں کی منتقلی میں حوالہ سے بڑی مدد ملتی ہے۔ آگے چل کر اس بات کی وضاحت کی جائے گی بین الاقوامی تجارتی قرضوں کی بے باقی میں بھی حوالہ کی خاص اہمیت ہے۔ حوالہ ہنڈی کا بدل ہے اور جرمن مستشرق فان کریمر کی رائے ہیں " حوالہ سے متعلق جو قانونی تعریف فقہا نے کی ہے وہ خود مسلمانوں کے ترقی یافتہ اعلیٰ تجارتی ماحول کا ثبوت ہے۔ حوالہ کو اسی لیے اختیار کیا گیا تھا کہ وہ بدل کے طور پر بل آف ایکسچنج (سفتجہ) کا کام دے سکے[2]"

سفتجہ کے بارے میں گو فقہا میں اختلاف ہے لیکن حوالہ کو ان سب نے جائز قرار دیا ہے۔

وَهِيَ جَائِزٌ بِالدُّيُونِ[3] اور یہ قرضوں میں جائز ہے۔

امام بخاریؒ نے حوالہ کے جواز میں بطور دلیل کے یہ روایت لکھی ہے کہ ایک متوفی شخص کے جنازہ پر رسول کریمؐ نے نماز پڑھانے سے اس لیے انکار فرمایا کہ وہ قرضدار تھا۔ ابو قتادہ نے کہا کہ اے رسول خدا آپ اس کی نماز پڑھا دیجیے اور اس کا قرض میرے ذمہ ہے تو آپ نے نماز پڑھا دی[4] فقہا نے حوالہ کو صرف قرضوں ہی کی منتقلی سے مخصوص کیا ہے کہ

وَ اِنَّمَا اخْتَصَّتْ بِالدُّيُونِ[5] حوالہ قرضوں ہی میں مخصوص ہے۔

---

۱ - سر عبد الرحیم: اصول فقہ اسلام صفحہ ۲۸۹

۲ - فان کریمر: اورینٹ انڈر دی کیلفس باب ۶ ص۱۵۱

۳ - هدایہ ج ۳ کتاب الحوالہ - ۴ - بخاری پ ۹ باب الحوالہ

۵ - هدایہ ج ۳ کتاب الحوالہ -

بعض اصطلاحوں کی وضاحت

اس مقام پر دو تین اصطلاحوں کی تشریح ضروری معلوم ہوتی ہے تاکہ مطلب کے سمجھنے میں آسانی ہو۔

ایک اصطلاح محیل (حوالہ لکھنے والا) ہے۔ محیل وہ شخص ہے جو اپنی وصول طلب رقم دوسرے کے حق میں منتقل کردیتا ہے۔ دوسری اصطلاح محتال (رقم پانے والا مرسل الیہ) یعنے محتال وہ شخص ہے جس کے حق میں کسی نے اپنی وصول طلب رقم منتقل کردی ہو تیسری اصطلاح محتال علیہ (وہ شخص جس کے نام حوالہ ہو، حوالہ لینے والا) ہے یعنے وہ شخص جس سے وصول طلب رقم حاصل کرلینے کا حوالہ دیا گیا ہو مثلاً زید کے ذمہ بکر کے ہزار روپیے واجب الوصول ہیں لیں زید نے خالد پر حوالہ کیا اور خالد نے قبول کرلیا تو زید محیل ہے خالد محتال علیہ ہے اور بکر محتال ہے حوالہ ان تین افراد کی رضامندی سے صحیح ہوتا ہے[1] اور ان سب شرطوں کی تکمیل ضروری ہے جو عام طور سے کسی معاہدہ کرنے کے لیے ضروری ہیں۔

بہر طور حوالہ ایک ایسا معاہدہ ہے جس میں قرضدار اپنے قرض سے بری ہو جاتا ہے جبکہ دوسرا شخص قرض ادا کرنے کی ذمہ داری قبول کرلیتا ہے[2]۔

ایسی صورت میں قرضخواہ کے لیے یہ حق نہیں رہتا کہ وہ اصلی مقروض محیل (حوالہ لکھنے والے) سے رقم کا مطالبہ کرے مگر یہ کہ محتال علیہ (وہ شخص جس کے نام حوالہ ہو) اپنے ذمہ داری کی بجا آوری میں ناکام رہے۔ یا وہ مرجائے یا اس کا دیوالہ نکل جائے جس کی وجہ سے وہ حوالہ کی بے باقی نہ کرسکے تو ان صورتوں میں محتال (روپیہ پانے والا۔ یا بندہ) محیل سے رقم کی ادائی کے لیے مطالبہ کرنے کا حق رکھتا ہے۔

بین الاقوامی تجارت اور حوالہ کی اہمیت

بین الاقوامی تجارتی قرضوں کی بے باقی میں حوالہ کی خاص اہمیت ہے۔ حوالہ بیرونی ہنڈی (فارن بل آف اکسچینج) کا نعم البدل ثابت ہوسکتا ہے۔ حوالہ تمام قرضوں میں جائز ہے اور یہ قرضوں کی بے باقی کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ حوالہ کے لیے محتال علیہ کے مجلس میں موجود رہنے کی شرط نہیں ہے یہاں تک کہ اگر قرض دار نے ایک طالب کو

---

[1] ہدایہ ج ۳ کتاب الحوالہ۔
[2] ہدایہ ج ۳ کتاب الحوالہ

ایک غائب کا حوالہ کیا اور اس نے خبر پہنچنے پر قبول کر لیا تو حوالہ صحیح ہو گا۔ فقہ کی کتابوں میں ہے کہ "حوالہ کی صحت کے لیے محتال علیہ کی موجودگی ضروری نہیں ہے حتیٰ کہ اگر غائب شخص پر حوالہ کیا جائے اور وہ اس کو منظور کر لے تو حوالہ صحیح ہے"[1] اس قاعدہ سے بین الاقوامی تجارتی قرضوں کی بے باقی میں آسانی ہو جاتی ہے۔ ایک مثال کے ذریعہ اس بیان کی مزید وضاحت کی جاتی ہے۔ انگلستان میں غلہ اور دوسری خام پیداوریں بہت کم پیدا ہوتی ہیں۔ اس لیے وہاں کے لوگ علاوہ اور ملکوں کے مملکت حیدرآباد سے بھی ہر سال بڑی مقدار میں روئی، ارنڈی اور دوسرے تیل کے بیج خریدتے ہیں۔ حیدرآباد والے بھی انگلستان سے موٹریں اور دوسری کلیں خریدتے ہیں۔ اب اگر ان کی قیمتوں کی ادائی میں سمندر کے اس پار سے اس پار رقمیں بھیجی جاتی رہیں تو یہ ایک دقت طلب بات ہو گی لیکن قرض کے چند اقرارناموں کی وساطت سے اس ملک کی قیمت اس ملک کے مال کی قیمت میں آسانی سے محسوب ہو سکتی ہے۔ جیسے حیدرآباد کا وہ تاجر جس نے انگلستان کو تیل کے بیج بھیجے ہیں اپنی تیل کے بیج کی قیمت کی حد تک حوالہ لکھ سکتا ہے اب فرض کیجئے کہ حیدرآباد یا بمبئی کی ایک جماعت انگلستان سے موٹریں خریدتی ہے۔ اگر یہ حوالہ انگریزی مقروض کے پاس پیش ہو کر منظور ہو جائے تو صرف ایک ادائی سے سب کے لین دین کی بے باقی ہو جائے گی چنانچہ "اشہب کہتے ہیں کہ اگر دونوں کے اصل (راس المال) برابر ہوں تو حوالہ جائز ہے[2] اگر کچھ بقایا رہ بھی جائے تو جب موقع ملے ادائی کی جاسکتی ہے" غرض تجارت داخلہ کی طرح تجارت خارجہ میں بھی کھاتے کے جمع و خرچ سے استعمال زر میں بہت کچھ کمی ہو جاتی ہے۔ البتہ جب تجارت کا توازن بگڑ جاتا ہے اور ایک ملک دوسرے ملک کا بہت زیادہ قرضدار ہو جاتا ہے تو رقم کی منتقلی ناگزیر ہو جاتی ہے[3]

---

[1] - فتاوی قاضی خاں مسائل الحوالہ ج ۳ صفحہ ۷۹ ۴ مطبوعہ کلکتہ ۱۸۳۵ء

[2] - ابن رشد الحفید: ہدایۃ المجتہد ج ۲ صفحہ ۲۳۹ کتاب الحوالہ

[3] - جیونز: منی اینڈ دی میکانزم آف ایکسچینج باب ۲۳ صفحہ ۳۰۲

امام بخاری نے اپنی صحیح میں ایک مستقل باب قائم کر کے لکھا ہے کہ اسلامی حکومت کا مسلمان باشندہ غیر اسلامی حکومت کے کسی غیر مسلم باشندے کو اپنے معاملات میں وکیل بنا سکتا ہے اس کے ثبوت میں انھوں نے یہ روایت بیان کی ہے کہ "عبدالرحمن بن عوفؓ کہتے ہیں کہ میں نے امیہ بن خلف سے یہ معاہدہ لکھوایا تھا کہ وہ مکہ میں میرے اسباب کی حفاظت کرے اور میں مدینہ میں اس کے اسباب کی حفاظت کروں گا۔"[1]

منی آرڈر

منی آرڈر وصول کرنے کا یہ طریقہ ہے کہ ایک شخص سرکاری ڈاک خانہ میں روپیہ جمع کرا دیتا ہے۔ ڈاک والے رقمی حکم نامہ کو مقام مطلوب پر بھیج دیتے ہیں وہاں کا ڈاک خانہ روپیہ ادا کر دیتا ہے بظاہر اس کے ناجائز ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ لیکن ابتداء میں جب منی آرڈر کا نیا طریقہ جاری ہوا تو بعض ہندوستانی علماء نے اس طرح سے رقم بھیجنا مکروہ سمجھا[2] لیکن اس سلسلہ میں یہ بات نظر انداز نہ کرنا چاہیے کہ قرآن نے تجارتی اغراض کے لیے بری اور بحری سفروں کا حکم دیا ہے قرآن میں ہی سفر میں اشیاء رہن کرنے کے طریقے بیان کیے گئے ہیں تو ان کے فک رہن کے لیے رقم بھیجنے یا سفر میں ضرورتوں کے لیے مزید رقم منگوانے کا آخر کوئی نہ کوئی طریقہ تو ہونا چاہیے جب ہم کسی چیز کو مکروہ یا حرام قرار دیں تو ہمیں چاہیے کہ اس کا اس سے بہتر بدل پیش کریں جیسے قرآن نے سود کو حرام قرار دیا ہے تو ساتھ ہی ساتھ ساہوکاروں سے بچنے کے لیے سرکاری آمدنی میں قرضہ حسنہ کی ایک مد بھی رکھی۔

حدیثوں میں اجرت ترسائی کا لینا نہ صرف جائز بلکہ ضروری قرار دیا گیا ہے جس کی وضاحت ہنڈی کے تذکرہ میں ہو چکی۔

چیک

اعتبار کی ایک شکل چیک بھی ہے۔ چیک کیا ہے؟ ادائی کا محض ایک وثیقہ ہے "چیک ساہوکار (بینکر) کے نام ایک حکم ہوتا ہے جس میں

---

[1] بخاری پ۹ کتاب الوکالۃ۔

[2] احسن المسائل ترجمہ کنز الدقائق کا حاشیہ ملاحظہ ہو کہ "حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس سرہٗ نے منی آرڈر کو مکروہ فرمایا تھا" احسن المسائل صفحہ ۲۰۷ حوالہ کا بیان مطبع مجیدی کانپوری۔

چک کے حامل کو طلب کرنے پر چک میں درج کی ہوئی رقم ادا کرنے کی ہدایت کی جاتی ہے[1]

زر کو ادا کرنے کے بجائے اگر "زر کی ادائی کا حکم نامہ" یعنے چک دے دیا جائے تو آسانی سے کام نکل جاتا ہے۔ اسلامی ماخذوں سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہؓ کے زمانہ میں چک کا رواج عام ہوگیا تھا اور چک کو وہ صک کہتے تھے۔ دنیائے اسلام میں "حضرت عمرؓ پہلے شخص ہیں جنھوں نے چک اجرا کیے اور چکوں کے نیچے مُہر لگائی"[2]

مورخ طبری لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ "حضرت عمرؓ کے پاس ایک چک پیش کیا گیا جو شعبان میں واجب الادا تھا۔ آپ نے پوچھا کونسا شعبان؟ اب کا ہے یا آئندہ کا؟ پھر آپ نے صحابہؓ سے کہا کہ کوئی ایسا وقت مقرر کرو جس سے لوگوں کو دنوں اور مہینوں کی پہچان ہو جائے"[3]

اس موقع پر بیہقی کی یہ روایت دیکھنے کی ہے جلیل القدر تابعی حضرت ابو وائل بیان کرتے ہیں کہ "ابن زیاد نے مجھے بیت المال کا عامل مقرر کیا۔ ایک شخص ایک چک (صک) لیے میرے پاس آیا جس میں درج تھا کہ "مطبخ کے داروغہ کو آٹھ سو درہم ادا کرو"[4]

فقہانے چک سے متعلق کوئی خاص باب نہیں لکھا پھر بھی کہیں کہیں قانونی بحثوں میں چک "صک" کا ذکر کیا ہے[5]۔ ان سب کا یہاں تذکرہ بیجا طوالت کے خوف سے نظر انداز کرنا پڑا اس جگہ صرف یہی بتانا مقصود ہے کہ چک کے استعمال میں کچھ برائی نہیں اس سے تو مبادلہ دولت میں وسعت ہوتی ہے اور

---

[1] - جیوونز، منی اینڈ دی میکانزم آف اکسچینج باب ۱۹ صفحہ ۲۴۰ چک -

[2] - تاریخ یعقوبی ج ۲ صفحہ ۱۷۷ مطبوعہ لیڈن -

[3] - تاریخ طبری، عہد رسالت ص ۱۲۵ تاریخ کی ابتدا بروایت میمون بن مہران -

[4] - مطبخ کے داروغہ کو بیت المال سے آٹھ سو درہم دینے کی نسبت ابو وائل نے اعتراض کیا ابن زیاد نے کہا کہ "خزانہ کی کنجی رکھ دو اور جہاں جی چاہے چلے جاؤ" بیہقی ج ۶ ص ۳۵۴

[5] - تفصیل کے لیے ملاحظہ ہوں ھدایہ اور مبسوط کے بعض ابواب مثلاً کتاب الحوالہ، کتاب الرہن وغیرہ۔

عہد اسلامی میں اس کا بہت رواج تھا۔
بہر طور چیک، ہنڈی، حوالہ، کرنسی نوٹوں کی بدولت مبادلہ دولت کا ایک وسیع نظام قائم ہو جاتا ہے۔

(ج) بیت المال

بیت المال کی تعریف یوں تو "بیت المال" کا لفظ حکومت کے خزانے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے لیکن بیت المال سے وہ عمارت ہی مراد نہیں ہوتی جہاں حکومت کا مالی کاروبار انجام پاتا ہے بلکہ مجتمعہ عام دولت کا مفہوم بھی مراد ہوا کرتا ہے، بیت المال تمام مسلمانوں کی مشترکہ ملک سمجھا جاتا ہے جیسا کہ ھدایہ میں ہے کہ
مَالُ بَیْتِ الْمَالِ مَالُ عَامَّةِ الْمُسْلِمِیْنَ[1] بیت المال کا مال عام مسلمانوں کا مال ہے

بیت المال کی ابتداء "بیت المال" جن مجازی معنوں میں استعمال ہوتا ہے اس لحاظ سے تو اس کی ابتداء عہد رسالت ہی میں ہو چکی تھی لیکن رسول کریمؐ کے عہد مبارک میں بحرین، یمن اور عمان سے جزیہ خراج وغیرہ کی جو رقم وصول ہوتی تھی وہ گھڑی بھر میں مسجد نبوی ہی میں تقسیم کر دی جاتی تھی۔
وو سب سے پہلے حضرت ابوبکر صدیقؓ نے بیت المال قایم کر کے حضرت ابو عبیدہؓ کو اس کا مہتمم مقرر کیا لیکن حالت یہ تھی کہ جو مال بھی آپ کے پاس آتا تھا آپ اس کو مسلمانوں پر صرف کر دیا کرتے تھے، اسی وجہ سے بیت المال کے دروازے میں ہمیشہ قفل لگا رہتا تھا، حضرت ابوبکرؓ کی وفات پر حضرت عمرؓ نے چند صحابہ کے ساتھ جب بیت المال کا جائزہ لیا تو اسے خالی پایا۔[2]
حضرت عمرؓ کے زمانہ میں فتوحات کا سلسلہ بڑھتے بڑھتے جب مصر اور عراق سے

---

[1] ۔ ھدایہ ج ۴ کتاب الدیات صفحہ ۱
[2] ۔ تفصیل طبقات ابن سعد ج ۳ ص ۱۵۲ ابوبکر نیز سیوطی: تاریخ الخلفاء ص ۳۰

خراج وغیرہ آنے لگا تو آپ نے حکومت کے مرکز اور صوبوں میں باقاعدہ بیت المال اور اس کی شاخیں کھلوائیں۔ عبداللہ بن ارقمؓ کو امیر خزانہ مقرر کر کے ان کے تحت کئی اور اصحاب کو مقرر کیا۔ بیت المال کے باقاعدہ رجسٹر اور دیوان مرتب کیے گئے یہ پتا لگانا مشکل ہے کہ ہر جگہ کے خزانہ میں کتنی رقم محفوظ رہتی تھی۔ مورخ یعقوبی کی تاریخ سے اتنا پتا چلتا ہے کہ دارالخلافہ کے خزانہ سے خاص دارالخلافہ کے باشندوں کی مقررہ تنخواہوں اور وظیفوں وغیرہ کی مجموعی رقم تین کروڑ (درہم) سالانہ تھی۔[1]

بیت المال میں خلیفہ کی حیثیت

اگرچہ بیت المال خلیفہ اور اس کے نمائندوں کی نگرانی میں رہتا تھا لیکن شخصی طور سے خود خلیفہ کو بیت المال کی رقم پر بہت کم اقتدار حاصل تھا اس کی حیثیت محض ایک امین کی سی تھی،

اِنَّ الْمَالَ كَانَ بِيَدِهٖ بِمَنْزِلَةِ الْوَدِيْعَةِ لِجَمَاعَةِ الْمُسْلِمِيْنَ[2]	مال اس کے ہاتھ میں مسلمانوں کی جماعت کے لیے بمنزلہ امانت کے ہوتا ہے۔

یہی وہ چیز ہے جو سرکاری خزانہ پر شاہی اقتدار اور خلیفہ کے اقتدار کے فرق کو ظاہر کرتی ہے۔ وضاحت کے لیے ذیل میں حضرت عمرؓ کے دو مکالمے پیش کیے جاتے ہیں۔

حضرت سلمان فارسیؓ کا بیان ہے کہ ایک دن "حضرت عمرؓ نے ان سے پوچھا کہ آیا میں بادشاہ ہوں یا خلیفہ؟ سلمانؓ نے کہا کہ اگر آپ مسلمانوں کی سرزمین سے ایک درہم یا اس سے کم و بیش وصول کر کے اسے بیجا صرف کریں تو آپ بادشاہ ہیں ورنہ خلیفہ، حضرت عمرؓ نے اس بات سے ایک سبق لیا۔"

اسی طرح سفیان بن ابی العرجاء بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ "حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ بخدا میں یہ نہیں جانتا کہ آیا میں بادشاہ ہوں یا خلیفہ؟ اگر میں

---

[1] ۔ تاریخ یعقوبی ج ۲ صفحہ ۱۷۵

[2] ۔ کتاب المنتقی شرح موطاء کتاب القراض ج ۵ صفحہ ۱۵۰

[3] ۔ طبقات ابن سعد ج ۳ صفحہ ۲۲۱ مطبوعہ لیڈن ۔ نیز سیوطی: تاریخ الخلفاء ص۱۳۶ نیز تاریخ طبری صفحہ ۲۷۵۳ ، ۲۷۵۲ حصہ ۔

بادشاہ ہوتا تو یہ امر عظیم ہوتا۔"

"ایک شخص نے کہا کہ اے امیر المومنین! ان دونوں میں فرق ہے۔ آپ نے پوچھا وہ کیا؟ اس نے کہا کہ خلیفہ نہ تو بے جا لیتا ہے اور نہ بیجا صرف کرتا ہے اور الحمد اللہ کہ آپ ایسے ہی ہیں، اور بادشاہ تو لوگوں پر ستم ڈھاتا ہے اس سے لیتا ہے اور اس کو دیتا ہے۔ (یہ سن کر) حضرت عمرؓ خاموش ہوگئے۔"[1]

بیت المال سے بلاسودی قرضہ کا انتظام۔

اسلام نے اگر ایک طرف سودی کاروبار کو حرام قرار دیا تو دوسری طرف بلاسودی قرضہ کا مختلف طریقوں سے انتظام بھی کیا "سود کی ممانعت عہد نبوی کے آخری احکام میں سمجھی جاتی ہے اور خوش باش لوگوں کو قرضہ حسنہ کے احکام رسالت مآبؐ کی وفات سے بمشکل سال بھر پہلے کے ہیں اس لیے عہد نبوت میں اس کا کوئی "خصوصی ادارہ" وجود میں نہ آسکا"[2]

حدیثوں اور تاریخوں سے پتہ چلتا ہے کہ عہد نبوت میں دولت مند صحابہؓ مفلس صحابہؓ کو بطور قرض کے بلاسودی "قرضہ حسنہ" دیا کرتے تھے۔ خود رسول کریمؐ نے ایک مرتبہ چالیس ہزار کی رقم قرض لی تھی چنانچہ عبداللہ بن ابی ربیعۃ کا بیان ہے کہ

اِسْتَقْرَضَ مِنِّیَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَرْبَعِیْنَ اَلْفًا[3] — رسول کریمؐ نے مجھ سے چالیس ہزار قرض لیا تھا۔

غریبوں محتاجوں کو مفت خیرات دینا ہر مذہب میں جس طرح ایک نیک کام سمجھا جاتا ہے اسی طرح اپنی بے کار پڑی ہوئی رقم کو بطور قرض کے کسی کو مستعار دینا بھی اسلام میں نیکی ہے۔ قرآن مجید میں اکثر جگہ اس بات کی رغبت دلائی گئی ہے کہ

---

[1] طبقات ابن سعد ج ۳ صفحہ ۲۲۱ نیز سیوطی: تاریخ الخلفاء صفحہ ۵۴۔

[2] ڈاکٹر حمید اللہ: قرضہ حسنہ کی انجمنوں کی اہمیت اور حیدرآباد میں ان کی حالت مجلہ طیلسانین ج ۷ حصہ معاشیات ج ۲ ۱۹۴۳ء۔ [3] نسائی، باب الاستقراض کتاب البیوع

مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا کون ایسا ہے جو خدا کو قرضہ حسنہ دے
فَیُضٰعِفَهٗ لَهٗ وَلَهٗ اَجْرٌ کَرِیْمٌ۔ وہ اس کے لیے دونا کر دے گا اور اس کو بہت
پ ۲۷ الحدید ۵۷ ع ۱ اچھا بدلہ ملے گا۔

اس کے سوا حکومتی اخراجات کے موازنہ میں قرضہ حسنہ کی بھی ایک مستقل مد رکھی گئی تھی مالیات عامہ کے باب میں اس کی تفصیل کی گئی ہے۔ یہاں صرف اتنا اشارہ کافی ہے کہ "موازنہ سرکاری میں ایک مد قرضہ حسنہ کے لیے بھی رکھی گئی ہے حضرت عمرؓ وغیرہ کے زمانہ میں اس کے متعدد نظائر ملتے ہیں کہ لوگ اپنی تنخواہ کی ضمانت پر سرکاری بیت المال سے قرضہ لیا کرتے تھے اور یہ انجمن ہائے قرضہ حسنہ کی دنیا میں پہلی منظم کوشش تھی جو اسلام نے کی۔ اصل میں کسی خوش باش کو قرض کی ضرورت ہوتی ہے تو وہ کسی دوسرے خوش باش سے قرض مانگتا ہے جس پر سود لیا جاتا ہے، جب اسلام نے گوناگوں وجوہ سے سود کو حرام بلکہ خدا سے جنگ کا اعلان قرار دیا تو ضرورت تھی کہ ضرورت مندوں کے لیے سود کی لعنت میں مبتلا ہونے کا اندیشہ نہ رہے"

"غالباً دنیا کی اکثریت اس بات پر آمادہ نہ ہوگی کہ بے وجہ کسی کو اپنا مال قرض دے اسی لیے اس کا واحد حل یہی ہو سکتا ہے کہ حکومت قرضہ حسنہ دینے اور وصول کرنے کا انتظام کرے اور سود خواروں کے ناپاک وجود سے دنیا کو نجات دلائے۔"[1]

خود خلیفہ کو بھی اپنی ذات کے لیے رقم کی ضرورت ہوتی تو ان کو بھی قرض لینا پڑتا اور اس کی ادائی بھی ضروری ہوتی چنانچہ مورخ طبری اور ابن سعد وغیرہ کا بیان ہے کہ "جب کبھی حضرت عمرؓ کو ضرورت پڑتی تو بیت المال کے افسر کے پاس آتے اور قرضہ طلب کرتے۔ راوی کا بیان ہے کہ اکثر جب وہ خالی ہاتھ ہوتے تو ان کے پاس خزانہ کا افسر جا کر رقم کا تقاضہ کرتا، کبھی تو اسے ٹال دیتے اور کبھی اپنی تنخواہ سے دے کر قرضہ بے باق کر دیتے تھے۔"[2]

۱۔ بیت المال نظام آباد کے چوتھے سالانہ جلسے کا صدارتیہ از مولانا سید محمد بادشاہ حسینی صاحب
۲۔ تاریخ طبری صفحہ ۲۷۴۷ سنہ ۲۳ھ کے واقعات نیز طبقات ابن سعد ج ۳ صفحہ ۱۹۸۔

ابن سعد وغیرہ کے بیانوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ پر ان کی شہادت کے وقت ان کے ذمے بیت المال کے اسّی ہزار تھے[1] جنھیں ان کے صاحبزادوں نے ادا کیا اور یہ قرضہ انھوں نے تجارتی اغراض کے لیے لیا تھا۔

اس زمانہ کی حکومتیں بھی سرکاری خزانہ سے کبھی کبھار قرضہ حسنہ کے طور پر رقمیں مستعار دینے لگی ہیں خود ہندوستان میں "حکومت نے انجمنوں کو ابتدائی تین سال تک بے سودی قرضہ دینے کا وعدہ کیا ہے لیکن اس شرط سے کہ مطلوبہ قرضہ دو ہزار روپیے سے زیادہ نہ ہوگا اور صرف اس رقم کی مساوی مقدار تک دیا جائے گا جو متعلقہ انجمن اپنے طور پر فراہم کرے"[2]

حکومت حیدرآباد نے سابق سپاہیوں اور ان کے پسماندوں کے لیے جو بلاسودی قرضہ کا انتظام کیا ہے یا ابھی حال میں سعودی عرب کی حکومت نے شام کی حکومت کو جو بلاسودی قرض دیا ہے مالیات عامہ کے باب میں اس کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

پیدا آور قرضے غیر پیدا آور قرضوں کے علاوہ پیدا آور اغراض کے لیے بھی بیت المال سے قرض مل سکتا تھا یہاں تک کہ عورتیں بھی تجارتی اغراض کے لیے بیت المال سے قرض لیتی تھیں۔ چنانچہ مورخ طبری کا بیان ہے کہ "ہند بنت عتبہ حضرت عمرؓ کے پاس آئیں اور تجارت کے لیے چار ہزار کا قرض بیت المال سے طلب کیا اور اس کی ضمانت دی چنانچہ حضرت عمرؓ نے ان کو قرض دیا وہ بنو کلب کے شہروں کو گئیں اور خرید و فروخت کا کاروبار کیا"[3]

اوپر ہنڈی کے بیان میں یہ تفصیل کی جا چکی ہے کہ بصرہ کے گورنر

---

[1] طبقات ابن سعد ج ۳ صفحہ ۲۶۰ کَانَ عُمَرُ بن الخطابؓ قد اَستسلَفَ مِن بَيتِ المَالِ ثَمانِينَ الفًا۔

[2] معاشیات ہند از جتھار و بیری جلد اول باب ۱۰ صفحہ ۳۱۴ بحوالہ ایکٹ ۱۹۰۴ء

[3] تاریخ طبری صفحہ ۲۷۶۶ ۲۳ھ کے واقعات۔

ابو موسیٰ اشعریؓ نے بیت المال کی کثیر رقم عبداللہ بن عمرؓ اور عبیدہ بن عمرؓ کو تجارتی اغراض کے لیے دی تھی' ان دونوں نے عراق سے تجارتی سامان خریدا اور مدینہ میں لاکر نفع سے فروخت کرکے بیت المال کی پوری رقم اور آدھا نفع مدینے کے مرکزی بیت المال میں داخل کیا۔

کاشتکاروں کو بھی زرعی اغراض کے لیے بیت المال سے قرض ملتا تھا اور اس میں مسلم غیر مسلم کی کچھ تخصیص نہ تھی فتح القدیر میں لکھا ہے کہ اگر کاشتکاروں کے پاس کاشت کے لیے رقم نہ ہو تو زرعی تقاوی کے طور پر حکومت کی طرف سے کسانوں کو قرضے دینے چاہئیں۔[1]

یہاں یہ بات باعث دلچسپی ہے کہ عہد جدید کے مشہور موجد اور سائنس داں تھامس اڈیسن نے اپنے ایک منصوبے کے لحاظ سے یہ مشورہ دیا تھا کہ حکومت کھیت کی پیداوار کی کفالت پر کسانوں کو بلاسودی قرضہ دیا کرے۔[2]

بیت المال سے پیداآور اغراض کے لیے قرض لینے کا اصل نکتہ یہ ہے کہ یا تو قرض لینے والے کے مقسوم سے کچھ سروکار نہ رہے یا اس کے نفع اور نقصان میں حصہ قایم کیا جائے۔ ھند بنت عتبہ کو تجارتی اغراض کے لیے جو قرض دیا گیا تھا اس کے نفع نقصان میں بیت المال نے کچھ سروکار نہیں رکھا تھا اس لیے ھند سے پورا اصل وصول کیا گیا وہ جب یہ مدینہ میں واپس آئیں تو گھاٹے کا اظہار کرکے کچھ رقم کم کروانا چاہا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اگر میرا روپیہ ہوتا تو میں چھوڑ دیتا، بیت المال میں جو کچھ بھی ہے وہ سب مسلمانوں کا مال ہے اس میں سے ایک حبہ بھی نہیں چھوڑ سکتا اور پوری رقم وصول کر لی۔[3]

دوسرے خلفاء راشدین کے عہد میں بھی بیت المال سے قرض دیے جانے کی نظیریں موجود ہیں چنانچہ مورخ طبری کا بیان ہے کہ حضرت عثمانؓ کے عہد خلافت میں سعد ابن ابی وقاصؓ کو بیت المال سے رقم قرض دی گئی تھی۔[4]

---

[1] فتح القدیر ج ۳ صفحہ ۳۰۶۔ [2] سمی۔ ایل۔ سوار ٹنز: واٹ ایز میوچول الیزم صفحہ ۶۴
وو حجاج بن یوسف نے زمین کی آبادکاری کے لیے عراق کے کاشتکاروں کو بیس لاکھ درہم قرض دیے تھے
یاقوت: معجم البلدان ج ۵ صفحہ ۱۶۱ سواد۔
[3] تاریخ طبری صفحہ ۲۷۶۲ سنہ ۲۳ھ [4] تاریخ طبری صفحہ ۔۔۔۔ عہد خلافت عثمانؓ نیز ابن اثیر ج ۳ صفحہ ۳۴

موجودہ بنک بھی تجارتی، صنعتی اور دوسری پیدا آور اغراض کے لیے سرمایہ فراہم کرتے اور سود دیتے ہیں۔ لیکن اسلامی بیت المال لوگوں کو کاروباری اغراض کے لیے قرض دیتا اور کمی بیشی کے ساتھ نفع نقصان میں شریک ہوتا تھا۔

اصل بات یہ ہے کہ سود کے جواز کی تائید میں کوئی دلیل ہی نہیں ہے اگر آپ کہیں کہ ہم معاوضہ اس وجہ سے طلب کرتے ہیں کہ اس کے ذریعے قرض لینے والا نفع اٹھاتا ہے تو ہم کہتے ہیں کہ آپ صرف اسی صورت میں اس سے معاوضہ طلب کریں جب قرض لینے والا نفع کمائے، اور یہ بات ہر ایک جانتا ہے کہ کاروبار میں نفع بھی ہوتا ہے اور نقصان بھی، آپ اس کے منافع میں شریک ہو کر اس کے آڑے وقت میں اس کو تنہا نہیں چھوڑ سکتے۔

غیر پیدا آور اغراض کے لیے جو قرضہ دیا جاتا ہے اس کی یہ صورت ہے کہ نہ قرض لینے والے کا ایسا نقصان ہو کہ اس کو اصل پر مزید زیادتی سود کی صورت میں ادا کرنی پڑے اور نہ قرض دینے والے کو ایسا نقصان ہو کہ اس کے اصل میں کمی ہو کر نقصان اٹھانا پڑے۔ امام رازیؒ نے سود کے سلسلے کی قرآنی آیت "لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ" (نہ تم کسی پر ظلم کرو اور نہ کوئی تم پر ظلم کرے) کی تفسیر بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "نہ تو مقروض پر ظلم ہو کہ اس سے اصل (راس المال) پر زیادتی طلب کی جائے اور نہ تمھیں تمھارے اصل (راس المال) میں کمی سے نقصان اٹھانا پڑے[1] حجۃ الوداع کے موقع پر رسول کریمؐ نے صاف الفاظ میں اعلان فرما دیا کہ "ہر قسم کا سود ساقط ہے البتہ اصل رقم تمھاری ہے اور وہ تم کو ملنی چاہیے تاکہ نہ تم پر ظلم ہو اور نہ تم دوسروں پر ظلم کرو"[2]

قرآن مجید نے جا بجا مال دار طبقہ کو کہیں رغبت دلائی ہے اور کہیں حکم دیا ہے کہ وہ نادار طبقہ کو ان کی ضرورتوں کے وقت روپیہ قرض دیا کرے۔

---

[1] - تفسیر کبیر رازی ج ۲ آیت مذکورہ۔

[2] - تاریخ طبری صفحہ ۱۷۵۳، ۱۰ھ کے واقعات نیز ابوداؤد پ ۲ کتاب البیوع۔

قرآن نے اس کو بھی ایک بڑی نیکی شمار کیا ہے۔ اس طرح دولتمند کا روپیہ بھی محفوظ رہتا ہے اور معاشرہ کے ایک فرد کا کام بھی نکل جاتا ہے۔

ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ سودی قرضوں کا اسلامی مملکت میں کہیں نام ونشان تک نہ رہا۔ کچھ لوگ تو اپنے بعد اپنی کچھ رقم وقف بھی کر جاتے تھے تاکہ لوگوں کو بلا سودی قرضہ ملتا رہے اور دنیا میں ایک کار خیر جاری رہے چنانچہ مراکش کے پائے تخت شہر فاس کے مشہور علم دوست امیر سید عبدالحی الکتانی نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب نظام الحکومۃ النبویہ میں اپنے وطن کا یہ دلچسپ واقعہ ضمنی طور پر لکھا ہے کہ خیراتی اوقاف کے طور پر کبھی سو سال ہوئے ایک مراکشی مخیر نے لوگوں کو بلا سودی قرضہ دینے کے لیے کئی ہزار اشرفیاں وقف کی تھیں بڑی مدت تک یہ کام چلتا رہا پھر متولیوں کی نااہلی سے قرض داروں نے اسے ختم کر دیا[1]۔

گزشتہ صدی میں پیری جوزف پرودھن نامی ایک اشتراکی نے سود کو معاشی خرابیوں کی جڑ قرار دیا تھا اور اس کے ازالہ کی اس نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ ایک بنک مبادلہ قائم کیا جائے اور صناع کاریگروں کو یہ بنک قرضہ بغیر سود کے دے وہ کہتا ہے کہ اگر ایسا بنک قائم ہو جائے تو پھر کوئی شخص سرمایہ داروں سے قرض نہیں لے گا[2]۔

قرض کی ادائی

قرض کو جلد سے جلد ادا کرنے کی کوشش کرنا مقروض کا فرض ہے رسول کریمؐ نے "مال دار کا ادائے قرض میں دیر کرنا ظلم قرار دیا[3]" آنحضرتؐ نے قرض کی ادائی کا نفسیاتی پہلو بھی بتا دیا ہے کہ "جو شخص لوگوں کا مال قرض لے اور اس کے ادا کرنے کا ارادہ رکھتا ہو تو اللہ اسے ادا کر دیتا ہے

---

[1] تفصیل کے لیے ڈاکٹر حمید اللہ: انجمن ہائے قرضہ حسنہ کی اہمیت اور حیدر آباد میں ان کی حالت، مجلہ طیلسانین عثمانیہ ج ۷ حصہ معاشیات ج ۲ بابتہ ۱۹۴۳ء۔

[2] جوزف پرودھن: واٹ از پروپرٹی صفحہ

[3] بخاری پ۹ باب الحوالہ نیز بخاری پ۹ کتاب القرض

اور جو شخص ضائع کر دینے کا ارادہ رکھتا ہو تو اللہ اسے ضائع کر دیگا[1]

رسول کریمؐ کو قرض کی ادائی کا کس قدر خیال رہتا تھا اس کا اندازہ اس سے ہوگا کہ ایک مرتبہ "نبی کریمؐ کے پاس ایک جنازہ لایا گیا تاکہ آپ اس کی نماز پڑھا دیں تو آپ نے فرمایا کہ کیا اس پر کچھ قرض ہے؟ لوگوں نے کہا۔ نہیں، تو آپ نے اس کی نماز پڑھا دی۔ پھر دوسرا جنازہ لایا گیا تو آپ نے پوچھا کہ کیا اس پر کچھ قرض ہے؟ لوگوں نے کہا۔ ہاں! تو آپ نے فرمایا کہ تم لوگ اپنے اس دوست کی نماز پڑھ لو، ابو قتادہ نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! اس کا قرض میرے ذمہ ہے پس آپ نے اس کی نماز پڑھا دی[2]" اس طرح آپ نے ایک سبق دیا کہ ایک مسلمان دوسرے کے قرض کی ذمہ داری لے۔

مقروض اپنا قرض ادا نہ کرے تو قرضخواہ کے لیے آخری چارہ کار یہی رہتا ہے کہ عدالت کا دروازہ کھٹکھٹائے "جب حاکم عدالت (قاضی) کے نزدیک حق ثابت ہو جائے اور حق دار نے اپنے مقروض کا قید کیا جانا چاہا تو حاکم عدالت اس کے قید کرنے میں جلدی نہ کرے گا بلکہ قرض دار کو حکم دیگا کہ جو کچھ اس کے ذمہ ہے ادا کر دے اس واسطے کہ قید کرنا ٹالم ٹول کرنے کی سزا ہے تو ٹالم ٹول کا ظاہر ہونا ضروری ہے[3]

"پھر اس کے بعد اس نے دینے سے انکار کیا تو اس کو قید کرے کیونکہ اس کا ٹال مٹول کرنا ظاہر ہو گیا[4]"

اور اگر حاکم عدالت کے سامنے یہ بات ثابت ہو جائے کہ مقروض نادار ہے اور اس کا دیوالہ نکل چکا ہے تو مقروض قید نہیں کیا جائے گا اور اس کو ادا کرنے کے لیے

---

[1] - بخاری پ ۹ کتاب المقرض -

[2] - بخاری پ ۹ کتاب الکفالۃ نیز ابو داؤد پ ۲۱ کتاب البیوع نیز موطا مسلم اور ترمذی کے ابواب البیوع

[3] - ھدایہ ج ۳ کتاب ادب القاضی فصل فی الحبس

[4] - ھدایہ ج ۳ کتاب ادب القاضی فصل فی الحبس

مہلت دی جائے گی۔ "پھر جب مدعی کا یہ قول تسلیم کرلیا جائے کہ اس کے پاس مال ہے یا گواہی سے ثابت ہو جائے کہ اس کے پاس مال ہے تو حاکم عدالت اس کو دو یا تین مہینے تک قید خانہ میں رکھ کر پھر اس کا حال دریافت کریگا۔ بس قید کرنا اس وجہ سے ہے کہ اس کا ٹال مٹول ظاہر ہو۔ اور اس مدت کے لیے قید کرے کہ اس کا کچھ مال جسے چھپاتا ہے وہ ظاہر ہو جائے۔ اس کے لیے اتنی مدت ضروری ہے جس سے یہ غرض حاصل ہو جائے[۱]

اس دوران میں حاکم عدالت مختلف ذریعوں سے اس کا حال معلوم کرے گا کہ اس نے اگر مال کہیں چھپا دیا ہو تو اس کا کھوج لگ جائے پھر" اگر مال کا ہونا ثابت نہ ہو تو اس کو چھوڑ دیا جائے گا[۲]

کسی دیوالیہ کو قید کرنا فقہا نے ظلم قرار دیا ہے[۳]

جب حاکم عدالت، مقروض کو دیوالیہ قرار دے تو پھر قرض خواہ کو اس کے درمیان میں حائل ہونے کا اختیار نہیں رہتا" صاحبین لکھتے ہیں کہ جب مدیون کو حاکم مفلس دیوالیہ قرار دے تو اس کے اور اس کے قرض خواہوں کے درمیان روک قایم کردی جائے گی۔ مگر اس صورت میں کہ وہ اس کے پاس مال ہونے کے گواہ پیش کریں[۴]

اسلامی قانون میں مقروض کو قید کرنے کا منشا ہمیں معلوم ہو چکا "قانون روما کے تحت قرضخواہ، مقروض کے جسم کو ٹکڑے ٹکڑے کرکے بانٹ لیتے تھے اور یونان اور روما کی قدیم قوموں میں مقروض اور اس کے اہل و عیال کو غلام بنا کر فروخت کر دیا جاتا تھا[۵]

۱۔ ھدایہ ج ۳ کتاب ادب القاضی فصل فی الحبس۔

۲۔ ھدایہ ج ۳ کتاب ادب القاضی فصل فی الحبس۔

۳۔ ھدایہ ج ۳ کتاب ادب القاضی فصل فی الحبس۔

۴۔ ھدایہ ج ۳ کتاب الحجر باب الحجر بسبب الدین۔

۵۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا ج ۳ صفحہ ۳۲۱ بینکر پٹسی۔

صاحب جائداد اگر مقروض مرجائے تو اسلامی قانون کی رو سے متوفی کی جائداد سے اس کا قرض ادا کیا جائے اور اگر مقروض نادار مرے تو بیت المال سے اس کا قرض ادا ہوگا۔

ابتدا میں جب کوئی مسلمان مقروض مرجاتا تو دوسرا کوئی مسلمان یا اس کا قرابت دار اس کے قرض کی ادائی کی ذمہ داری لے لیتا تھا پھر جب بیت المال کی آمدنی بڑھی تو بیت المال سے ناداروں کے قرضوں کی ادائی ہونے لگی۔ آنحضرتؐ کے پاس کوئی جنازہ لایا جاتا جس پر قرض ہوتا تو آپ اس کی نماز جنازہ نہ پڑھتے اور مسلمانوں سے کہہ دیتے کہ تم اپنے ساتھی کی نماز پڑھ لو۔ پھر جب اللہ تعالیٰ نے آپ کو فتحیں عنایت کیں تو آپ نے فرمایا کہ

أَنَا أَوْلَى بِكُلِّ مُؤْمِنٍ مِنْ نَفْسِهِ فَمَنْ تَرَكَ دَيْنًا فَعَلَيَّ قَضَاؤُهُ وَمَنْ تَرَكَ مَالًا فَلِوَرَثَتِهِ[1]۔

میں مسلمانوں کا خود ان کی ذات سے زیادہ دوست ہوں لہٰذا جو شخص کچھ قرض چھوڑ مرے تو اس کا ادا کرنا میرے ذمہ ہے اور جو شخص مال چھوڑے وہ اس کے وارثوں کا ہے۔

رسالت مآبؐ کے بعد آپ کے خلفاء نے ان ذمہ داریوں کو قبول کیا اور خلفاء راشدین کے عہد میں یہ عمل درآمد جاری رہا کہ نادار مقروضوں کے قرضوں کی بے باقی سرکاری خزانہ یعنے بیت المال سے ہوتی تھی۔ عہد جدید میں بھی اس قسم کی ایک نظیر خود ہندوستان کی ایک چھوٹی سی ریاست بھاؤنگر میں دیکھی گئی خود دربار نے رقم کی ادائی کو اپنے ذمہ لے لیا چنانچہ مصالحت قرضہ کی انجمنوں کو "بھاؤنگر میں سب سے بڑھ کر کامیابی ہوئی جہاں قرضوں کا تصفیہ اور ان میں بڑی حد تک کمی کردینے کے بعد رقم کی ادائی کو دربار نے اپنے ذمہ لے کر دین داروں کے سب مطالبوں کو پورا کردیا۔" بھاؤنگر میں جو کامیابی ہوئی جنتھا اور دیہی صاحبان

---

[1] - بخاری پ ۹ کتاب الکفالۃ نیز بخاری پ ۲۲ کتاب النفقۃ بخاری کے علاوہ موطا، مسلم، ابوداؤد وغیرہ کے باب میں یہ حدیث ہے۔

اس کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ "اس لیے کہ یہاں نہ صرف والی ریاست مالگذاری کا بقایا معاف کرنے کے لیے تیار تھا بلکہ ایک قابل اور نیک دل شہر پرا بہا شنکر پٹانی بھی موجود تھا۔ اور حقیقی صورت سے متاثر ہو کر ساہوکار بھی اپنی ذہنیت بدلنے اور اپنے مطالبات میں ۲۵ فیصد کمی کرنے کے لیے آمادہ تھے[1] قبل ازیں یہ واضح کیا جا چکا کہ اسلام لانے کے بعد ساہوکاروں کی ذہنیت اتنی بدل چکی تھی کہ انھوں نے قرآنی احکام کے بموجب تمام واجب الوصول سود معاف کر دیا اور صرف اپنا اصل (کیپٹل) لینا منظور کر لیا تھا۔

(۳) قرضہ کا تحفظ، رہن اور رجسٹری

رجسٹری قرض کی ادائی اور ضمانت کی جو صورتیں ہو سکتی ہیں اسلام کے قانونی نظام میں انھیں بھی اختیار کیا گیا ہے یعنی رہن، گواہی، کفالت بالمال اور رجسٹری کے ذریعہ اپنے قرضوں کو محفوظ کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔

ان مسائل کی جو اہمیت ہے اس کا اندازہ صرف اس سے ہو سکتا ہے کہ خود قرآن مجید میں پورا ایک رکوع رہن، رجسٹری اور وصولی کے قوانین نا شہادت کے قواعد کے ساتھ موجود ہے تاکہ کسی شخص کا قرض ضائع ہونے کے پورے خطرے سے تا امکان محفوظ ہو جائے قرآن میں مسلمانوں کو یہ ہدایت کی گئی ہے کہ

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ! إِذَا تَدَايَنتُم بِدَيْنٍ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوهُ ۚ وَلْيَكْتُب بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌ بِالْعَدْلِ ۚ وَلَا يَأْبَ كَاتِبٌ أَن يَكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللَّهُ۔	مسلمانو! جب تم ایک معین میعاد کے لیے کسی سے قرض کا معاملہ کرو تو اس کو لکھ لیا کرو۔ کاتب کو چاہیے کہ اس قرض کی دستاویز عدل و انصاف سے لکھے، کاتب کو چاہیے وہ لکھنے سے انکار نہ کرے اور جس طرح خدا نے سکھایا ہے لکھ دے۔

[1] جتھار و بیری: معاشیات ہند ج ۱ باب ۹ صفحہ ۴۳۰

فَلْيَكْتُبْ وَلْيُمْلِلِ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ
وَلْيَتَّقِ اللَّهَ رَبَّهُ وَلَا يَبْخَسْ
مِنْهُ شَيْئًا ۔

اور قرض کا تمسک وہ شخص لکھوائے
جس کے ذمہ قرض عائد ہوگا اور اپنے
پروردگار سے ڈرتے رہنا چاہیے اور
اس میں کچھ بھی کاٹ چھانٹ نہ کرے۔

فَإِنْ كَانَ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيهًا
أَوْ ضَعِيفًا أَوْ لَا يَسْتَطِيعُ أَنْ يُمِلَّ
هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهُ بِالْعَدْلِ ۚ

اگر وہ شخص جس پر کہ قرض عائد ہوگا
بے شعور ہو یا ضعیف ہو یا (تمسک)
لکھوانے کی قابلیت نہ رکھتا ہو تو اس کا
ولی انصاف کو ملحوظ رکھ کر شرطیں لکھوائے

وَاسْتَشْهِدُوا شَهِيدَيْنِ مِنْ
رِجَالِكُمْ ۖ فَإِنْ لَمْ يَكُونَا رَجُلَيْنِ
فَرَجُلٌ وَامْرَأَتَانِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ
مِنَ الشُّهَدَاءِ أَنْ تَضِلَّ إِحْدَاهُمَا
فَتُذَكِّرَ إِحْدَاهُمَا الْأُخْرَىٰ ۔

اور قرض کے اس معاملہ میں تم اپنے ہی
دو آدمیوں کو گواہ بنا لو اگر دو مرد نہ ہوں تو
ایک مرد اور دو عورتیں ہونی چاہییں جن پر
کہ تمھیں اطمینان ہے تاکہ اگر ایک بھول جائے
تو دوسری اس کو یاد دلائے۔

وَلَا يَأْبَ الشُّهَدَاءُ إِذَا مَا دُعُوا ۚ
وَلَا تَسْأَمُوا أَنْ تَكْتُبُوهُ صَغِيرًا أَوْ
كَبِيرًا إِلَىٰ أَجَلِهِ ۚ ذَٰلِكُمْ أَقْسَطُ
عِنْدَ اللَّهِ وَأَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَأَدْنَىٰ
أَلَّا تَرْتَابُوا ۖ إِلَّا أَنْ تَكُونَ تِجَارَةً حَاضِرَةً
تُدِيرُونَهَا بَيْنَكُمْ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ
أَلَّا تَكْتُبُوهَا ۗ وَأَشْهِدُوا إِذَا تَبَايَعْتُمْ ۚ
وَلَا يُضَارَّ كَاتِبٌ وَلَا شَهِيدٌ ۚ وَإِنْ
تَفْعَلُوا فَإِنَّهُ فُسُوقٌ بِكُمْ ۗ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۖ
وَيُعَلِّمُكُمُ اللَّهُ ۗ
وَاللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ۔

اور جب گواہوں کو گواہی کے لیے بلایا جائے تو
آنے سے انکار نہ کریں، میعادی (قرض کا معاملہ خواہ)
چھوٹا ہو یا بڑا اس کے لکھنے میں کبھی سستی سے
کام نہ لو، اور خدا کے نزدیک نہایت ہی منصفانہ
کارروائی ہے اور گواہی کے لیے بھی یہ بہت مناسب
طریقہ ہے اور نیز شک شبہ کی بہت کم گنجائش ہے اگر
آپس کے نقد چالو لین دین کو نہ لکھو تو کچھ ہرج نہیں۔
خرید و فروخت کے وقت کسی کو گواہ بنا لو دستاویز
کے کاتب اور گواہ کو کسی قسم کا بھی نقصان پہنچایا
جائے اگر ایسا کروگے تو یہ تمھاری شرارت (مقصود)
ہوگی خدا سے ڈرو ۔ خدا تمھیں سکھاتا ہے اور
اللہ ہر ایک چیز سے واقف ہے ۔

وَاِنْ كُنْتُمْ عَلٰى سَفَرٍ وَّلَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ ؕ	اگر کبھی تم سفر پر ہو اور کوئی دستاویز لکھنے والا نہ ملے تو رہن بالقبض رکھ دو۔
فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِى اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ ؕ	اگر تم میں سے ایک کا ایک پر اعتبار ہو تو جس کا اعتبار کیا گیا (یعنے مقروض) کو چاہیئے کہ وہ امانت (یعنے قرض) کو ادا کرے۔ اور اپنے پروردگار سے ڈرتا رہے نہ کبھی
وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ؕ وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗٓ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ ؕ	تم گواہی کو نہ چھپاؤ۔ جو کوئی گواہی کو چھپاتا ہے تو ایسے شخص کے دل میں کھوٹ ہے۔ اور جو کچھ
وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ۔	تم کیا کرتے ہو خدا اس سے باخبر ہے۔
پ۳ - البقرہ ع۳۹	

رہن

رہن سے متعلق ایک تفصیلی باب حدیث اور فقہ کی کتابوں میں "کتاب الرہن" کے نام سے پایا جاتا ہے۔ بخاری کی روایتوں میں ہے کہ "رسول کریمؐ نے ایک یہودی سے کچھ غلہ ایک مدت کے وعدہ پر مول لیا تھا اور اپنی زرہ اس کے پاس رہن رکھ دی تھی"[1]

رہن کی تعریف

عام طور پر فقہ کی کتابوں میں رہن کی یہ تعریف پائی جاتی ہے کہ "لغت میں رہن کے معنے کسی شئے کو کسی بنا پر روک رکھنے کے ہیں اور شریعت میں کسی شئے کو کسی حق مثلاً قرضوں کے مقابلہ میں روک رکھنا جس کا حاصل کرنا اس چیز سے ممکن ہو"[2]

غرض رہن صرف ایک ضمانت ہے اور یہ معاملہ ایجاب اور قبول سے طے پاتا ہے اور جب شئے، مرتہن کے حوالے کر دی جائے تو رہن کا معاملہ تکمیل کو پہنچتا ہے[3]

رہن اسی غرض سے جائز ہوا ہے کہ اگر قرضدار سے قرض وصول نہ ہو سکے تو اس کی مرہونہ جائداد سے وصول کر لیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر ایک شئے جو

---

[1] - بخاری ج۱ باب الرہن نیز بخاری کے علاوہ موطا، مسلم، ابوداؤد اور ترمذی کے ابواب الرہن۔

[2] - ھدایہ ج ۴ کتاب الرہن۔ [3] ھدایہ ج ۴ کتاب الرہن۔

درخت ہوسکتی ہے رہن کی جاسکتی ہے اور اس طرح منقولہ جائداد اور غیر منقولہ دونوں رہن ہوسکتی ہیں عام اصول یہ ہے کہ "ایسی شئے ہونی چاہیے کہ مدت گزرنے پر بیچی جاسکے"[1]

مرتہن کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ مرہونہ شئے کو قرضہ کی ادائی تک اپنے قبضہ میں رکھے لیکن مرتہن کو مرہونہ شئے کے استعمال کرنے یا اس کی پیداوار سے نفع حاصل کرنے کا بغیر راہن کی اجازت کے کوئی حق نہیں۔ ہے چاہے منفعت کی صورت خدمت لینے کی ہو یا سکونت کرنے کی یا پہننے کی۔[2]

رہن ایک امانت ہے مرہونہ شئے مرتہن کے پاس بطور امانت کے ہوتی ہے۔

هُوَ اَمَانَةٌ فِي يَدِهٖ ۔ وہ اس کے ہاتھ میں امانت ہوتی ہے۔

اسی بناء پر مرتہن اس کی دیکھ بھال اور حفاظت کا ذمہ دار ہوتا ہے، پس اگر شئے مرہونہ مرتہن کے قبضہ میں ضائع ہو جائے اور وہ بلحاظ قیمت کے قرض کی مقدار کے مساوی ہو یا اس سے زیادہ ہو تو قرض بے باق ہو جاتا ہے اور زیادتی کی بابت راہن کو مرتہن سے وصول یابی کا حق رہے گا، برخلاف اس کے، اگر وہ شئے قرضہ کی مقدار سے کم قیمت ہو تو مقروض سے تفاوت کو طلب کرنے کا حق رہے گا جو قرضہ کی مقدار اور مرہونہ شئے کی قیمت میں تھا چنانچہ ہدایہ میں ہے کہ

(۱) "اگر مرہونہ شئے مرتہن کے پاس تلف ہو جائے اور مرہونہ شئے کی قیمت اور قرض دونوں مساوی ہوں (تو قرض کی ادائی راہن کے ذمہ سے ساقط ہو جائے گی) گویا مرتہن نے قرضہ پالیا"

(۲) "اگر مرہونہ شئے کی قیمت زائد ہو تو جو کچھ زیادتی ہے وہ

---

[1] ۔ ابن رشد: بدایۃ المجتہد کتاب الرہن ج ۲ صفحہ ۲۲۸ مطبوعہ مصر۔

[2] ۔ ھدایہ ج ۴ کتاب الرہن ۔ انتفاع کے مسئلہ میں فقہاء کا اختلاف ہے، شوافع جواز کے قائل ہیں تفصیلات ھدایہ ج ۴ کتاب الرہن نیز کتاب الام باب الرہن میں ملاحظہ ہوں۔

امانت ہے اس واسطے کہ ضمانت تو اسی قدر ہے جس سے قرضہ کی وصولی ہو سکے اور یہ قرضہ کے لحاظ سے ہوتی ہے (اور اس زیادتی کو راہن پائے گا)"۔

(۳) "اگر مرہونہ شئے کی قیمت قرضہ کی بہ نسبت کم ہو تو بقدر قیمت قرضہ ساقط ہو جائے گا اور مزید رقم مرتہن راہن سے پائے گا اس واسطے کہ پورا پانا تو مرہونہ مالیت کی قدر کے مساوی ہوتا ہے"[1]

چارہ کار

اگر قرض معینہ مدت پر ادا نہ ہو تو مرتہن مجاز ہے کہ عدالت سے مرہونہ شئے کو فروخت کرنے اور اس کی قیمت سے اپنے قرضہ کی ادائی پانے کی درخواست کرے۔ لیکن وہ اپنے طور پر رہن کو فروخت کرنے کا مجاز نہیں ہے جب تک کہ صریح طریقہ سے اس کو مقروض نے اجازت نہ دے دی ہو کہ "مرتہن کو رہن کی بابت یہ حق حاصل ہے کہ وہ اس کو روک رکھے یہاں تک کہ راہن جو کچھ کہ اس کے ذمہ ہے ادا کر دے اگر مدت معینہ پر راہن نہ آئے تو مرتہن کو یہ حق ہے کہ سلطان کے پاس اس معاملہ کو لے جائے۔ مرہونہ شئے فروخت کی جائے گی اور اس کا حق اس کو دیا جائے گا اگرچہ راہن زندہ نہ ہو۔ اسی طرح جب کہ راہن غائب ہو"[2] (سلطان سے مراد عدالت ہے)

(۴) ودیعت یا امانت[3]

دنیا میں ہر شخص اپنی دولت کی خود آپ ہی حفاظت نہیں کر سکتا اس لیے حفاظت کے لیے کسی اور کے سپرد کرتا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص کہیں سفر کو جائے اور

---

[1] ۔ ھدایہ ج ۴ کتاب الرہن

[2] ۔ بدایۃ المجتہد، کتاب الرہن ج ۲ صفحہ ۲۳۱ نیز ھدایہ ج ۴ کتاب الرہن

[3] ۔ گو اردو میں عام طور پر ودیعت کے بجائے امانت کا لفظ استعمال ہوتا ہے لیکن فقہائے اسلام نے ودیعت (ڈپازٹ) اور امانت (ٹرسٹ) میں فرق کیا ہے چنانچہ انھوں نے امانت کے لفظ کو وسیع معنوں میں استعمال کیا ہے اور ودیعت کو محدود معنوں میں جو معاہدہ کے ذریعہ عمل میں آئے

فاضل دولت رکھتا ہو لازمی طور سے اس کو کہیں نہ کہیں کسی کی حفاظت میں رکھوانا ہی پڑتا ہے۔

ودیعت کی تعریف ودیعت[1] ایک معاہدہ ہے جس کے ذریعہ ایک شخص اپنی کسی چیز کو حفاظت کی غرض سے کسی بعد کی تاریخ میں بجنسہ واپسی کے لیے کسی اور شخص کے سپرد کرتا ہے۔ صرف زر ہی ودیعت کے طور پر نہیں رکھوایا جاتا بلکہ ہر ایسی شئے جو مال شمار ہوتی ہے اور اس پر قبضہ ثابت ہو سکے ودیعت کے طور پر رکھوائی جا سکتی ہے۔ موجودہ زمانہ میں تو نہ صرف پائدار اشیا ہی ودیعت رکھوائی جاتی ہیں بلکہ خراب ہونے والی اشیا مثلاً پھل، ترکاریاں، گوشت اور مکھن وغیرہ کی فاضل پیداوار بھی برف دان (برادے Cold Storage) میں ودیعت رکھوائی جاتی ہیں اور ودیعت رکھنے والا، ودیعت رکھانے والے سے کچھ مقررہ فیس وصول کرتا ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) امانت بغیر کسی معاہدہ کے بھی ہو سکتی ہے مثلاً اس کو یوں واضح کیا جا سکتا کہ ایک شخص نے اپنی دیوار پر ایک کپڑا سوکھنے کے لیے ڈالا اور وہ ہوا سے اڑ کر ہمسایہ کے گھر میں جا گرا تو وہ کپڑا اس ہمسایہ کے پاس امانت سمجھا جائے گا۔ خیر یہ کپڑا اڑنے کی مثال تو ایک قدیم مثال ہے جو عام طور سے فقہ کی قدیم کتابوں میں درج ہے ذیل میں سونے کی سلاخ کے آگرنے کا ایک نیا واقعہ بیان کیا جاتا ہے اخبار بمبئی کرانیکل مورخہ ۲۱ اپریل ۱۹۴۴ء میں ذیل کی یہ دلچسپ خبر شائع ہوئی تھی کہ "گذشتہ جمعہ کو بمبئی شہر کے شہریوں کو جو عجیب و غریب تجربے ہوئے ان میں سب سے زیادہ انوکھا تجربہ ایک وظیفہ یاب انجینیر مسٹر برجورجی کورجی موتی والا کو ہوا۔ جن کے سکونتی مقام پر ایک سونے کی سلاخ آگری۔ جس کا وزن ۲۸ پونڈ اور قیمت ۹۰ ہزار روپیے ہے۔ یہ سلاخ عمارت کی چوتھی منزل سے گذرتے ہوئے تیسری منزل میں مسٹر برجورجی کے ورانڈے میں گری۔ اس سلاخ کو جس پر بنک انگلستان کا نشان Z ۳۲۳۶ تھا پہلے پولس کے سپرد کیا گیا۔ معلوم ہوا ہے کہ بعد میں ریزرو بنک نے سلاخ کی ملکیت کا دعویٰ کیا اور اس کو اپنے قبضہ میں لے لیا۔" (ت - پ) جہاز کے گولہ بارود میں دھماکا ہونے کا جو واقعہ ہوا تھا یہ بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

[1] عربی میں ودیعت رکھانے والے کو مُودِعْ یا مُستَودِعْ (Depositor) کہتے ہیں دال کو زیر اور ودیعت رکھنے والے کو مُودَعْ یا مُستَودَعْ (Depositary) کہتے ہیں، دال کو زبر۔

الغرض اسلامی قانون میں "ودیعت رکھوانا جائز ہے کیونکہ مالک اپنے ملک میں تصرف کرتا ہے" (جس کا کہ اس کو حق ہے)

قرآن مجید میں ودیعت کی اصطلاح کے ساتھ ساتھ امانت کی اصطلاح بھی موجود ہے، چنانچہ بطور عام حکم دیا گیا ہے کہ

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمَانَاتِ اِلٰی اَھْلِھَا۔

خدا تمھیں حکم دیتا ہے کہ لوگوں کی امانتیں ان کے حوالہ کر دو۔

پ۵ النساء ۴ ع۶

قرآن ہی میں کہیں مقامات پر عام مسلمانوں کی خصلتوں کا تذکرہ کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے

وَالَّذِیْنَ ھُمْ لِاَمَانَاتِھِمْ وَعَھْدِھِمْ رَاعُوْنَ[1]

اور جو لوگ کہ اپنی امانتوں کا اور اپنے عہد کا خیال رکھتے ہیں۔

قرآن میں ان آیتوں کی موجودگی ہی اس بات کا بڑا ثبوت ہے کہ جاہلی عرب کے باشندے وعدہ وفائی اور امانتوں کی واپسی کا کچھ لحاظ نہ کرتے تھے۔

پھر قرآن مجید میں عرب کے اندر جو عیسائی، یہودی تاجر ساہوکارہ (بنکنگ) کا کاروبار کرتے تھے ان کے متعلق یہ تذکرہ ہے کہ

وَمِنْ اَھْلِ الْکِتَابِ مَنْ اِنْ تَاْمَنْہُ بِقِنْطَارٍ یُّؤَدِّہٖ اِلَیْکَ وَمِنْھُمْ مَّنْ اِنْ تَاْمَنْہُ بِدِیْنَارٍ لَّا یُؤَدِّہٖ اِلَیْکَ اِلَّا مَا دُمْتَ عَلَیْہِ قَائِمًا۔

پ۳ آل عمران ۲ ع۱۶

اور اہل کتاب میں کچھ ایسے ہیں کہ اگر تم ان کے پاس خزانہ بھی امانت رکھ دو تو (مانگنے پر جوں کا توں) وہ اس خزانہ کو تمھیں واپس دے دیں گے اور ان میں بعض ایسے بھی ہیں اگر تم ان کے پاس ایک دینار بھی امانت رکھ دو تو جب تک تم ان کے سر پر کھڑے ہوئے تقاضہ نہ کرو وہ تمھیں کبھی واپس نہ دیں گے۔

---

[1] ۔ قرآن پ۱۸ سورۃ المومنین ۲۳ ع ۱ نیز پ۲۹ المعارج ۷۰ ع ۱۔

عہدِ متاخر کے فقہاء نے ودیعت کی تائید میں قرآن کی یہ آیت

تَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰی ۔ نیکی اور پرہیزگاری کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کرو۔

پ۶ المائدہ ۵ ع۱

پیش کرتے ہوئے ودیعت قبول کرنے کے فعل کو پسندیدہ عمل (مندوب) قرار دیا ہے[۱]

قرآن کی طرح حدیثوں میں بھی امانتی اشیاء کی لازمی واپسی کی ہدایتیں پائی جاتی ہیں اسی بارے میں رسول کریمؐ کا یہ ارشاد ہے کہ

مَنْ أئْتَمَنَ أمَانَتَہُ فَلْيُؤَدِّهَا ۔ جس کسی کے پاس (بھی) امانت رکھوائی جائے تو وہ (جوں کا توں) اس کو واپس کرے۔

نیز یہ کہ

أَدِّ الأمَانَةَ إلیٰ مَنْ أئْتَمَنَكَ جو کوئی تمہارے پاس امانت رکھوائے تو اس کو واپس کردو۔

حدیثوں میں منافق کی جو تین علامتیں بتائی گئی ہیں ان میں ایک امانت میں خیانت بھی ہے

عَلَامَةُ الْمُنَافِقِ ثلاث - إذَا حَدَّثَ كَذَبَ وَ إذَا وَعَدَ خَلَفَ ، وَإذَا أئْتُمِنَ خَانَ ۔ منافق کی تین نشانیاں ہیں جب بات کرے تو جھوٹ کہے۔ جب وعدہ کرے تو خلاف کرے اور جب امانت رکھوائی جائے تو خیانت کرے۔

مکّے کے قریشی تاجر وغیرہ رسول کریمؐ کے پاس امانتیں رکھوایا کرتے تھے مورخ طبری اور ابن ہشام وغیرہ کا بیان ہے کہ مکہ میں کوئی شخص ایسا نہ تھا جس کے پاس حفاظت کے قابل کوئی چیز ہو اور اس نے رسول کریمؐ کی امانت اور دیانت کی وجہ سے وہ چیز آپ کے پاس امانت نہ رکھوادی ہو[۲]۔ مکہ سے ہجرت کرکے مدینہ تشریف لیجاتے وقت آپ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو اس لیے

۱۔ ملاحظہ ہو مبسوط السرخسی ج ۱۱ کتاب الودیعۃ

۲۔ تاریخ طبری صفحہ ۱۲۳۸ نیز سیرت ابن ہشام پہلے باب کے صفحہ ۱۷ پر تفصیل گذر چکی

دہیں چھوڑ دیا کہ وہ لوگوں کی ودیعتیں ان کے حوالہ کردیں۔ اعلان جنگ کے بعد حربی[1] کو اس کے اگلے حقوق سے محروم نہ کرنے کی یہ وہ نظیر ہے جس پر جدید قانون بین الممالک بھی ابتک نہیں پہنچا ہے۔

صحابہ کرامؓ بھی لوگوں کے اندوختوں کو حفاظت کی غرض سے اپنے ہاں ودیعت رکھتے تھے۔ زبیر بن العوامؓ کے پاس جو ودیعتیں رکھوائی گئیں تھیں ان کے انتقال کے وقت اس کی تعداد دو کروڑ دو لاکھ درہم تک پہنچ چکی تھی چنانچہ حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ کا بیان ہے کہ "جب زبیر جمل کے دن (میدان جنگ میں) کھڑے ہوئے تو مجھے بلایا، میں ان کے پہلو میں جا کھڑا ہوگیا۔ انھوں نے کہا کہ مجھے بڑی فکر اپنے قرض کی ہے۔ کیا تم میرے قرض کو سمجھتے ہو کہ وہ میرا کچھ مال باقی رکھے گا؟ عبد اللہؓ کہتے ہیں کہ پھر وہ مجھے اپنے قرض کی بابت وصیت کرتے رہے۔ اس کے بعد زبیرؓ شہید ہوئے تو انھوں نے نہ کوئی دینار چھوڑا نہ درہم البتہ دو زمینیں چھوڑیں۔ ان میں سے ایک غابہ ہے مدینہ میں گیارہ مکان بصرہ میں دو مکان کوفہ میں ایک مکان اور مصر میں ایک مکان سب پندرہ مکان اپنے بعد چھوڑے عبد اللہ بن زبیرؓ کہتے ہیں کہ ان کے قرض کی یہ کیفیت تھی کہ جب کوئی شخص ان کے پاس مال لاتا اور بطور ودیعت کے ان کے پاس رکھ دیتا تو زبیرؓ کہتے کہ بطور ودیعت کے میں نہیں رکھتا بلکہ بطور قرض کے لیتا ہوں کیونکہ مجھے اس کے تلف ہو جانے کا ڈر ہے اور کبھی انھوں نے امیر ہونا یا خراج کا عامل (کلکٹر) بننا یا کوئی اور عہدہ قبول نہیں کیا مگر نبی کریمؐ یا ابو بکرؓ عمرؓ اور عثمانؓ کے ساتھ جہاد میں (برابر) جاتے تھے۔ عبد اللہ بن زبیرؓ کہتے ہیں کہ میں نے ان کے قرض کا حساب کیا تو دو کروڑ دو لاکھ (درہم) تھا پھر عبد اللہ بن زبیرؓ نے اپنی دونوں زمینوں کے مختلف پلاٹ بنا کر کئی لاکھ میں بیچ ڈالے"

"اس کے بعد جب عبد اللہ بن زبیرؓ، حضرت زبیرؓ کا قرض ادا کر چکے تو حضرت زبیرؓ کے اور بیٹوں نے کہا کہ ہماری میراث ہمارے درمیان تقسیم کر دیجئے۔ عبد اللہ

---

[1] غیر اسلامی سلطنت (دار الحرب) کے باشندے جن کے خلاف اعلان جنگ کیا جاسکتا ہے حربی کہلاتے ہیں۔

بن زبیرؓ نے کہا کہ خدا کی قسم میں کبھی تقسیم نہ کروں گا۔ جب تک کہ حج کے زمانے میں چار سال تک یہ اعلان نہ کر دوں کہ جس کسی کا کچھ قرض زبیر بن العوام پر ہو وہ ہمارے پاس آئے ہم اس کو ادا کریں گے۔ راوی کا بیان ہے کہ پھر انھوں نے ہر سال حج کے زمانے میں اعلان کرنا شروع کیا۔ جب چار برس گذر گئے تو ان کے درمیان میں تقسیم کر دیا۔ حضرت زبیرؓ کا کل مال پانچ کروڑ دو لاکھ (درہم) تھا[1]

فقہ کی کتابوں میں نہایت شرح و بسط سے ودیعت کے اصول و قوانین بیان کئے گئے ہیں ان کا خلاصہ ذیل میں بیان کیا جاتا ہے۔

ودیعت ایک معاہدہ ہے جس کو ہر فریق جس وقت چاہے منسوخ اور ختم کر سکتا ہے۔ معاہدہ ودیعت کے لیے ذیل کی شرطیں ضروری ہیں۔

(ا) معاہدہ کرنے والوں میں یہ قابلیت ہونی چاہیے کہ وہ اپنے مال میں تصرف کر سکیں۔ یہی وجہ کہ ایک بچہ (صغیر مائنر) ایک دیوانہ اور فاتر العقل بوڑھا (سفیہ) اور ایک قلاش (مبذر) جو اپنا کوئی ولی نہیں رکھتے۔ یہ تمام اشخاص نہ تو کوئی چیز اپنے پاس بطور ودیعت رکھ سکتے ہیں نہ رکھوا سکتے ہیں۔ بچوں کو مال تلف کر دینے کی عادت ہے کیونکہ انجام کار پران کی نظر نہیں ہوتی[2]

یہی وجہ ہے کہ کوئی ودیعت کسی بچہ کے پاس تلف ہو جائے تو اس پر کوئی تاوان نہیں ہوگا۔ اگر بالفرض کوئی شخص کسی (کم سن) بچہ کے پاس کوئی شئے رکھوائے تو وہ ودیعت نہیں بلکہ امانت سمجھی جائے گی۔

(ب) ہر ایسی شئے جو دولت کہلائی جا سکتی ہے ودیعت رکھوائی جا سکتی ہے[3]

ظاہر ہے کہ ودیعت معاہدہ کے ذریعہ ہی رکھوائی جا سکتی ہے اور اس کا

---

[1] بخاری پ ۱۲ کتاب الجہاد۔
[2] مبسوط السرخسی ج ۱۱ کتاب الودیعۃ۔
[3] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو بدائع الصنائع الکاسانی، کتاب الودیعۃ ج ۶ ص ۲۰۷ مطبوعہ مصر۔

انعقاد ایجاب وقبول کی تکمیل سے ہی ہوگا۔ نیز اظہار کے اور جن مختلف طریقوں کے ذریعہ معاہدہ ہو سکتا ہے ان سب سے بھی ودیعت کا معاہدہ ہو سکے گا۔ نیز بغیر الفاظ کے اظہار کے صرف خاموشی سے بھی طے ہو سکتا ہے مثلاً اگر ودیعت رکھوانے والا رقم پیش کرے اور ودیعت رکھنے والا بغیر کچھ کہے رقم رکھ لے تو معاہدہ مکمل سمجھا جائے گا۔ اسی طرح کوئی شخص اپنی سیکل حفاظت کے لیے پیش کرے اور حفاظت کنندہ رکھ لے تو عرفِ عام میں یہی سمجھا جاتا ہے کہ اُس نے حفاظت کی ذمہ داری قبول کر لی دوسرے لفظوں میں وہ شخص ضامن سمجھا جائے گا۔

ودیعت رکھنے والے کی ذمہ داریاں

تمام فقہا نے بالاتفاق قرار دیا ہے کہ ودیعت رکھنے والے پر لازم ہے کہ اشیاء کی ایسی حفاظت کرے جیسی کہ لوگ عام طور پر اپنی چیزوں کی حفاظت کرنے کے عادی ہیں[۱]۔

ودیعت رکھنے والے کو ان اشیاء کی ویسی ہی حفاظت کرنی چاہیے جیسی کہ وہ اپنی اشیاء کی حفاظت کرتا ہے۔ ودیعت رکھنے والے کو اختیار ہے کہ اپنی ذات سے اس کی حفاظت کرے یا ایسے شخص کے ذریعہ جو اس کے عیال میں ہے۔ اس لیے کہ بظاہر اس نے غیر کے مال کی حفاظت کا التزام اسی طور پر کیا ہے جس طور پر کہ وہ اپنے مال کی کرتا ہے اور اس واسطے بھی کہ اس کو اپنے عیال کی حفاظت میں دینے کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں کیونکہ ہر دم اپنے مکان میں رہنا اس سے ممکن بھی نہیں اور نہ باہر جانے پر ہر وقت ودیعت کو ساتھ رکھنا ممکن ہے، تو مالک ودیعت اس سے ایسی حفاظت پر راضی سمجھا جائے گا[۳]۔

عیال سے ایسے اشخاص مراد ہیں جو ودیعت رکھنے والے کے ساتھ رہتے سہتے ہوں اور جن کا اس کے گھرانے سے تعلق ہو، عیال سے نہ صرف بیوی، بچے، والدین وغیرہ ہی مراد ہیں بلکہ وہ نوکر چاکر بھی مراد ہیں جو اس کے ساتھ رہتے سہتے اور کھانا کپڑا پاتے ہوں[۲]۔

۱۔ بدایۃ المجتہد ج ۲ کتاب الودیعۃ ص ۲۶۱۔ ۲۔ عیال (فیملی) کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو الکاسانی بدائع الصنائع ج ۶ کتاب الودیعۃ ص ۲۰۸۔ ۳۔ ہدایہ ج ۳ کتاب الودیعۃ۔

ودیعت رکھنے والے کو یہ اختیار بھی ہے کہ وہ ودیعت کی چیزوں کو جہاں چاہے اپنے اختیار تمیزی سے رکھے، لیکن اگر ودیعت رکھوانے والا اپنی ودیعت کو رکھنے کے طور طریق کی ہدایت کر دے تو ودیعت رکھنے والے کو چاہیے کہ ان ہدایتوں کی سختی سے پابندی کرے اگر وہ ان ہدایات کی پابندی نہ کرے اور اتفاق سے اس شئے کو نقصان پہنچے یا تلف ہو جائے تو اس کا تاوان ادا کرنا پڑے گا۔

تاوان کا استحقاق

ودیعت کے مال کو اگر کچھ نقصان پہنچے یا تلف ہو جائے اور اس میں ودیعت رکھنے والے کی کوئی غلطی ثابت نہ ہو تو ودیعت رکھنے والا قانوناً تاوان ادا کرنے کا ذمہ دار نہ سمجھا جائے گا اسی طرح اگر کسی اتفاقی حادثہ کی بناء پر یا غنیم کے حملہ یا بلائے آسمانی سے اس شئے کو نقصان پہنچے یا تلف ہو جائے تو ان صورتوں میں وہ ذمہ دار نہ سمجھا جائے گا کیونکہ "ودیعت رکھنے والے کے ہاں ودیعت ایک امانت ہوتی ہے۔ پس اگر وہ تلف ہو جائے تو ودیعت رکھنے والا اس کا ضامن نہ ہوگا۔ اس وجہ سے کہ لوگوں کو ودیعت رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے اگر ہم ودیعت رکھنے والے کو ضامن ٹھہرائیں تو لوگ ودیعت قبول کرنے سے ہی انکار کر دیں گے اور یوں لوگوں کا کاروبار بند ہو جائیں گے[1] سرخسی نے لکھا ہے کہ" اگر وہ اس کو اپنے مکان میں رکھے یا صندوق (تجوری) میں رکھے اور وہ تلف ہو جائے تو اس سے تاوان نہیں لیا جائے گا[2]"

اس کے برخلاف تفریط اور تعدی کی صورتوں میں ودیعت رکھنے والا بہر حال قانوناً ہمیشہ ذمہ دار سمجھا جائے گا۔

(الف) تفریط کی صورت یہ ہے کہ ودیعت رکھنے والے پر جس نوعیت کی حفاظت کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے وہ ویسی حفاظت نہیں کرتا۔ ذیل کی صورتوں میں تفریط ہوتی ہے۔

---

[1] ۔ ھدایہ ج ۳ کتاب الودیعۃ   [2] ۔ مبسوط السرخسی ج ۱۱ کتاب الودیعۃ ۔

(۱) جبکہ ودیعت رکھنے والا ودیعتی شئے کو نقصان سے بچانے کی کوشش نہ کرے مثلاً اس کے پاس ایک گھوڑا رکھوایا گیا اور اس نے اس کو دانہ چارہ کھلانے میں بے پروائی کی یا اس کو پانی نہیں پلایا، یا اونی کپڑے یا کتابیں رکھوائی گئیں اور وہ انھیں کیڑوں سے نہ بچا سکا۔ یا غلہ رکھوایا گیا اور اس نے ایسی بے پروائی کی کہ غلہ چوہے کھا گئے۔

(۲) اگر وہ ودیعت کی چیزوں کی مروجہ طریقہ پر حفاظت نہ کرے یا ودیعت رکھوانے والے نے جو ہدایتیں دی تھیں ان کی پابندی نہ کرے تو اس کا یہ فعل تفریط سمجھا جائے گا مثلاً "اگر ودیعت رکھوانے والے نے اس ودیعت کو باہر لے جانے سے منع کر دیا تھا پھر وہ اس کو باہر لے گیا تو ودیعت والا ضامن ہوگا اس وجہ سے کہ حفاظت کے لیے باہر نہ لے جانے کی قید لگانا مفید ہے اس واسطے کہ شہر کے اندر حفاظت خوب ہوتی ہے"[۱]

(ب) ودیعت رکھنے والے کا ہر وہ فعل فعل تعدی سمجھا جائے گا جبکہ وہ ایک تیسرے شخص کے پاس اس ودیعت کو رکھوا دے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ودیعت کی بنا شخصی اعتماد پر ہوتی ہے "پھر اگر ودیعت رکھنے والے نے (اپنے عیال کے سوا) اس کو غیر کی حفاظت میں دیا ہو یا دوسرے کے پاس ودیعت رکھوایا ہو تو وہ ضامن ہوگا۔ اس وجہ سے کہ ودیعت کا مالک تو ودیعت رکھنے والے کے قبضہ سے راضی ہوا تھا نہ کہ غیر کے قبضہ میں دینے کے لیے۔ اور امانت داری میں لوگ مختلف درجوں کے ہوتے ہیں اور اس وجہ سے بھی کہ ایک شئے اپنی غیر کو متضمن نہیں ہوتی جیسے کہ ایک وکیل کو یہ اختیار نہیں ہوتا کہ دوسرے کو وکیل مقرر کرے"[۲]

غرض غیر کے پاس ودیعت رکھنے کی صورت میں وہ خود ذمہ دار ہوگا اگر تلف ہو جائے یا نقصان پہنچے تو تاوان ادا کرنا پڑے گا۔

مذکورہ معاملہ میں قاضی ابن ابی لیلیٰؒ (۷۴ھ تا ۱۴۸ھ) جو امام اعظمؒ کے

۱۔ ھدایہ ج ۳ کتاب الودیعۃ ۔ ۲۔ ھدایہ ج ۳ کتاب الودیعۃ

ہم عصر تھے اور عہد بنو امیہ اور بنو عباس میں تینتیس ۳۳ سال تک کوفہ کے قاضی رہے اپنی اختلافی رائے رکھتے ہیں چنانچہ انھوں نے ودیعت رکھنے والے کو اس بات کی اجازت دی ہے کہ اگر وہ چاہے تو کسی اور کے ہاں اپنے پاس کی ودیعت کو رکھوا سکتا ہے اور اس تیسرے شخص کے ہاں اس ودیعت کو نقصان پہنچے یا تلف ہو جائے تو اس پر کچھ تاوان نہیں ہے اور اس کی وجہ انھوں نے یہ بیان کی ہے کہ "وہ بھی اس ودیعت کی ایسی ہی حفاظت کرتا ہے جیسی کہ وہ اپنے مال کی حفاظت کرتا ہے اور انسان خود اپنے مال کو ایک غیر شخص کے پاس ودیعت رکھواتا ہے اس طرح کسی کی ودیعت کو غیر کے پاس ودیعت رکھوانے پر وہ ذمہ دار نہ ہوگا۔ غیر شخص کے پاس اس وجہ سے رکھواتا ہے کہ اس شئے کی حفاظت ہو اور یہ غیر کے سپرد کرنا ایسا ہی ہے جیسا کہ عیال کے ذمہ سپرد کیا جانا[1] حنفی مکتب خیال کے فقہاء اس بارے میں اپنی جو دلیل پیش کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ "ودیعت رکھنے والے کو یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ کسی غیر کے پاس ودیعت رکھوائے کیونکہ حفاظت کرنے میں لوگوں میں فرق ہوا کرتا ہے۔ اور ودیعت رکھوانے والا صرف اس کی امانت اور حفاظت کی وجہ سے اس سے راضی ہوا تھا نہ کہ غیر کے پاس رکھوانے پر تو جب اس نے ایک غیر شخص کے سپرد کیا تو گویا وہ اس حفاظت کا ترک کرنے والا ہوا جو اس کے لیے لازمی تھی، اس طرح وہ ضامن ہو جائے گا"[2]

امام مالکؒ نے بعض خاص صورتوں میں شہر کے معتبر لوگوں کے پاس ودیعت رکھنے کی اجازت دی ہے مثلاً "ودیعت رکھنے والا سفر کا ارادہ کرے تو وہ شہر کے معتبر لوگوں کے پاس ودیعت رکھوا سکتا ہے اور اس پر تاوان نہیں ہے چاہے اس کو حاکم شہر کے سپرد کرنے پر قدرت حاصل ہو یا نہ ہو۔ امام شافعیؒ کے بعض اصحاب کہتے ہیں کہ حاکم شہر کے علاوہ اور کسی کے سپرد کرے تو وہ ضامن ہوگا"[3]

---

[1] مبسوط السرخسی ج ۱۱ کتاب الودیعۃ۔ [2] مبسوط السرخسی ج ۱۱ کتاب الودیعۃ

[3] ۔ بدایۃ المجتہد ج ۲ صفحہ ۲۶۱ ۔

بہرکیف تمام مکاتب خیال کے فقہا اس بات میں متفق ہیں کہ ودیعت رکھنے والے کو اس بات کا حق حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ اضطراری حالت میں اعلیٰ قوت کے دباؤ سے ودیعت کے مال کو کسی تیسرے شخص کے پاس بطور ودیعت کے رکھوا دے۔ فقہ کی کتابوں میں عام طور سے جہاز کی تباہی، آتش زدگی، غنیم کے حملے، طغیانی وغیرہ کو بطور مثال کے پیش کیا گیا ہے کہ ایسی حالتوں میں وہ ودیعت کی چیزوں کو ایک دوسرے شخص کے سپرد کر دے تو ضامن نہ ہوگا۔ "مگر جب اس کے گھر میں آگ لگے پس اس نے ودیعت کو اپنے پڑوسی کے سپرد کر دیا یا وہ کشتی پر سوار تھا کہ غرق ہونے کا خوف ہوا اور اس نے ودیعت کو دوسری کشتی کی جانب پھینک دیا (تو ضامن متصور نہ ہوگا) اس واسطے کہ ایسی حالت میں حفاظت کا طریقہ بھی متعین ہو گیا تو مالک اس پر راضی ہو گا۔"[1] ان صورتوں میں امانت رکھنے والے کا طرز عمل خود یہ بات ظاہر کرتا ہے کہ اس کے پیش نظر یہ امر تھا کہ کسی طرح مال تلف یا خراب ہونے سے بچ جائے۔ اگر خود اس کا مال ہوتا تو مذکورہ صورتوں میں بھی وہ یہی طرز عمل اختیار کرتا۔[2] "اتفاق سے اگر مال کو کچھ نقصان پہنچے یا تلف ہو جائے تو اگر مالک ودیعت (ڈپازیٹر) کا قول بھی وزنی سمجھا جائے اور ودیعت رکھنے والے کا خلاف کرنا بھی ایسی جگہ درست خیال کیا جائے تو

وَلَا یُصَدَّقُ عَلٰی ذَالِکَ اِلَّا بِبَیِّنَۃٍ[3] اور بغیر گواہی کے کسی قول کی تصدیق نہیں کی جائے گی۔

کسی تعدی کی صورت یہ بھی ہے کہ ودیعت رکھنے والا اس شئے کو اپنے استعمال میں لائے یا اس سے فائدہ اٹھائے مثلاً کپڑے ودیعت رکھوائے گئے تھے وہ اس کو خود پہننے لگا، یا گھوڑا رکھوایا گیا تھا اس پر سواری کرنے لگا یا موٹر رکھوائی گئی تھی اس کو خود استعمال کرنے لگا تو وہ ضامن ہوگا مگر ان صورتوں میں کہ اس کا مقصد

۱۔ ھدایہ ج ۳ کتاب الودیعۃ۔ ۲۔ مبسوط السرخسی ج ۱۱ کتاب الودیعۃ

۳۔ ھدایہ ج ۳ کتاب الودیعۃ۔

ودیعت کی شئے کو نقصان سے بچانا ہے مثلاً موٹر کی بیاٹری کو اچھی حالت میں رکھنے کے لیے اس کو چلا کر دیکھنا ضروری ہوتا ہے اسی طرح ودیعت رکھنے والے سے ودیعت کی شئے کے نقصان کا تاوان نہ لیا جائے گا جبکہ وہ اپنی تعدی کے اثر کو زائل کر دے۔[1]

ودیعت کے معاہدے کا اختتام جب حفاظتی شئے کی واپسی ہوتی ہے تو حفاظت کا معاہدہ بھی ختم ہو جاتا ہے۔ فریقین کو یہ اختیار حاصل ہے کہ جب چاہیں ودیعت کے معاہدے کو منسوخ قرار دے لیں جیسا کہ ہر معاہدہ میں ہو سکتا ہے یہی وجہ ہے کہ ودیعتی شئے کی واپسی کسی وقت بھی ہو سکتی ہے۔ اسی طرح صرف کسی ایک فریق کی خواہش پر بھی ودیعت کا معاہدہ ختم کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح کسی ایک فریق کا انتقال ہو جائے یا ان دونوں میں سے کوئی فریق بالفرض دیوانہ ہو جائے تو ودیعت کا معاہدہ خود بخود منسوخ سمجھا جائے گا۔

جب ودیعت کی چیز واپس کی جارہی ہو تو ودیعت رکھنے والے کو چاہیے کہ واپسی کے وقت کسی اور شخص کو بھی گواہ بنائے قرآن مجید میں یتیم کے ولی کو حکم دیا گیا ہے کہ جب وہ یتیم کا مال اس کے سن رشد کو پہنچنے پر اس کے حوالے کرے تو کسی کو گواہ بنائے

فَاِذَا دَفَعۡتُمۡ اِلَیۡهِمۡ اَمۡوَالَهُمۡ فَاَشۡهِدُوۡا عَلَیۡهِمۡ۔ — جب تم ان کا مال ان کے سپرد کرو تو گواہ بنا لو۔

پ۴ النساء ع۱

ودیعت کی واپسی سے انکار اگر ودیعت رکھنے والا بغیر کسی سبب کے ودیعتی شئے کی واپسی کا انکار کرے تو اس کے اس انکار کی وجہ سے اس کی ذمہ داری میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے مثلاً اگر ودیعت کی چیز کو کچھ نقصان پہنچ جائے یا تلف ہو جائے تو عام حالات میں

---

[1] تفصیل ھدایہ ج ۳ کتاب الودیعۃ۔

ودیعت رکھنے والا کسی اتفاقی نقصان کا ذمہ دار نہیں ہوتا تھا تو اب وہ اتفاقی نقصان یا تلف کرنے کا قانوناً ذمہ دار سمجھا جائے کیونکہ مال کے مالک کو مال کے واپس کرنے سے اس نے انکار کیا تھا "اگر مالک نے اپنی ودیعت کو طلب کیا اور رکھنے والے نے انکار کیا تو وہ اس کا ضامن ہوگا اس واسطے کہ جب مالک نے اس سے واپسی کا مطالبہ کیا تو گویا اس کو حفاظت سے معزول کر دیا۔ پس اس کے بعد وہ روکنے کی وجہ سے غاصب ہو گیا اور اس طرح ضامن قرار پائے گا پھر اعتراف کر لے تو ضمانت سے بری نہ ہوگا کیونکہ جب واپسی کا مطالبہ ہوا تھا تو معاہدہ بھی ختم ہو گیا تھا"[1] اگر بجائے انکار کے ٹالم ٹول سے کام لے تو بھی وہ اسی طرح اتفاقی نقصان یا تلف ہونے پر قانوناً ذمہ دار متصور ہوگا کہ "پھر اگر ودیعت کو اس کے مالک نے طلب کیا اور اس نے دینے سے اس کو روکا در آں حالیکہ وہ دے سکتا تھا روکنا حد سے تجاوز کرنا ہے یہ اس وجہ سے کہ جب مالک نے اپنی ودیعت کو طلب کیا تو گویا وہ اس کے پاس رکھنے پر راضی نہ رہا اس کے بعد روکنے پر وہ اس کا ضامن ہوگا"[2]

ودیعت کی اُجرت

سب سے آخری لیکن سب سے زیادہ اہم سوال جو ودیعت سے متعلق ہو سکتا ہے وہ ودیعت کی اُجرت کا مسئلہ ہے۔ اندلس کے فقیہ ابن رشد الحفید المتوفی ۵۹۵ھ نے اجرت ودیعت اور نفع ودیعت سے متعلق خاص طور پر بحث کی ہے فقہاء میں یہ بڑا اختلافی مسئلہ ہے اور اس مسئلہ پر انھوں نے قانونی موشگافیاں کی ہیں کہ کوئی شخص اجرت ودیعت پانے کا کس صورت میں مستحق ہو سکتا ہے؟ خاص کر یہ مسئلہ کہ آیا ودیعت رکھنے والا ودیعت کے اس مال سے کاروبار کرنے کا حق بھی رکھتا ہے کہ نہیں! نیز یہ کہ نفع پانے کا مستحق کون ہوگا؟ فقہاء کے ان اختلافوں کی وجہیں اور ہر ایک کے دلیلوں کو بیان کرنے کی

۱۔ ھدایہ ج ۳ کتاب الودیعۃ۔ ۲۔ ھدایہ ج ۳ کتاب الودیعۃ۔

نہ یہاں جگہ ہے اور نہ ضرورت البتہ مختصر طور پر بیان کرنا بے محل نہیں ہے۔
امام مالک رح کہتے ہیں کہ" ودیعت رکھنے والے کو اجرت نہیں دی جائے گی البتہ اگر شئے ودیعت ایسی ہو کہ اس کے لیے جگہ درکار ہوتی ہو یا اس پر اخراجات کا بار پڑتا ہو تو اس کی باربرداری ودیعت کے مالک پر عائد ہو گی[1]۔
اگر ودیعت رکھنے والا، ودیعت کے مال سے کاروبار کرنے لگے تو بعض فقہاء ودیعت رکھنے والے کو نفع پانے کا مستحق نہیں قرار دیتے ان فقہاء نے اس کی یہ وجہ بتائی ہے کہ ودیعت کا مال تو اس کے ہاں حفاظت کی غرض سے رکھا گیا تھا لیکن اگر وہ ودیعت کی حدوں سے گزر کے تعدی کرے اور ودیعت کے اس مال سے کاروبار کرنے لگے تو کس طرح ودیعت کے حدوں سے تجاوز کرنے والا نفع پانے کا مستحق ہو سکتا ہے۔
بعض فقہاء نے تو صرف ودیعت رکھنے والے ہی کو کاروبار کا نفع پانے کا مستحق قرار دیا ہے کیونکہ اسی کے تصرف سے دولت میں مزید اضافہ ہوا لہذا نفع پانے کا مستحق بھی امانت رکھنے والا ہی ہو گا کیونکہ

اَلرِّبْحُ لِلْمُتَصَرِّفِ منافع تصرف کرنے والے کے لیے ہے۔

اس بحث کے آخر میں فقیہ ابن رشد نے اپنی جو رائے ظاہر فرمائی ہے وہ وہی نقطہ نظر ہے جس پر کہ آج عصر جدید کے علماء معاشیات پہنچے ہیں۔ قراض یا مضاربت کے بیان میں فقہاء کے یہ بیانات درج کیے جا چکے ہیں کہ ان کی رائے میں جس طرح محنت سے مزید دولت پیدا ہوتی ہے اسی طرح اصل سے بھی مزید دولت پیدا ہوتی ہے اگر ایک طرف محنت کرنے والا اپنی محنت کی وجہ سے نفع پانے کا مستحق ہوتا ہے تو دوسری طرف اصل دار بھی اپنے اصل کی وجہ سے نفع پانے کا مستحق ہو گا۔ چنانچہ فقیہہ ابن رشد نے اصل دار یعنے ودیعت رکھوانے والے اور اصل لے کر کاروبار میں لگانے والے یعنے ودیعت رکھنے والے دونوں کے دونوں کو نفع پانے کا مستحق قرار دیتے ہوئے بیان کیا ہے کہ عدل و انصاف کا

---

[1] - بدایۃ المجتہد ج ۲ کتاب الودیعۃ صفحہ ۲۶۲ ۔

یہی تقاضا ہے کہ دونوں نفع پائیں۔ آخر میں اس کی دلیل میں ان کی پیش ہوئی نظیر وہی حدیث ہے جس کو تفصیل سے پیدا آور قرضوں کے تحت بیان کیا جاچکا ہے۔" پس جنھوں نے تصرف کا اعتبار کیا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ نفع تصرف کرنے والے کے لیے ہے اور جنھوں نے اصل کا اعتبار کیا ہے وہ کہتے ہیں نفع مال والے (اصل دار) کے لیے ہے۔ اور اس وجہ سے کہ حضرت عمرؓ کے دو بیٹے عبداللہ و عبید اللہؓ کو ابو موسیٰ الاشعریؓ نے بیت المال سے رقم تصرف کرنے کے لیے دی اور ان دونوں نے تجارت کر کے نفع کمایا تو حضرت عمرؓ نے حکم دیا کہ نفع داخل کرو حضرت عمرؓ سے کہا گیا کہ آپ اس کو قراض کر دیجیے تو انھوں نے عامل (محنت کرنے والا) کو ایک حصہ دیا اور صاحب مال (یعنی یہاں مراد بیت المال) کو ایک حصہ دیا اور بے شک یہ عدل و انصاف ہے[1]"

جب ودیعت کے مال سے کاروبار ہونے لگے تو پھر ودیعت، ودیعت باقی نہیں رہتی بلکہ قراض یا مضاربت کی سی حالت ہو جاتی ہے جس کی تفصیل کی جاچکی۔ عہد جدید میں ودیعت (ڈپازٹ) کا مسئلہ خاص اہمیت رکھتا ہے اس لیے ہم نے اس کو کچھ تفصیل سے بیان کیا ہے۔

معاشیات کے اساسی مباحث میں مبادلۂ دولت کا مسئلہ اپنی اہمیت اور نزاکت کے سبب سے بہت زیادہ توجہ طلب مانا جاتا اور علمی و عملی لحاظ سے خاص اہمیت رکھتا ہے بقدر گنجایش اسلامی اصول و عمل کے پیش نظر ایک صاف خاکہ اوپر پیش کیا گیا۔

---

[1] ابن رشد الحفید: بدایۃ المجتہد ج ۲ کتاب الودیعۃ صـ ۲۶۲۔

چھٹا باب

صرفِ دولت

خلاصہ:۔ اس باب میں صرف دولت سے متعلق بحث کی گئی ہے۔ قرآن مجید میں جس طرح پیدائش دولت، تقسیم دولت اور مبادلہ دولت سے متعلق ہدایتیں ہیں اسی طرح صرف دولت سے متعلق بھی کافی ہدایتیں ہیں۔

قرآن مجید نہ صرف ضروریات زندگی کی اہم ضروری چیزوں سے استفادہ کی تعلیم دیتا ہے بلکہ اس نے بڑی فیاضی سے آرام و آسائش، زینت و زیبائش کی چیزوں سے بھی استفادہ کی پوری اجازت دی ہے۔ زندگی کے غلط نظریوں سے معیشت کے متعلق راہبی رنگ کے خام قسم کے خیالات کو قرآن مجید نے ردکر دیا ہے۔

دولت سے انسانی گذر بسر وابستہ ہے لازم ہے کہ انسان صرفِ دولت میں احتیاط سے کام لے۔

اکتناز دولت اور تبذیر دولت کا تذکرہ کرتے ہوئے معیار زندگی سے بحث کی گئی ہے کہ زندگی کا کونسا بہتر معیار ہے! اور واضح کیا گیا ہے کہ "عطیات قدرت سے دست کش رہنا بھی کفران نعمت ہے

اور تمام عمر تن پروری کی نذر کر دینا اور بھی گمراہی ہے۔ دنیا کی لذتوں کا اعتدال سے لطف اٹھانا اور پھر بھی نفس پر قابو رکھنا گو دشوار سہی لیکن زندگی کا سب سے کامیاب طریق یہی ہے" اور اسلام نے اپنے پیروؤں کو اسی کے معیار کے اختیار کرنے کی ہدایت دی ہے۔

آخر میں حجر یا وارڈ سے بحث کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ اسلامی حکومت نہ صرف یتیموں کے مال و جائداد پر اپنی نگرانی قایم کرتی تھی بلکہ فضول خرچ اور نا اہلی سے دولت لٹانے والے مال داروں پر بھی کڑی نگرانی قایم کردی تھی آج کل کا محکمہ کورٹ آف وارڈز ان فرائض کو ادھورے پن سے انجام دیتا ہے۔

(۱) صرفِ دولت کے اسلامی اصول

دولت سے متعلق سب سے آخری اور سب سے زیادہ اہم صرف دولت کا مرحلہ ہے۔ کسی ملک میں دولت خواہ کتنی ہی افراط سے کیوں نہ پیدا ہو اس کی تقسیم کیسے ہی اچھے طریقہ سے اور مبادلہ کتنا ہی منصفانہ کیوں نہ ہو اگر دولت صحیح طریقہ پر صرف نہ کی جائے تو دولت پیدا کرنے کا اصل مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔ تمام معاشی جدوجہد اور جانفشانی کا بظاہر مقصد تو دولت پیدا کرنا ہے لیکن انسانی حاجتوں کو پورا کرنا دولت کی حقیقی غرض و غایت ہوا کرتی ہے۔

پیدائش دولت اسی لیے عمل میں آئی ہے کہ اسے صرف میں لایا جائے اور انسانی حاجتیں پوری کی جائیں اب فرض کیجیے کہ اس تمام معاشی جدوجہد کے بعد پیدا کی ہوئی دولت کسی بے کار مصرف پر صرف کر دی جائے تو دولت کا پیدا کرنا نہ کرنا دونوں برابر ہیں۔ حضرت عثمانؓ کے عہد میں دولت کی وہ افراط ہوئی کہ باید و شاید مورخین کا بیان ہے کہ "مدینہ میں مال و دولت کی کثرت

اتنی بڑھی کہ بے فکروں نے کبوتر بازی اور غلیل بازی شروع کر دی آخر حضرت عثمانؓ نے ان کی روک تھام کے لیے ایک ایسے افسر کو مقرر کیا جس نے کبوتروں کو پر قینچ کے غلیلیں توڑ ڈالیں۔[1]

قرآن مجید میں جس طرح پیدایش دولت، تقسیم دولت اور مبادلہ دولت کے متعلق ہدایتیں ہیں اسی طرح صرف دولت کی نسبت بھی بہت سی ہدایتیں پائی جاتی ہیں۔ اسلام نے جب زندگی کا ایک نیا زاویہ نگاہ پیش کیا تو صحابہ کرامؓ کو رسول کریمؐ سے صرف دولت کے متعلق ہدایتیں حاصل کرنے کی جستجو ہوئی چنانچہ قرآن مجید میں بعض مقاموں پر اس کا تذکرہ ہے مثلاً

يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ؟ — اے پیغمبر! لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں؟

پ ۲ بقرہ ع ۲۶

پھر اسی سورہ میں ایک رکوع بعد ہی اس کا اعادہ ہوا ہے کہ

يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ؟ — اے پیغمبر! لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں؟

پ ۲ بقرہ ع ۲۷

صرف دولت کے سلسلہ میں اسلامی ہدایت نامہ کے دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ عقل کی راہ سے انسان ابھی ان نکتوں تک نہیں پہنچا ہے۔

صرف دولت میں بجائے دولت کے عموماً انسانی احتیاجات سے بحث ہوتی ہے کیونکہ دولت انسانی احتیاجات پر ہی صرف ہوتی ہے۔

اب ہم انسانی احتیاجات کے متعلق غور کریں گے۔

بے انتہا انسانی خواہشیں

ہر شخص کے اندر آرزوؤں اور تمناؤں کا سمندر موجزن رہتا ہے پیدایش دولت کی بحث میں انسانی احتیاجات کی اور قرآنی الفاظ میں اس امر کی وضاحت کی جا چکی ہے کہ

اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا ـ — آدمی سخت لالچی اور بے صبرا پیدا کیا گیا ہے

پ ۲۹ المعارج ۷، ع ۱

[1] تاریخ طبری صفحہ ۳۰۲۷ نیز صفحہ ۳۰۲۸ مطبوعہ لیڈن نیز سیوطی: تاریخ الخلفا صفحہ حالات حضرت عثمانؓ

حدیثوں میں بھی انسانی فطرت کو اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ "رسول کریمؐ نے یہ فرمایا کہ بنی آدم کو خدا سونے سے بھری ہوئی ایک وادی دے تو دوسری کی خواہش کرے اور اگر دوسری دی جائے تو تیسری کی خواہش کرے اور انسان کا پیٹ تو مٹی کے سوا اور کسی چیز سے نہیں بھرتا"[1] غرض مہد سے لیکر لحد تک انسان کی خواہشیں اس سے لپٹی رہتی ہیں۔

انسان مال و دولت کا دلدادہ ہے

پھر اسی بے قناعتی کے سلسلہ میں انسانی فطرت میں ایک اور جذبہ کا اضافہ ہوا جس کو قرآن نے ان الفاظ میں بیان فرمایا کہ

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِينَ وَالْقَنَاطِيرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْأَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ۗ ذَٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا۔

پ۳ آل عمران ۳ ع۲

انسانوں کے لیے عورتوں بچوں اور سونے چاندی کے ڈھیروں اور نشان کیے ہوئے فوجی گھوڑوں مویشیوں اور کھیتی باڑی کی محبوب خواہشوں سے زینت دی گئی ہے (سب) دنیاوی زندگانی کا سامان ہے۔

قرآن ایک طرف تو اس حقیقت کو آشکار کرتا ہے اور دوسری طرف وہ ان سے استفادہ کی بھی تعلیم دیتا ہے؛ قرآن کی بات اسی نقطہ پر ختم نہیں ہو جاتی بلکہ جیسا کہ ہر ایک قرآن پڑھنے والا جانتا ہے کہ اس نے کائنات کے پورے نظام کو انسانی خواہشوں کا مرجع بنا کر اس کے سامنے پھیلا دیا ہے پھر ان کے ساتھ ہی انسان کو عقل کا ایک اسم اعظم عطا ہوا ہے کہ اس کے زور سے انسان ان اشیاء پر پورا قابو پا لیتا ہے عطیات قدرت سے زیادہ سے زیادہ دولت پیدا کرنا اور پھر اس پیدا کی ہوئی دولت کو بہتر سے بہتر طریقہ پر صرف کرنا دنیا میں انسان کا عام کام ہے۔

انسانی زندگی میں احتیاجات کی اہمیت

انسانی احتیاجات کی بدولت ہی زندگی کی یہ چہل پہل ہے۔ اگر انسان میں

---

[1] بخاری پ۲۶ کتاب الرقاق بروایت ابن زبیرؓ نیز بروایت ابن عباسؓ۔

سرے سے احتیاجات ہی نہ ہوتے یا ضروریات زندگی آسانی سے گھر بیٹھے خود بخود پورے ہو جاتے جیسا کہ بنو اسرائیل کا واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ

"اور میں نے چالیس برس بیابان میں تمھاری رہبری کی ہے تمھارے کپڑے تم پر پرانے نہیں ہوئے اور نہ تمھارا جوتا تمھارے پاؤں میں پرانا ہوا نہ تم نے روٹی کھائی اور نہ تم نے شراب یا اور کوئی نشے کی شئے پی"[1]

تو بقول ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب "نہ معیشت ہوتی اور نہ معاشیات اور "دنیا کی تمام جامعوں میں معاشیات کا درس کل ہی سے بند ہو جائے"[2] بلکہ سچ تو یہ ہے کہ انسانی تمدن اور ذہانت کی ترقی ہی نہ ہو سکتی اور انسان نہایت ادنیٰ جانوروں سے بھی پست تر مخلوق بن کے رہ جاتا۔

عطیات قدرت سے استفادہ کی تعلیم

دوسرے باب میں تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ اب تک تو مذہب اس کا نام سمجھا جاتا تھا کہ زمین اور زمین کی پیداوار سے آدمی جہاں تک دور بھاگ سکتا ہو بھاگے لیکن قرآن یہ تعلیم دیتا ہے کہ زمین اور زمین میں جو کچھ ہے اس سے کھلے بندوں پورا پورا فائدہ اٹھایا جائے حاصل یہ کہ

لَا تَنْسَ نَصِيبَكَ مِنَ الدُّنْيَا — اپنا دنیاوی حصہ نہ بھول جا

پ۲۰ القصص ۲۸ ع ۸

آرام و آسائش کی چیزوں سے استفادہ کی تعلیم

"پیدائش دولت" کے باب ۳ میں یہ تفصیل کی جاچکی ہے کہ قرآن میں نہ صرف بڑی اہم ضروریات زندگی کی تکمیل کی اجازت ہے بلکہ آرام و آسائش اور زینت و زیبائش کی چیزوں سے بھی استفادہ کی کافی اجازت دی گئی ہے قرآن گو معاشی کتاب نہیں لیکن "زندگی" کا ایک صحیح

---

[1] بائبل استثناء باب ۲۹ نمبر ۵

[2] ڈاکٹر ذاکر حسین خاں: معاشیات مقصد اور منہاج صفحہ ۶۹ شائع کردہ ہندوستانی اکیڈیمی الہ آباد۔

نظام العمل ضرور ہے اگر اس میں معاش و معیشت کے مسائل نہ ہوتے تو تو پھر اس پر "نظام نامہ زندگی" کا اطلاق ہی نہ ہوتا۔ انسان کی زندگی کا تعلق تو معاش و معاد ہی سے ہے اس لحاظ سے معاش کا تذکرہ بھی براہِ راست ہونا چاہیے تھا اور ہوا ہے۔

اکتناز دولت اور تبذیر دولت کی مذمت

اسلامی معاشیات میں جہاں دولت کو صرف کرنے پر زور دیا گیا ہے وہیں اس نے بخل اور اکتناز دولت کو بھی ناروا قرار دیا ہے کیونکہ جو دولت بخل کے ذریعہ اکھٹی کر کے ذخیرہ بنا کر رکھی جاتی ہے اُس کا نتیجہ پیدا آور وسائل کو ضائع کرنے کے مترادف ہے۔ دولت اکھٹی کرنے یا حد سے زیادہ پس اندازی کرنے کی صاف الفاظ میں مذمت کی گئی ہے کہ

وَلَا یَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ یَبْخَلُوْنَ بِمَا اٰتَاھُمُ اللّٰہُ مِنْ فَضْلِہٖ ھُوَ خَیْرًا لَّھُمْ بَلْ ھُوَ شَرٌّ لَّھُمْ ۔ سَیُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِہٖ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ ۔

پ۴ آل عمران ۳ ع۱۹

جو چیز کہ اللہ نے اپنے فضل و کرم سے ان کو عنایت کی ہے تو جو لوگ اس میں بخل کرتے ہیں وہ یہ خیال نہ کریں کہ یہ ان کے حق میں بہتر ہے بلکہ وہ ان کے حق میں بُرا ہے۔ قیامت کے دن جس چیز میں کہ وہ بخل کرتے ہیں اس چیز کا انھیں طوق پہنایا جائے گا۔

نیز یہ کہ

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ مَنْ کَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرًا ۔ الَّذِیْنَ یَبْخَلُوْنَ وَیَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَیَکْتُمُوْنَ مَا اٰتَاھُمُ اللّٰہُ مِنْ فَضْلِہٖ ۔

پ۵ النساء ۴ ع۶

بے شک اللہ شیخی باز کو پسند نہیں کرتا یعنی ان کو جو (خود) بخل کرتے ہیں اور دوسرے لوگوں کو بھی بخل کرنے کا حکم دیتے ہیں اور جو (دولت) اللہ نے انھیں اپنے فضل سے عنایت کی ہے اس کو (ازراہِ بخل) چھپاتے ہیں۔

قرآن مجید میں ایک بہت بڑے سرمایہ دار قارون کی مثال پیش کی گئی ہے جو

اپنی دولت کو اندوختہ بنا کر رکھتا اور بخل کرتا تھا ۔

إِنَّ قَارُونَ كَانَ مِن قَوْمِ مُوسَىٰ فَبَغَىٰ عَلَيْهِمْ ۖ وَآتَيْنَاهُ مِنَ الْكُنُوزِ مَا إِنَّ مَفَاتِحَهُ لَتَنُوءُ بِالْعُصْبَةِ أُولِي الْقُوَّةِ	بے شک قارون موسیٰ کی قوم میں سے تھا۔ اس نے سرکشی کی اور ہم نے اسے اتنے خزانے دیئے تھے کہ ان کی کنجیاں ایک زور آور جماعت تک کو تھکا دیتی تھیں ۔
پ ۲۰ القصص ۲۸ ع ۸	

قارون اپنی دولت کو پیدا آور اغراض پر صرف کرنے کے بجائے اس سے فتنہ و فساد پھیلایا کرتا تھا اس کی قوم والوں نے اس کو مشورہ دیا کہ

وَأَحْسِن كَمَا أَحْسَنَ اللَّهُ إِلَيْكَ ۖ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْأَرْضِ ۖ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِينَ ۔	تو لوگوں کے ساتھ بھلائی کر جس طرح کہ خدا نے تیرے ساتھ بھلائی کی ہے۔ اور زمین پر فساد پھیلانے کی کوشش نہ کر بے شک خدا فساد پھیلانے والوں کو پسند نہیں کرتا

اُس نے کہا ۔

قَالَ: إِنَّمَا أُوتِيتُهُ عَلَىٰ عِلْمٍ عِندِي	مجھے یہ (دولت) میرے اپنے علم کی بدولت ملی ہے

قرآن پوچھتا ہے کہ

أَوَلَمْ يَعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ قَدْ أَهْلَكَ مِن قَبْلِهِ مِنَ الْقُرُونِ مَنْ هُوَ أَشَدُّ مِنْهُ قُوَّةً وَأَكْثَرُ جَمْعًا ۔	کیا اسے معلوم نہیں کہ خدا نے اس سے پہلی قوموں میں سے ان لوگوں تک کو ہلاک کر دیا جو قوت میں اس سے کہیں بڑھ کر تھے اور جتھا بھی بہت زیادہ رکھتے تھے ۔
پ ۲۰ القصص ۲۸ ع ۸	

غرض سرمایہ دار قارون کا خاتمہ اور اس کے انجام کا تذکرہ سارے قارون صفت سرمایہ داروں کے لیے ایک تنبیہ اور ایک تازیانہ ہے ۔

اگر ایک طرف قارون صفت سرمایہ داروں کی دولت کو اندوختہ کرنے کی بناء پر مذمت کی ہے تو دوسری طرف قرآن میں روپیہ اُڑانے والوں (مُبذّرین) کی بھی ویسی ہی بُرائی کی گئی ہے ۔

وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيرًا ۔ إِنَّ الْمُبَذِّرِينَ كَانُوا إِخْوَانَ الشَّيَاطِينِ ۔	اور دولت نہ اُڑا ۔ بے شک روپیہ اُڑانے والے شیطان کے بھائی ہیں ۔

وَكَانَ الشَّيْطَانُ لِرَبِّهِ كَفُوراً۔ — اور شیطان اپنے پروردگار کا ناشکرا ہے۔

پ ۱۵ بنی اسرائیل ۱۷ ع ۳

پھر مختصر طور پر دولت کے صرف کرنے کا یہ راستہ بتایا گیا ہے

وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَىٰ عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُومًا مَّحْسُورًا۔ — اور تو اپنے ہاتھ کو اپنی گردن کی طرف جکڑا ہوا نہ رکھ (یعنی بخل نہ کر) اور نہ اسے بالکل کھول دے ورنہ تو ذلیل و خوار ہو کر بیٹھ رہے گا۔

پ ۱۵ بنی اسرائیل ۱۷ ع ۳

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ انسان جو کچھ دولت کماتا ہے اگر وہ اس تمام دولت کو اڑا دے تو اس کی ذہنی کیفیت اور اس پر نفسیاتی اثر یہ مرتب ہوگا کہ وہ فَتَقْعُدَ مَلُومًا مَّحْسُورًا۔ ذلیل و خوار ہو کر بیٹھ رہے گا۔

حدیثوں میں تو یہاں تک بتایا گیا ہے کہ "فقر کفر تک پہنچا دیا کرتا ہے" رسول کریم نے فرمایا ہے کہ "اپنے وارثوں کو مال دار چھوڑنا بہتر ہے بہ نسبت اس کے کہ انھیں نادار چھوڑا جائے اور وہ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے پھریں"[1] پھر حدیث ہی نہیں بلکہ قرآن کی بعض آیتوں میں مال و دولت کو گذر بسر کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے مثلاً

أَمْوَالَكُمُ الَّتِي جَعَلَ اللَّهُ لَكُمْ قِيَامًا — تمھارا مال جو اللہ نے تمھارے لیے معاش کا ذریعہ بنایا ہے۔

پ ۴ النساء ۴ ع ۱

غرض جس دولت سے ہماری گذر بسر ہوتی ہے اس کے صرف میں ہمیں احتیاط سے کام لینا چاہیے۔

اسلام میں صرف دولت کی کچھ اور خصوصیتیں

صرف دولت سے متعلق اسلام کے خاص مسلک کی وضاحت کی جا چکی

ایک خصوصیت تو یہ ہے کہ وہ صرف دولت کو ضروریات زندگی یا راحت و آسائش کی چیزوں تک محدود نہیں رکھتا بلکہ زینت و زیبائش اور تعیشات کی اشیاء سے بھی استفادہ کی اجازت دیتا ہے اور بقول مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی

---

[1] بخاری پ ۱۹ کتاب الوصیت۔ نیز بخاری پ ۲۷ کتاب الفرائض۔ حدیث مذکور عربی متن کے ساتھ پیدائش دولت کے باب ۲ میں اصل کے تحت گذر چکی۔

"اسلام زیب وزینت و آرائش کے حدود تک میں جانے والوں کو مذہبی دائرہ میں بلند سے بلند مقام عطا کرنے کو تیار ہے سلیمانی تخت پر بھی مذہبی مدارج کا سب سے بلند ترین درجہ یعنے نبوت مل سکتی ہے ۔ رسول علیہ السلام کا خلیفہ برحق بھی "الغنی" کے لقب کو باعث فخر قرار دے سکتا ہے یہ بات اسلام کی ایسی خصوصیت ہے کہ جس پر بحث کرنے کی بھی چنداں ضرورت نہیں جو کچھ اب تک اس سلسلہ میں بیان کیا جا چکا ہے وہی کافی ہے"[1]

اسلامی معاشیات کی دوسری اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں دینی مصارف اور دنیوی مصارف کا کوئی فرق نہیں ہے عام مذاہب اور خود عرب کے قدیم معاشی نظام میں دینی مصارف اور دنیوی مصارف الگ الگ سمجھے جاتے تھے مگر قرآن اس نقطۂ نظر کو پیش کرتا ہے کہ جس طرح یتیموں محتاجوں اور مسافروں پر خرچ کرنا نیکی اور بھلائی کا کام سمجھا جاتا ہے اسی طرح اپنے ماں باپ اور رشتہ داروں پر صرف کرنا بھی نیک کام ہی شمار ہوتا ہے

يَسْئَلُوْنَكَ مَا ذَا يُنْفِقُوْنَ ؟	اے محمد! لوگ تم سے پوچھتے کرتے ہیں کیا خرچ کریں؟
قُلْ : مَا اَنْفَقْتُمْ مِنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۔	تم کہہ دو کہ والدین، رشتہ داروں یتیموں، مسکینوں اور مسافروں پر خرچ کرو ۔
وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ	اور تم جو بھی نیکی کرو گے تو بے شک خدا اس کو جانتا ہے ۔
پ ۲ البقرہ ع ۲۶	

اسلام نے جو اہمیت، خاندان پر صرف کرنے کو دی ہے اس کا اندازہ اس حدیث سے ہو سکتا ہے، کہ

"رسول کریمؐ نے فرمایا کہ ایک دینار جو تو نے خدا کی راہ میں دیا اور ایک دینار جو تو نے کسی غلام کے آزاد کرانے میں صرف کیا اور ایک دینار کسی مسکین کو صدقہ دیا اور ایک دینار جو تو نے

[1] ۔ اسلامی معاشیات از مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی صفحہ صرف دولت کی بحث

اپنے خاندان پر صرف کیا تو ان سب سے زیادہ اجر و ثواب کا
موجب وہ دینار ہے جو تو نے اپنے خاندان پر صرف کیا ہے[1]

غرض ماں باپ اور بچوں پر دولت صرف کرنا بھی اسلام میں نیکی قرار دیا گیا ہے حتیٰ کہ حدیثوں میں خود اپنی ذات پر صرف کرنا بھی نیکی قرار دیا گیا ہے رسول کریمؐ سے ایک شخص نے پوچھا کہ میرے پاس صرف ایک اشرفی (دینار) ہے اسے کیا کروں؟ ارشاد فرمایا کہ

تَصَدَّقْ عَلٰی نَفْسِكَ[2] • اپنی ذات پر خرچ کر

اور ایک دوسری حدیث کے آخری الفاظ یہ ہیں کہ

اَبْدَاءْ بِنَفْسِكَ • اپنی ذات سے ابتدا کر

اسلام کی تعلیم میں ہر شخص اللہ کا بندہ ہے اور بندہ ہے تو بندہ پر مالک کے مال کی حفاظت واجب ہے۔ خواہ وہ مال اس کی ذات میں واقع کیوں نہ ہو۔ خودکشی جو حرام ہے وہ بھی اسی نظریہ کا دوسرا رخ ہے۔

اسلامی معاشیات نے دولت کا پہلا مصرف خود کمانے والے کی ذات اور اس کے اہل و عیال اور دوسرے رشتہ داروں کو قرار دیا ہے۔ پھر صرف کرنے کا یہ دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا ہے چنانچہ ہر صاحب نصاب سے اسلامی حکومت کو زکات اور صدقہ کے نام سے ایک مقررہ محصول وصول کرنا چاہیے اور مالداروں سے لے کر ناداروں کو دینا چاہیے۔ آئندہ "مالیات عامہ" میں زکات کی تفصیل کی جائے گی البتہ یہاں اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ اگر" اس رقم کو ایک ضابطہ اور نظام کے ساتھ ملی ضرورتوں پر صرف کیا جائے تو مسلمانوں کا ایک یتیم بچہ اور ایک لاوارث بیوہ بھی نان نفقہ کو محتاج نہ رہے، ایک غریب لڑکا یا لڑکی افلاس کے باعث جاہل نہ رہے، ایک اندھا، ایک لنگڑا، ایک لولا اور اسی طرح اپاہج نان شبینہ کو محتاج نہ رہے اور مسلمانوں کے وہ تمام کام جو روپیہ نہ ہونے کی وجہ سے آج نہیں ہو رہے ہیں برابر جاری رہیں۔ کاش! زکات کی رقم آج بھی ایک بیت المال میں

---

[1] مسلم، نیز ترمذی نسائی و ابن ماجہ ۔ [2] ابو داؤد، کتاب

جمع ہوتی اور ایک ضابطہ اور نظام کے ساتھ محتاجوں پر صرف کی جاتی۔[1]

(۲) احتیاجات کی قسمیں

انسان اپنی دولت کو اپنی احتیاجات پر صرف کرتا ہے اگر اس کی احتیاجات پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ انسان کی بعض احتیاجیں ایسی ہیں جن کا پورا کرنا اس کی بقا کے لیے ضروری ہے بعض ایسی ہیں جو اس کی کارکردگی کو برقرار رکھنے یا کارکردگی کو بڑھانے کے لیے ضروری ہیں اور بعض احتیاجیں محض راحت آسایش اور زیبائش کی خاطر پوری کی جاتی ہیں۔

ضروریات زندگی ایسی احتیاجات جن کا پورا کرنا بہت ضروری ہے وہ ضروریات زندگی کہلاتی ہیں۔ انسان کو سب سے پہلے کھانے کے لیے غذا کی، پہننے کے لیے کپڑے کی اور رہنے کے لیے مکان کی ضرورت ہے۔

غذا:۔ قدرت نے انسان کے لیے طرح طرح کے پھل، ترکاریاں اور اناج اگائے ہیں پھر جانوروں کا گوشت، دودھ، انڈے، شہد یہ سب بطور غذا کے کام آتے ہیں، ہر شخص اپنی قدرت کے موافق کھانے کی چیزیں استعمال کرتا ہے۔

مدنی زندگی کی ابتدا میں تمام مسلمانوں کو جو کے بے چھنے آٹے کی روٹی ملتی تھی اور میدہ کی سفید روٹی انھوں نے کبھی نہیں کھائی تھی چنانچہ ابو حازم کہتے ہیں کہ میں نے سہل بن سعدؓ سے پوچھا کہ کیا رسول اللہؐ نے کبھی میدہ استعمال فرمایا؟ سہل نے کہا کہ رسول اللہؐ نے مبعوث ہونے کے دن سے وفات کی گھڑی تک

---

[1] ۔ مضامین مولانا محمد علی مرحوم صفحہ ۱۱۹ شائع کردہ جامعہ ملیہ دہلی ماخوذ از ہمدرد مورخہ ۴ / فروری ۱۹۲۷ء۔

سیدہ کبھی دیکھا بھی نہیں۔ ابو حازم کہتے ہیں کہ پھر میں نے سہل سے پوچھا کہ آنحضرتؐ کے زمانہ میں کیا تمھارے پاس چھلنیاں تھیں؟ وہ بولے کہ آنحضرتؐ کے مبعوث ہونے کے دن سے وفات تک چھلنی کی صورت تک نہیں دیکھی۔ ابو حازم کہتے ہیں کہ میں نے پوچھا کہ تم جَو کا بے چھنا آٹا کیسے کھاتے تھے؟ انھوں نے جواب دیا کہ ہم جَو کو پیس کر اس کے آٹے کو منہ سے پھونکتے تھے پھونکنے سے جتنی بھوسی اڑ سکتی وہ تو اڑ جاتی تھی[۱] لیکن واضح رہے کہ اس بے اہتمامی کا باعث محض افلاس نہ تھا۔ بلکہ سادہ زندگی کا شوق بھی معمولی تکلف سے نہیں مانع ہوتا تھا۔

یہاں یہ تذکرہ بے جا نہ ہوگا کہ عہد نبوت کے ۱۹ سال بعد ہی نہ صرف عربوں کے پاس چھلنیاں بلکہ آٹا پیسنے کی ہوائی چکیاں بھی مدینہ میں چلنے لگی تھیں چنانچہ مورخین کا بیان ہے کہ "عربوں نے ہوا سے چلنے والی چکیاں بنائی تھیں کئی صندوقوں میں گزرنے والی ہواؤں سے یہ کام لیا جاتا تھا اور ۲۹ھ میں حضرت عثمانؓ کی خلافت کا یہ واقعہ ہے"[۲] بلکہ خود اس سے پہلے مورخین مثلاً طبری، ابن سعد وغیرہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کا قاتل ہوائی چکیاں بنایا کرتا تھا اور حضرت عمرؓ نے اس سے فرمائش بھی کی تھی[۳]۔

"نبی کریمؐ بنو نضیر کے باغ کی کھجوریں فروخت کر کے اپنے اہل و عیال کے لیے سال بھر کا سامان جمع کر لیتے تھے"[۴] مدنی زندگی کی ابتدائی حالات میں بتایا گیا کہ مدینہ میں غلہ کی کمی رہتی تھی لیکن جب خیبر فتح ہوا تو غلہ کی رسد میں اضافہ ہو گیا چنانچہ "حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ جس وقت خیبر فتح ہوا ہم نے کہا کہ اب ہم پیٹ بھر کر کھائیں گے"[۵] رسول اللہؐ خیبر کے حاصلات میں

۱ ۔ بخاری پ۲۲ کتاب الطعام نیز ترمذی ج ۹ صفحہ ۲۱۶ معیشۃ اصحاب النبیؐ ۔

۲ ۔ وفیات الاسلام المرجانی صفحہ ۳۳۵ ۔ ۳ ۔ تاریخ طبری صفحہ ۲۷۲۲ سنہ ۲۳ھ

۴ ۔ بخاری پ۲۲ کتاب النفقۃ بروایت حضرت عمرؓ شروع باب کا صفحہ ۲۹ ملاحظہ

۵ ۔ بخاری پ۱۷ کتاب المغازی ۔

ازواج مطہرات کو فی کس اسی ۸۰ وسق کھجوریں اور بیس ۲۰ وسق جو سالانہ عطا فرماتے تھے[1]
آخری زمانہ میں "آپ کے پاس بیس دودھ دینے والی اونٹنیاں تھیں جن پر آپ کے گھر والے گزر بسر کرتے تھے"[2]

لباس:- غذا کے بعد انسان کو لباس کی ضرورت ہے قرآن مجید نے اس کی طرف یوں اشارہ کیا ہے کہ

یَا بَنِیْ آدَمَ ! قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَیْکُمْ لِبَاسًا یُّوَارِیْ سَوْاٰتِکُمْ وَرِیْشًا۔	اے آدم کی اولاد ! ہم نے تمہارے لیے لباس اتارے (پیدا کیے) تاکہ تمہاری ستر پوشی، اور زیب و زینت ہو۔
پ۸ الاعراف، ع۳	

اسی طرح گرمی سے بچنے کے لباس اور جنگی لباس کی جانب بھی اشارہ ہے

سَرَابِیْلَ تَقِیْکُمُ الْحَرَّ وَسَرَابِیْلَ تَقِیْکُمْ بَأْسَکُمْ۔	لبادے جو تمہیں گرمی میں بچاتے ہیں اور جنگ کا بچاؤ ہیں۔
پ۱۴ النحل ۱۶ ع۱۱	

یوں تو ہر شخص اپنی حیثیت کے موافق کپڑے پہنتا ہے تاہم لباس ایسا ہو کہ اس سے نعمت باری کا اظہار ہو چنانچہ "ابوالاحوص اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ میں رسول کریم کی خدمت میں جب حاضر ہوا تو میرے کپڑے میلے تھے، آپ نے مجھ سے پوچھا کہ کیا تم مال دار ہو ؟ میں نے عرض کی جی ہاں ! تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ کس قسم کا مال ہے ؟ میں نے عرض کی خدا نے مجھے اونٹ، بکریاں، گھوڑے اور غلام عنایت کیے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ

فَاِذَا اٰتَاکَ اللّٰہُ مَالًا فَلْیُرَ اَثَرُ نِعْمَۃِ اللّٰہِ عَلَیْکَ وَکَرَامَتِہٖ[3]	جب اللہ نے تجھے مال عنایت کیا ہے تو اللہ کی نعمت کی نشانی اور اس کی بزرگی ظاہر ہونی چاہیے۔

---

[1] - بلاذری۔ فتوح البلدان صفحہ ۲۵ خیبر [2] تاریخ طبری صفحہ ۱۷۸۴
[3] ابوداؤد پ۲۴ کتاب اللباس

"محمد بن سیرین کہتے ہیں کہ ہم ابوہریرہ کے پاس بیٹھے تھے اور وہ کتان کے دو کپڑے گیروا رنگ کے پہنے تھے۔ انہوں نے ناک صاف کی اور پھر کہا واہ واہ! ابوہریرہ کتان کے کپڑوں سے ناک صاف کرتے ہیں (ایک وہ زمانہ تھا) کہ میں اپنے تئیں منبر اور حجرہ شریف کے درمیان بے خود پڑا ہوا دیکھتا تھا اور آنے والے لوگ میری گردن پر پیر رکھ دیتے تھے اور یہ معلوم ہوتا کہ گویا میں دیوانہ ہوں حالانکہ میری وہ حالت دیوانگی سے نہ تھی بلکہ بھوک سے ہوتی تھی۔[1]

نبی کریمؐ بھی تمام مسلمانوں کی طرح معمولی قسم کا لباس پہنتے تھے چنانچہ ابوبردہ کا بیان ہے کہ "حضرت عائشہؓ نے ہمارے سامنے ایک موٹا تہ بند اس قسم کا جیسا کہ اہل یمن بناتے ہیں اور ایک چادر اسی قسم کی جس کو تم ملبدہ کہتے ہو نکالی (کہ یہ رسول کریمؐ کی چادر ہے)[2]۔" پھر ایک دفعہ شاہ روم نے رسول کریمؐ کی خدمت میں سندس کا ایک جبّہ روانہ کیا، آپؐ نے اس کو پہنا، انسؓ کہتے ہیں کہ گویا کہ میں آپ کے ہاتھوں کو دیکھ رہا ہوں جو ہل رہے تھے۔ پھر آپ نے وہ جبّہ جعفر بن ابی طالبؓ کو بھجوا دیا۔ جعفرؓ وہ لباس پہن کر رسول کریمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپؐ نے فرمایا کہ میں نے اسے تمہیں پہننے کو نہیں دیا تھا انھوں نے عرض کی کہ پھر میں اسے کیا کروں؟ آپ نے فرمایا کہ اپنے بھائی نجاشی (شاہ حبش) کو بھیج دو۔[3]

ایمن کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں حضرت عائشہؓ کے پاس گیا اور وہ ایک کرتہ پہنے ہوئے تھیں پانچ درہم کی قیمت کا قطر کا۔ انھوں نے کہا کہ ذرا میری اس لونڈی کو تو دیکھو کہ یہ گھر میں بھی اس کرتہ کے پہننے سے انکار کرتی ہے اور رسول اللہؐ کے زمانہ میں میرے ہاں اسی قسم کا ایک کرتہ تھا اور جو عورت مدینہ میں آراستہ کی جاتی تو مجھ سے اس کرتہ کو منگوا بھیجتی تھی۔[4]

۱۔ بخاری پ۲۹ کتاب الاعتصام۔ ۲۔ بخاری پ۱۲ کتاب الجہاد۔
۳۔ ابوداؤد پ۲۰ کتاب اللباس۔ ۴۔ بخاری پ۱۰ کتاب الهبۃ۔

مکان:۔ غذا اور لباس کی طرح انسان کو مکان کی بھی ضرورت ہے۔ پیدائش دولت کے باب ۳ میں تفصیل کی جا چکی کہ قرآن مجید میں مکانات محلات، ڈیرے خیمے حتیٰ کہ شیش محل وغیرہ کا بھی تذکرہ پایا جاتا ہے۔

رسول کریم مدینہ کی مسجد کے ایک حصہ میں قیام فرماتے تھے۔ مسجد اس زمانہ میں چھپر کی بنی ہوئی تھی اور جب کبھی پانی برستا تو اس کی چھت ٹپکنی تھی[۱]۔

پھر جوں جوں مسلمانوں کی خوش حالی بڑھنے لگی مسجد میں بھی اضافہ ہوتا گیا "آنحضرت کے زمانہ میں مسجد نبوی کچی اینٹوں کی بنی ہوئی اور کھجور کی شاخوں سے پٹی ہوئی تھی مجاہد (جو کہ راوی حدیث ہیں) بیان کرتے ہیں کہ اس کے ستون کھجور کی لکڑی کے تھے۔

"حضرت ابو بکرؓ نے اس میں کچھ نہ بڑھایا"

"حضرت عمرؓ نے اس میں اضافہ کیا لیکن جیسی بناوٹ رسول کریم کے زمانہ میں تھی ویسی ہی رکھی یعنے کچی اینٹوں اور کھجور کی شاخوں کی لیکن اس کے ستون بدل دیے، مجاہد نے کہا کہ وہ لکڑی کے تھے۔"

"اور حضرت عثمانؓ نے اس میں بہت کچھ اضافہ کر کے اس کی دیواریں پتھر اور چونے کی بنوائیں جس میں نقش و نگار بنے ہوئے تھے اور اس کے ستون نقشی پتھروں کے بنوائے اور چھت ساگوان (سباج) کی لکڑی کی بنوائی[۲]"

مدنی زندگی کی ابتداء میں مکان بہت معمولی ہوتے تھے۔ "ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم کے زمانہ میں اپنے ہاتھ سے ایک مکان بنایا جس میں ہم دھوپ اور بارش سے محفوظ رہتے تھے اور میں نے مکان بنانے میں کسی سے مدد نہیں لی[۳]"

---

[۱] بخاری پ ۸ کتاب الصوم ابواب الاعتکاف تفصیل پہلے باب میں صفحہ ۱۰۸ پر گذر چکی۔

[۲] ابو داؤد کتاب الوضوء بروایت عبداللہ بن عمرؓ [۳] بخاری پ ۲۶ کتاب الاستیذان۔

پھر پندرہ بیس سال کے بعد لوگوں کو اپنی دولت عمارت میں صرف کرنے کے سوا اور کوئی کام ہی نہ تھا چنانچہ "قیس کہتے ہیں کہ میں خبابؓ کے پاس گیا وہ مکان کی چنائی میں لگے ہوئے تھے مجھ سے کہا کہ ہمارے اور دوست اچھی حالت سے گذر گئے۔ دنیا سے انھیں کچھ نقصان نہیں پہنچا اور ان کے بعد مجھے اتنا مال ملا ہے کہ عمارت میں صرف کرنے کے سوا اور کوئی صورت ہی نہیں دکھائی دیتی[1]"

عمارت سے متعلق بھی اسلام کا ایک خاص نقطہ نظر معلوم ہوتا ہے۔ یہ نہیں کہ صرف بڑی بڑی عالیشان عمارتوں کی تعمیر میں بے کار روپیہ صرف کیا جائے۔ تَتَّخِذُونَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُونَ ۔ بڑے بڑے محل بناتے ہو گویا کہ تمھیں ان میں ہمیشہ رہنا ہے۔ پ ۱۹ الشعراء ع

لیکن اس کے معنے یہ نہیں کہ مکان بڑا بے ڈھنگا اور بد وضع بنوایا جائے خود رسول کریمؐ نے مدینہ کی مسجد کی تعمیر میں طلق بن علی بن طلق سے جو یمامہ کے رہنے والے تھے اینٹیں ڈھلوائی تھیں اور ان سے اس میں مدد لی تھی کیونکہ تعمیری کاموں میں یہ مہارت رکھتے تھے۔

رسول کریمؐ قبر بنانے میں تک خوشنمائی اور پائداری کا خیال رکھتے تھے تاکہ زندہ لوگوں کی آنکھوں کو بھلا معلوم ہو[2]۔

ضروریات کارکردگی

غذا، لباس، مکان کے بعد انسان کے آرام و آسائش میں اضافہ کرنے والی احتیاجات ہیں مثلاً آرام سے سونے کے لیے پلنگ، بیٹھنے کے لیے صوفے کرسیاں، فرش فروش قالین، تکیے اور پاؤں میں پہننے کے لیے موزے وغیرہ۔

"حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ جس تکیے پر رسول اللہ رات کو سر رکھ کر آرام فرماتے تھے وہ دباغت کیے ہوئے چمڑے کا تھا جس میں کھجور کی چھال

---

[1] بخاری پ ۲۶ کتاب الرقاق۔

[2] تفصیل باب ۲ پیدائش دولت میں مہارت کے تحت صفحہ ۱۹۰ پر گذر چکی۔

بھری ہوئی تھی[1]

اسی طرح اور فرنیچر ہے چنانچہ "ابورفاعہ کا بیان ہے کہ رسول کریمؐ کی خدمت میں ایک کرسی پیش کی گئی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کے پائے لوہے کے تھے۔ رسول اللہؐ اس پر بیٹھ گئے"[2]

"جابر بن عبداللہؓ کا بیان ہے کہ ایک دن نبی کریمؐ نے پوچھا کہ کیا تم لوگوں کے پاس فرش قالین ہیں؟ میں نے عرض کی فرش قالین ہم لوگوں کے ہاں کہاں ہیں! آپ نے فرمایا کہ آگاہ ہو جاؤ کہ عنقریب تمھارے پاس فرش قالین ہوں گے۔ حضرت جابرؓ کہتے ہیں اب میں اپنی بیوی سے کہتا ہوں کہ اپنے فرش قالین میرے پاس سے ہٹا لو، تو وہ کہتی ہیں کہ کیا نبی کریمؐ نے یہ نہیں فرمایا تھا کہ عنقریب تمھارے پاس قالین ہو جائیں گے تو میں انھیں رہنے دیتا ہوں"[3]

اسی طرح جوتوں کی مثال ہے کہ بغیر جوتوں کے بھی کام چل سکتا ہے لیکن پیروں کی حفاظت کے لیے چپل، سلیپر، موزے وغیرہ استعمال کیے جاتے ہیں "عیسیٰ بن طہمان کہتے ہیں کہ حضرت انسؓ نے بغیر بال کے چمڑے کی ایک پاپوش کا جوڑا ان کے سامنے نکالا۔ ان میں دو تسمے تھے۔ پھر اس کے بعد ثابت بنانی نے حضرت انسؓ سے نقل کر کے مجھ سے کہا کہ وہ نبی کریمؐ کی کفشیں تھیں"[4] آپ اکثر نعلین ہی پہنتے تھے لیکن ایک مرتبہ "نجاشی نے رسول اللہؐ کی خدمت میں دو سادے سیاہ موزے ہدیہ بھیجے آپ نے انھیں پہنا"[5]

انسان اپنی حفاظت کے لیے ہتھیار رکھتا ہے "رسول اللہؐ کی تلوار کا قبضہ چاندی کا تھا"[6]

---

[1] ابوداؤد: پ ۲۱ کتاب اللباس نیز مسلم۔ [2] نسائی ج ۲ باب جلوس علی الکرسی نیز مسلم
[3] بخاری پ ۲۱ نیز بخاری پ ۲۵ ۔ [4] بخاری پ کتاب الجہاد۔
[5] بخاری پ کتاب الطہارت۔ [6] نسائی ج ۲ باب حلیۃ السیف۔

اس کے بعد ان احتیاجات کا نمبر آتا ہے جو کسی خاص غرض مثلاً سرکاری اغراض کے تحت درکار ہوتی ہیں "جس وقت رسول کریمؐ نے شاہ روم کو خط لکھنے کا ارادہ کیا تو صحابہؓ نے عرض کی کہ وہ صرف مہر شدہ خط ہی پڑھتے ہیں چنانچہ رسالتمآبؐ نے ایک چاندی کی انگوٹھی بنوائی۔ حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ اس کی سفیدی میں گویا اب بھی رسول اللہؐ کے ہاتھ میں دیکھ رہا ہوں۔ اور اس پر محمد رسول اللہؐ کندہ تھا[1] اور اس انگوٹھی کا نگینہ حبشی عقیق تھا[2]

ضروریات آرائش و زیبائش

ضروریات زندگی اور کارکردگی کی طرح ضروریات آرائش و زیبائش ہیں، انسان عطریات سینٹ وغیرہ کا استعمال کرتا ہے۔ "حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں رسول کریمؐ کو سب خوشبو سے عمدہ جو مجھے میسر ہوتی تھی لگاتی تھی[3]

"رسول کریمؐ کو مقوقس (شاہ مصر) نے ایک کانچ کا پیالہ بھی بھیجا تھا جس میں آپ پانی پیا کرتے تھے[4]

غرض ضروریات زندگی ہوں یا کارکردگی، یا آرائش و زیبائش کی چیزیں ان سب سے استفادہ درمیانی اور اعتدالی طرز پر جائز ہے۔ آنحضرتؐ کو عطیات قدرت سے استفادہ کا کتنا خیال رہتا تھا اس کا اندازہ اس حدیث سے ہوگا، ایک مرتبہ "نبی کریمؐ اُدھر سے گزرے جدھر ایک مردہ بکری پڑی تھی آپ نے فرمایا کہ تم لوگ اس کی کھال سے فائدہ کیوں نہیں اٹھاتے؟ لوگوں نے عرض کی یہ تو مردہ ہے، آپ نے فرمایا کہ حرام تو صرف اس کا کھانا ہے[5] اس قسم کی تعلیم کا نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا مسلمانوں پر کشادہ ہوگئی۔

عبدالرحمٰن بن عوفؓ کے صاحبزادے ابراہیمؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک دن

---

[1] مسلم، کتاب اللباس ایک اور حدیث میں بجائے روم کے عجم مذکور ہے۔
[2] مسلم، کتاب اللباس۔ بروایت حضرت انسؓ۔ [3] بخاری پ ۲۴ کتاب اللباس
[4] الروض الانف شرح سیرۃ ابن ہشام صفحہ ۱۲۴۔
[5] بخاری پ ۶ کتاب الزکوٰۃ نیز بخاری پ ۸ کتاب البیوع نیز بخاری پ ۲۳ کتاب

"عبدالرحمٰن بن عوف رضؓ کے پاس کھانا لایا گیا اور وہ روزہ دار تھے عبدالرحمٰن بن عوف رضؓ کہنے لگے کہ مصعب بن عمیرؓ جو مجھ سے بہتر تھے شہید ہوئے اور وہ ایک ہی چادر میں کفنائے گئے کہ اگر ان کا اس سے سر ڈھانکا جاتا تھا تو پاؤں کھل جاتے تھے اور اگر پاؤں ڈھانکے جاتے تو سر کھل جاتا تھا۔ ابراہیمؒ کہتے ہیں کہ میں گمان کرتا ہوں کہ عبدالرحمٰنؓ نے کہا اور حمزہؓ بھی شہید ہوئے جو مجھ سے بہتر تھے پھر ہم پر دنیا کشادہ کی گئی جس قدر کہ کشادہ ہے یا یہ کہا کہ ہمیں دنیا دی گئی جتنی کہ دی گئی ہے اور ہمیں ڈر ہے کہ کہیں ہماری نیکیوں کا بدلہ (دنیا ہی میں) نہ دے دیا گیا ہو۔ پھر وہ رونے لگے یہاں تک کہ کھانا ہٹا دیا گیا۔"[1]

سونے چاندی کا استعمال

اشیاء سے استفادہ کے سلسلہ میں دو ایک باتوں کا تذکرہ ضروری ہے۔ اسلام میں مردوں کے لیے سونے چاندی کے زیورات نیز ہر کسی کے لیے سونے چاندی کے ظروف کا استعمال ناجائز قرار دیا گیا ہے۔ اس پر بھی اگر کسی کے پاس سونے چاندی کے ظروف وغیرہ ہوں تو ان پر سالانہ زکات کا محصول لگایا جاتا ہے۔ معاشیات کا ایک مبتدی بھی سمجھ سکتا ہے کہ محصول لگانے اور مردوں کو زیورات استعمال کرنے کی جو ممانعت ہے اس کا کیا منشاء ہے؟ معاشی نقطۂ نظر سے ان دونوں کا منشاء یہی ہے کہ زر زیادہ سے زیادہ گردش میں رہے اور وہ اندوختہ بن کر ایک جگہ پڑا نہ رہے۔ اگر دولت کو گردش نہ ہوگی تو خود انسان کی قسمت گردش میں آجائے گی۔

نشہ آور اشیاء

اسلام نے نشے والی چیزوں کے استعمال کی بھی ممانعت کی ہے استعمال کی ممانعت ہی نہیں بلکہ ان کی تجارت کی بھی ممانعت کر دی ہے۔ شراب اور دوسری نشے والی چیزوں کے استعمال سے معیار کارکردگی گھٹ جاتا ہے۔ نشہ والی چیزوں کے استعمال کا اثر نہ صرف فرد واحد تک محدود رہتا ہے بلکہ اس کا اثر تمام معاشرہ پر پڑتا ہے۔

---

[1] ۔ بخاری پ۱۶ کتاب المغازی ۔

مشینی عہد میں تو اس کے اثر کی اہمیت اور بڑھ گئی ہے اگر ایک انجن ڈرائیور یا بس ڈرائیور یا ہوا باز نشہ میں ہو تو وہ نہ صرف اپنی جان کو ہلاکت میں ڈالتا ہے بلکہ تمام مسافروں کی جان کے بھی لالے پڑ جاتے ہیں۔

شراب کی ممانعت کے سلسلہ میں بتایا گیا ہے کہ اس میں چند معاشی فائدے بھی ہیں اور چند نقصانات بھی لیکن فائدوں کے مقابلہ میں نقصانات زیادہ ہیں اس لیے شراب کی ممانعت کر دی گئی۔

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيْهِمَا إِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَإِثْمُهُمَا أَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا۔ پ ۲ بقرع ۲۷	اے نبی! لوگ آپ سے شراب اور جوے کے بارے میں دریافت کرتے ہیں۔ آپ کہہ دیجئے کہ ان دونوں میں بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے کچھ فائدے بھی ہیں مگر ان کے فائدوں کے مقابلہ میں ان کا گناہ اور نقصان بہت بڑھا ہوا ہے۔

نشہ آور اشیاء کے نقصان دہ اثرات کو دیکھ کر دنیا کے اکثر حصوں میں ترک مسکرات کی کوششیں جاری ہیں، پاکستان اور انڈیا یونین کے اکثر صوبوں میں ترک مسکرات پر عمل ہو رہا ہے خود امریکہ میں وہ نشہ آور اور الکحل مشروبات کے فروخت کی ممانعت مقبول ہو رہی ہے[1]

قوام اور عفو کی تشریح

صرف دولت میں بڑی احتیاط برتنے کی ضرورت ہے اس سلسلے میں یہ قرآنی حکم ہے کہ

كُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا إِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ۔ پ ۸ اعراف، ع ۳	کھاؤ پیو مگر فضول خرچی نہ کرو بے شک خدا فضول خرچی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

"ڈاکٹر ای، وی رابن سن نے اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے کہ اگر کسی ملک میں پیدائش، صرف سے بڑھ کر رہے تو نتیجہ معاشی ترقی ہو گا لیکن صرف اگر پیدائش سے بڑھ جائے تو نتیجہ معاشی پستی ہو گا"[2]

---

[1] ۔ کارور اینڈ کارمیکائل: ایلیمنٹس آف اکنامکس صفحہ ۱۴۴۔ [2] ۔ ایضاً صفحہ ۴۴۲۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ معاشی ترقی کو برقرار رکھنے یا اس میں اضافہ کرنے کے لیے آخر ہر ایک کو کتنا صرف کرنا چاہیے؟ اس سلسلہ میں قرآن کی دو آیتوں کی وضاحت کی جاتی ہے۔ پہلی آیت تو یہ ہے کہ

وَیَسْئَلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ؟ — اے پیغمبر! لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں؟
قُلِ الْعَفْوَ۔ — آپ کہہ دیجئے کہ "عفو" خرچ کریں۔

پ۲ بقرہ ع۲۶

طبری، زمخشری اور بیضاوی قرآن کے بڑے بلند پایہ مفسرین سمجھے جاتے ہیں۔ ان مفسرین نے "عفو" کے معنے زیادتی (Surplus) کے لیے ہیں[1]۔

عفو کی تشریح

مفسرین نے "عفو" کی تشریح میں بڑی بحث کی ہے یہاں اس کے دہرانے کی جگہ نہیں۔ معاشی اصطلاح میں اس کا خلاصہ یوں سمجھیے کہ جو شخص شغل اصل کے منافع سے اپنی احتیاجات پوری کیا کرتا ہے اس کے متعلق آیت مذکور میں حکم دیا گیا ہے کہ وہ عفو یعنے "زیادتی" کی حد سے نہ بڑھے۔ دوسرے لفظوں میں اصل کو محفوظ رکھتے ہوئے جو زائد آمدنی ہو اس کو اپنے صرف میں لاتا رہے۔

قرآن میں ہو غوطہ زن اے مرد مسلمان ؛ اللہ کرے تجھ کو عطا جدت کردار
جو حرف قل العفو میں پوشیدہ ہے اب تک ؛ اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار
انسان کی ہوس نے جنہیں رکھا تھا چھپا کر ؛ کھلتے نظر آتے ہیں بتدریج وہ اسرار

ضرب کلیم اقبال

حدیثوں میں بھی اصل کو محفوظ رکھنے کے لیے خاص ہدایتیں ہیں۔ رسول کریم نے رہبری فرمائی ہے کہ

مَنْ بَاعَ دَارًا اَوْعَقَارًا فَلَمْ یَجْعَلْ ثَمَنَہٗ فِیْ مِثْلِہٖ کَانَ قَمِنًا اَنْ لَّا یُبَارِکَ فِیْہِ[2]

جس شخص نے مکان یا جائداد بیچ ڈالی اور اس کی قیمت سے اسی کے مثل (کوئی جائداد) نہ خریدی تو خدا اس میں برکت نہیں دیتا۔

---

[1] العفو = الزیادۃ۔ [2] ابن ماجہ باب۔ نیز یحییٰ ابن آدم: کتاب الخراج

مذکورہ حدیث کا منشا یہی ہے کہ جو چیزیں کہ اصل کی حیثیت سے کام کرتی ہیں پہلے تو انھیں الگ ہی نہ کیا جائے اور اگر کسی ضرورت سے مثلاً تبدیل مقام یا کسی اور وجہ سے اس کو الگ کرنا ہی پڑے تو اصل کو پھر پیدا آور اغراض میں لگا دے۔

اس سلسلہ میں ایک خاص واقعہ درج کیا جاتا ہے۔ حضرت جابرؓ کا بیان ہے کہ "ہم رسول کریمؐ کی خدمت میں حاضر تھے کہ اتنے میں ایک شخص انڈے کے برابر سونا لیے آیا اور عرض کی کہ اے اللہ کے رسول! ایک معدن سے مجھے یہ سونا ہاتھ آیا ہے آپ اس کو لے لیجیے۔ یہ صدقہ ہے اس کے سوا میرے پاس کچھ مال نہیں ہے۔ رسول کریمؐ نے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ پھر اس شخص نے دہنی طرف سے آکر وہی کہا۔ آپؐ نے منہ پھیر لیا۔ پھر بائیں طرف سے آکر وہی بات کہنے پر آپؐ نے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ پھر وہ پیچھے سے آیا۔ رسول کریمؐ نے وہ سونا اُٹھا کر پھینک دیا۔ (راوی کا بیان ہے) کہ وہ سونا اگر لگ جاتا تو اُسے زخمی یا چٹیلا کر دیتا۔ پھر رسالت مآبؐ نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی اپنا پورا مال لے کر آتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ صدقہ ہے پھر بیٹھ کر لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتا ہے بہتر صدقہ وہ ہے کہ جس کا مالک صدقہ دے کر بھی مالدار رہے"[1]

قرآن شریف کی دوسری آیت ہے۔

وَالَّذِيْنَ إِذَا أَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا۔	وہ جب خرچ کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے ہیں اور نہ اسراف کرتے ہیں بلکہ اس کے درمیان ان کا خرچ اعتدالی ہوتا ہے۔
پ ۱۹ الفرقان ۲۵ ع ۶	

قوام کی تشریح

مفسرین نے قوام کی تشریح میں "وسطاً عدلاً" کہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ درمیانی حالت اختیار کرے خود حدیثوں میں اعتدال پر زور دیا گیا ہے کہ

خَيْرُ الْأُمُوْرِ أَوْسَطُهَا۔ — تمام کاموں میں میانہ روی بہتر ہے۔

---

[1] ۔ ابو داؤد کتاب الزکاۃ نیز تفسیر طبری ج ۲ صفحہ — آیت: يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ

ظاہر ہے اعتدال کی حالت کہہ دینے سے رقم صرف کرنے کا تعین نہیں ہوتا اس کا مطلب یہی ہے کہ ہر شخص کو آزادی دی گئی ہے کہ وہ اپنے اختیار تمیز سے اپنی وسعت کے موافق اپنی دولت کا صرف کرے کہ

لِيُنْفِقْ ذُوْ سَعَةٍ مِّنْ سَعَتِهٖ ۲۸ الطلاق ۶۵ ع ۱ — وسعت والا اپنی وسعت کے لحاظ سے صرف کرے۔

غرض "عفو" اور "قوام" ایسے معیار ہیں کہ انسان ان کے مطابق عمل کرے تو ذلیل رسوا و خوار ہو کر بیٹھ نہ رہے اور جو کوئی "العفو" اور "قوام" کے حدود سے تجاوز کرے گا تو وہ "مبذر" سمجھا جائے گا کہ

اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ[1] — بے شک فضول خرچ شیطان کے بھائی ہیں

معیار زندگی

"اس مسئلہ پر ازحد اختلاف رائے پھیلا ہوا ہے کہ معاشی نقطہ نظر سے زندگی کا کونسا معیار بہتر ہے آیا ہم کو چند سیدھی سادی ضروریات پر قناعت کرنا اچھا ہوگا یا دنیا کی نعمتوں اور تعیشات سے دل بھر کر لطف اٹھانا۔ حکماء کے ایک طبقہ نے تو نفس پروری اور عشرت پرستی کو زندگی کی غرض وغایت قرار دیا ہے اور دوسرے نے نفس کشی اور ریاضت کو اعلیٰ مقصد ٹھیرایا ہے سچ پوچھیے تو یہ دونوں فرقے افراط و تفریط میں جا پھنسے، خدا کی بے شمار عطیات سے خواہ مخواہ دست کش رہنا بھی کفران نعمت ہے اور تمام عمر تن پروری کی نظر کر دینا اور بھی گمراہی ہے۔ دنیا کی لذتوں کا اعتدال سے لطف اٹھانا اور پھر بھی نفس پر قابو رکھنا گو دشوار سہی لیکن زندگی کا سب سے کامیاب طریق یہی ہے اور اسلام نے اپنے پیروؤں کو اسی طریق کی ہدایت کی ہے کسی زمانہ میں مسلمان ایک ہی وقت میں سچے دنیا دار اور خدا پرست اور صاحب ثروت اور فقیر منش بن کر اس طریقہ کی خوبیاں دنیا پر ثابت کر بھی چکے ہیں چنانچہ حضرت مولانائے روم نے اسی نکتہ کی یوں توضیح کی ہے

چیست دنیا از خدا غافل بدن
نے قماش و نقرہ و فرزند و زن

مذہبی اور اخلاقی پہلو سے قطع نظر کر کے یہی طریق اعتدال معاشی نقطہ نظر سے اصولاً اور

[1] قرآن سورہ بنی اسرائیل ع ۳

تجربۃً بہترین ثابت ہو رہا ہے۔[۱]

صرف دولت میں احتیاط

دولت آرام و راحت کا ذریعہ ہے۔ قرآن مجید میں دولت کو دنیا کی زینت اور شگفتگی (زھرۃ الحیوٰۃ الدنیا) قرار دیا گیا ہے لیکن اگر دولت کا مصرف ٹھیک نہ ہو تو یہی زینت و زیبائش فتنہ سامان بن سکتی ہے۔ یہی ہوائی جہاز جن کی ایجاد سے انسان کو بے شمار فائدے ہوئے ہیں بم برسا کر تباہی اور تاراجی بھی لاتے ہیں۔

بہر طور صرف دولت میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ دولت کی عطا کے ساتھ اس کے صرف میں بھی بڑی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، رسالت مآبؐ کو کبھی یہ اندیشہ نہیں ہوا کہ آپ کی امت پیدائش دولت میں کوتاہی کرے گی بلکہ صرف دولت ہی کے متعلق آپ کو اندیشہ تھا چنانچہ ابو سعید الخدریؓ کا بیان ہے کہ "رسول کریمؐ نے فرمایا کہ مجھے تم پر زیادہ اندیشہ برکات زمین کا ہے جو اللہ نے تمھارے لیے پیدا کی ہیں۔ کسی نے دریافت کیا کہ برکات زمین کیا ہیں؟ فرمایا کہ دنیا کی نعمتیں، اس شخص نے پوچھا اے اللہ کے رسول! کیا خیر سے بھی شر پیدا ہوتا ہے؟ آپؐ چپ ہو گئے ہم نے سمجھا کہ آپؐ پر اب وحی نازل ہوگی، پھر آپؐ نے اپنی پیشانی مبارک سے پسینہ پونچھ کر فرمایا کہ وہ سوال کرنے والا کہاں ہے؟ اس نے کہا میں حاضر ہوں آپؐ نے فرمایا کہ خیر سے خیر ہی ہوتا ہے لیکن یہ دنیا کی نعمتیں ہری گھاس کی طرح ہیں، جو چوپایہ اناپ شناپ حرص سے زیادہ کھا لے وہ اسے ہلاک یا ہلاکت کے قریب کر دے اور جو پیٹ بھر کر کھا لے اور آفتاب کے سامنے ہو کر جگالی کرے اور لید اور پیشاب کرے پھر اگر کھائے تو وہ آرام میں رہے" ایسی ہی یہ مثال ہے جس نے اپنے حق کے موافق حلال روزی کھائی تو وہ اس کے لیے بہت اچھا ذریعہ ہے اور جس نے غیر کا حق کھایا

۱۔ پروفیسر الیاس برنی: علم المعیشت حصہ پنجم صفحہ ۴۷، صرفِ دولت

اس کی مثال ایسی ہے کہ کھاتا چلا جاتا ہے اور پیٹ نہیں بھرتا۔[1]

غرض رسول کریمؐ نے دولت کو فصلِ بہار کے سبزہ سے تشبیہ دیتے ہوئے صرف دولت میں احتیاط برتنے کا امت کو مشورہ دیا ہے چنانچہ ایک دن وو رسول اللہؐ نے منبر پر کھڑے ہو کر یہ فرمایا کہ میں تم پر اپنے بعد صرف ان چیزوں کا خوف کرتا ہوں جو دنیا کی برکتوں میں سے تمھیں ملیں گی۔ اس کے بعد آپ نے دنیا کی نعمتوں کا ذکر کرنا شروع کیا اور یکے بعد دیگرے بیان کرتے چلے گئے پھر ایک شخص نے کھڑے ہو کر کہا اے اللہ کے رسول! کیا خیر برائی پیدا کرے گی نبی کریمؐ اس کے (جواب) سے خاموش رہے ہم لوگوں نے اپنے دل میں کہا کہ (شاید) آپ پر وحی نازل ہو رہی ہے اور سب لوگ (اس طرح) چپ ہو گئے کہ گویا ان کے سروں پر پرند بیٹھے ہوئے ہیں پھر آپ نے چہرۂ مبارک سے پسینہ پونچھ کے فرمایا کہ وہ سوال کرنے والا جو ابھی (یہیں) تھا کہاں ہے؟ کیا وہ (مال و دولت) خیر ہے تین مرتبہ یہی آپ نے فرما کے پھر ارشاد فرمایا کہ بے شک خیر برائی نہیں پیدا کرتا اور بے شک کیفیت یہ ہے کہ فصلِ بہار کا سبزہ یا تو (جانور کو) ہلاک کر دیتا ہے یا بیمار ڈال دیتا ہے مگر اس سبزی کے چرنے والے کو جو یہاں تک کھائے کہ جب اس کے دونوں کولے پھول جائیں تو وہ آفتاب کے سامنے کھڑا ہو جائے اور لید اور پیشاب کرنے کے بعد پھر چرنے لگے۔ یہ مال و دولت بھی ایک (طرح کی) میٹھی سبزی ہے اور بے شک اچھا مسلمان وہی ہے جو مال کو حق کے ساتھ لے کر اس کو خدا کی راہ میں یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں پر صرف کرے۔ اور جو شخص مال کو حق کے ساتھ نہیں لیتا وہ اس کھانے والے کے مثل ہے جو سیر نہ ہو اور وہ مال قیامت کے دن اس پر گواہی دے گا۔[2]

---

[1] بخاری جلد ۳ کتاب الرقاق۔

[2] بخاری جلد ۱ کتاب الجہاد۔

(۳) حجر یا وارڈ

صرف دولت میں بخل کے معکوس پہلو تبذیر پر بھی توجہ ضروری ہے جس طرح اسلامی معاشیات نے دولت اکھٹی کرنے والوں پر زکات عائد کی ہے تاکہ وہ دولت کو اکتناز بنا کر نہ رکھیں اسی طرح اس نے دولت اڑانے والوں (مبذرین) پر بھی کچھ پابندیاں لگائی ہیں۔ قرآن مجید کی ایک آیت ہے کہ جس میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِي جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيَمًا ـ وَارْزُقُوهُمْ فِيهَا وَاكْسُوهُمْ وَقُولُوا لَهُمْ قَوْلًا مَعْرُوفًا۔

اور تم اپنے (وہ) مال کم عقلوں کو نہ دو جس کو کہ اللہ نے تمہارے لیے معاش کا ذریعہ بنایا ہے اور اس مال میں سے ان کو کھلاؤ اور پہناؤ اور نرمی سے بات چیت کرو۔

پ۴ النساء ۴ ع۱

گو کہ اس آیت میں عام مسلمانوں سے خطاب ہے تاہم مسلمانوں کی نمائندہ جماعت یا صدر جمہوریت (امام) کو اس میں رہبری کی گئی ہے فقہائے اسلام نے مذکورہ آیت اور رسول کریمؐ اور خلفاء راشدینؓ کے طرز عمل کو سامنے رکھ کر ایک ایسا قانون بنایا جو فقہ کی کتابوں میں "کتاب الحجر" کے نام سے موسوم ہے۔

یوں تو حجر[۱] کے لفظی معنے روک دینے اور منع کر دینے کے ہیں لیکن قانونی اصطلاح میں کسی شخص کے تصرفات کو کسی حد پہ رکھ کر ابتداً اختیارات سے روک دینا مراد ہے۔ محجور وہ شخص ہے جس پر قانوناً حجر عائد کیا گیا ہو محجور کے مالی تصرفات غیر قانونی قرار پاتے ہیں۔

فقہ کا مسئلہ ہے کہ اگر کوئی ایسا کم عقل ہو کہ اس کے افعال عام طور سے

۱؎ - خود (Ward.) کے لفظی معنے روکنے اور مرادی معنے نگرانی قائم کرنے کے ہیں ۔

عقل اور معمولی فہم کے مطابق نہ ہوں جس کی وجہ سے وہ اپنی جائداد اور دولت کو فضول خرچی بدانتظامی اور نا اہلی کی وجہ سے ضائع کرتا ہو تو تمام فقہائے نص قرآنی کے لحاظ سے اس بات پر متفق ہیں کہ اگر کوئی شخص حد بلوغ کو پہنچنے کے بعد ضعیف العقل (سفیہ) ثابت ہو تو اس کی جائداد اس کے حوالہ نہ کی جائے اور اگر اس کے قبضہ میں ہو تو حکومت اپنی نگرانی میں لے لے اور اس وقت تک اس پر نگرانی رکھے جب تک کہ اس میں عقل اور تمیز پختہ نہ ہو جائے حاکم عدالت کو چاہیے کہ اس پر اپنی نگرانی رکھے[1] اور مجبور کو مالی تصرفات سے روک دے اور اس کی گذر بسر کے لیے اپنی صوابدید سے قرآنی ہدایت کے بموجب رقم صرف کرے۔

وَارْزُقُوْهُمْ فِيْهَا وَاكْسُوْهُمْ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا۔ — ان کو اس (مال میں) سے کھلاؤ اور پہناؤ اور نرمی سے بات چیت کرو۔

پ۴ النساء ع ا

اسی طرح جب کسی مالدار کا انتقال ہو جائے اور اس کے بچوں کا کوئی ولی سرپرست نہ ہو تو اسلامی حکومت کو ان بچوں اور مرنے والے کے مال و جائداد کو اپنی سرپرستی اور نگرانی میں لے لینا چاہیے جیسے آج کل بھی محکمہ کورٹ آف وارڈز ان فرائض کو انجام دیتا ہے۔

اَجْمَعَ الْعُلَمَاءُ عَلٰى وُجُوْبِ الْحَجْرِ عَلَى الْاَيْتَامِ الَّذِيْنَ لَمْ يَبْلُغُوا الْحُلُمَ لِقَوْلِهٖ تَعَالٰى: وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰىٓ اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ[2] — تمام علما ایسے حجر کے وجوب کے بارے میں ایک سی رائے رکھتے ہیں جو کمسن یتیم بچوں پر عائد کیا جاتا ہے جیسا کہ خدائے تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ "اور یتیموں کی آزمائش کرو جب کہ وہ نکاح کے سن کو پہنچیں۔

پ۴ النساء ع ا

اسی طرح اس حجر کے دائرہ میں چھوٹے بچے (صغیر مائنر) اور دیوانے بھی

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ماوردی: الاحکام السلطانیہ باب ۲۰ قاضی کے اختیارات۔

[2] ھدایہ ج ۳ کتاب الحجر۔

آجاتے ہیں یعنی ان کے مال و جائداد کی نگرانی اگر ان کا سرپرست نہ کرتا ہو تو حکومت کی نگرانی میں آجانا چاہیے۔

پھر فقہاء نے حجر کے دائرہ کو وسیع کیا ہے اور قرضخواہ کی استدعا پر مقروض پر بھی حجر عائد کیا جا سکتا ہے، مثلاً مقروض اپنے مال کو قرضخواہوں کی دست برد سے باہر رکھنے کی کوشش کرے تو حاکم عدالت اس کو ایسے تمام انتقالات سے باز رکھنے کے لیے امتناعی حکم جاری کرے گا۔ یہ حکم کسی ایک قرضخواہ کی درخواست پر جاری ہو سکے گا۔ عہد رسالت ﷺ میں حجر کا ایک یہ واقعہ پیش آیا تھا کہ حضرت معاذ ابن جبل رضی اللہ عنہ کی ساری جائداد قرض کے بوجھ کے نیچے دب کر رہ گئی تو ان کے قرضخواہوں نے رسول کریم ﷺ سے یہ استدعا کی کہ ان کی جائداد سے ہمارا قرض ادا کرایا جائے چنانچہ کہا جاتا ہے کہ رسول کریم ﷺ نے حضرت معاذ پر حجر عاید کر کے ان کے مال کو سب قرضخواہوں پر تقسیم فرما دیا[1]۔

قانون حجر کی برخاستگی

جب کوئی یتیم بچہ بالغ ہو جائے تو قانون حجر کی تعمیل اور پابندی کو اس پر سے اٹھا لیا جاتا ہے کہ

وَابْتَلُوا الْيَتَامٰى حَتّٰى إِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ فَإِنْ آنَسْتُمْ مِنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوا إِلَيْهِمْ أَمْوَالَهُمْ

پ ۴ النساء ۴ ع ۱

اور یتیموں کی آزمائش کرو جبکہ وہ نکاح کے سن کو پہنچ جائیں پھر جب تم ان میں حسن تدبر دیکھو تو ان کے مال ان کے حوالے کر دو۔

پھر امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک اگر بچہ بالغ تو ہوا مگر اس کو تصرفات کا سلیقہ نہیں تو اس کو اس کا مال نہیں دیا جائے گا یہاں تک کہ وہ پچیس برس کا ہو جائے پھر جب وہ پچیس برس کا ہو جائے تو اس کا مال اس کو دے دیا جائے گا، اگرچہ اس سے سلیقہ ظاہر نہ ہو اور صاحبین (یعنی امام ابو یوسف رحمہ اللہ اور

---

[1] ۔ تکملہ شرح ہدایہ جلد ۷ صفحہ ۸۸ ۔

امام محمد شیبانیؒ) نے فرمایا کہ اس کو اس کا مال اُس وقت تک نہیں دیا جائے گا جب تک کہ اس سے خوش سلیقگی ظاہر نہ ہو۔[1]

اسی طرح امام اعظم یعنے ابو حنیفہؒ مقروض کے بارے میں بھی اختلافی رائے رکھتے ہیں چنانچہ امام ابو حنیفہؒ نے فرمایا کہ میں قرضہ کے بارے میں مجبور نہیں کروں گا اور جب کسی پر بہت سے قرضوں کا بوجھ ہو جائے اور اس کے قرض خواہ قید اور حجر کرنے کی درخواست کریں تو میں اس پر حجر نہیں کروں گا کیونکہ حجر کرنے سے اس کی اہلیت کو مٹا دینا لازم آئے گا تو ایک خاص ضرر مٹانے کے واسطے ایسا نہیں کیا جائے گا لیکن حاکم عدالت (قاضی) اس مقروض کو اس وقت تک قید رکھے گا جب تک وہ خود اپنی جائداد فروخت کر کے قرض خواہ کا حق ادا نہ کرے اور مقروض کا ظلم دُور نہ ہو۔

"صاحبین نے فرمایا ہے کہ جب مفلس کے قرض خواہ اس پر حجر عاید کرنے کی درخواست کریں تو حاکم عدالت اس کو مجبور کر دے گا اور اس کو فروخت اور ہر قسم کے تصرف و اختیارات سے روک دے گا تاکہ قرضخواہوں کا نقصان نہ ہو کیونکہ ضعیف العقل (سفیہ) پر حجر ہم نے اس واسطے جائز رکھا کہ اس کے حق میں بہتری ہو اور مفلس پر حجر کرنے میں قرض خواہوں کی بہتری ہے کیونکہ مفلس مذکور شاید اپنے مال کو تلجیہ کے طور پر کسی ایسے بڑے آدمی کے ہاتھ فروخت کر دے کہ جس کے قبضے سے نکالنا ممکن نہیں تو قرضخواہ کا حق مٹ جائے گا۔[2]

امام اعظم کی اختلافی رائے

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کوئی آزاد، عاقل، بالغ اپنی دولت کو اللے تللے سے اڑائے — جیسا کہ امیرزادے عام طور پر اُڑاتے ہیں — تو حکومت کو کہاں تک دخل دہی کا حق حاصل ہے، اکثر فقہا تو یہ کہتے ہیں کہ عیش و عشرت اور

---

[1] ہدایہ ج ۳ کتاب الحجر۔ [2] ہدایہ ج ۳ کتاب الحجر

بُرے کاموں میں روپیہ اُڑانا تو اور بات ہے اگر کوئی شخص کسی نیک کام میں بھی مثلاً مسجد کی تعمیر میں اپنی ساری دولت کھپا دے تو حکومت اس میں مداخلت کرے اس پر حجر کا قانون عائد کر دے اور ہر قسم کے مالی تصرفات سے اس کو روک دیا جائے۔ امام اعظم حکومت کی دخل دہی کو ناپسند کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ایک عاقل بالغ شخص کی ولایت چھین لینا گویا اس کو آدمیت کی اونچائی سے گرا کر حیوانات کے زمرہ میں ملا دیتا ہے۔ چنانچہ امام صاحب فرماتے ہیں کہ "آزاد عاقل بالغ کم عقل پر حجر نہ کیا جائے گا، بلکہ اس کا تصرف اپنے مال میں جائز ہے اگرچہ وہ ایسا فضول خرچ ہو کہ اپنا مال ایسے کاموں میں صرف کر دے جس سے اس کی کوئی غرض و مصلحت نہیں ہے"[1] لیکن امام اعظم کے شاگرد رشید امام ابویوسف جو ہارون الرشید کی سلطنت میں قاضی القضاۃ اور وزیر عدلیہ تھے اور دوسرے شاگرد امام محمد شیبانی اور امام اعظمؒ کے شاگرد کے شاگرد امام شافعیؒ امام اعظمؒ سے مختلف رائے رکھتے ہیں چنانچہ "امام ابویوسف و محمد و شافعی کہتے ہیں کہ کم عقل کو مجبور کر دیا جائے اور اپنے مال میں تصرف کرنے سے روک دیا جائے"۔

دلیل: مذکورہ بیان کی تائید میں قاضی ابویوسفؒ محمد شیبانیؒ اور شافعیؒ یہ دلیل پیش کرتے ہیں "چونکہ وہ مال کو سوچ سمجھ کر صرف نہیں کرتا اس واسطے اس کو مجبور کر دیا جائے جیسے چھوٹے بچے کو مجبور کیا جاتا ہے بلکہ بچے سے بڑھ کر مجبور کیا جائے اس لیے کہ بچے کے حق میں اسراف اور فضول خرچی کا گمان ہے اور اس شخص میں فضول خرچی واقعی موجود ہے، اس وجہ سے اس کو مال میں تصرف کرنے سے روک دیا جائے پھر خالی ممانعت مجبور کرنے کے بغیر سود مند نہ ہوگی کیونکہ جس چیز سے اس کا ہاتھ روکا گیا ہے اس کو وہ زبان سے تلف کرے گا اس لیے وہ شخص مجبور کیا جائے"[2]

امام اعظم کی دلیل: امام صاحب کی یہ دلیل ہے کہ "اس کو اتنی عقل ہے کہ

---

[1] ۔ ھدایہ ج ۳ کتاب الحجر۔ [2] ھدایہ ج ۳ کتاب الحجر۔

وہ خداوند تعالیٰ کے خطاب کو سمجھ سکتا ہے یعنی اگر وہ بچے کی طرح ناسمجھ ہوتا تو ایمان و شرائع سے مخاطب نہ ہوتا پس وہ مجبور نہ کیا جائے جیسے درستی کے ساتھ تصرف کرنے والا روکا نہیں جاتا۔ اس لیے کہ اس کی ولایت چھین لینا گویا اس کو آدمیت کی بلندی سے گرا کر جانوروں میں ملا دینا ہے، حالانکہ اس کا ضرر بہ نسبت فضول خرچی کے زیادہ ہے تو تھوڑے سے نقصان کے لیے بڑا نقصان نہیں اٹھایا جائے۔ ہاں اگر مجبور کرنے میں عام ضرر دور ہوتا ہو جیسے ایک جاہل شخص طبیب بن بیٹھے یا کوئی جاہل مفتی بن بیٹھے تو مجبور کر دیا جائے یا ایسا تہی دست جس کے پاس جانور وغیرہ کچھ بھی نہیں وہ کرایہ دینے کا ٹھیکہ دار بن جائے تو ان کو مجبور کر دیا جائے۔ اور ابو حنیفہؒ بھی اس کو جائز قرار دیتے ہیں کیونکہ یہ معمولی ضرر کے ذریعہ سے بھاری نقصان کا دفعیہ ہے اور مال سے روکتے ہیں قیاس صحیح نہیں کیونکہ مجبور کرنے کی سزا اس سے بڑھ کر رہی ہے۔ اور اس کو بچے پر قیاس کرنا صحیح نہیں کیونکہ بچہ اپنے معاملہ میں بہتری کی فکر کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا اور اس شخص کو عقل اور بلوغ کے ساتھ آزادی حاصل ہے لیکن وہ اپنی بدچلنی سے اس کے خلاف راہ چلتا ہے۔ مال کا روک دینا مفید ہے کیونکہ اکثر بیوقوفیاں ہبہ، شرع و صدقات میں ہوتی ہیں اور یہ مال کے قبضہ پر موقوف ہے[1] یعنی جب اس کے قبضہ میں کچھ نہ ہو تو وہ کچھ نہیں کر سکتا۔

Rehan Uddin Siddiqui
28 march
1957.

[1] ہدایہ ج ۳ کتاب الحجر۔

ساتواں باب

مالیات عامہ

خلاصہ :- اسلامی معاشیات کے نقطۂ نظر سے محصول وصول کرنے کا منشا نہ صرف حکومتی اخراجات کی پابجائی ہے بلکہ اس کے مقصد کا پھیلاؤ اور امور پر بھی حاوی ہے، اسلام نے بعض محصولوں کو حکومتی اغراض کے لیے نہیں بلکہ غریبوں، بے روزگاروں، اپاہج اور مقروضوں وغیرہ کی دستگیری کے لیے وصول کرنے کی ہدایت کی ہے۔

پھر اس حقیقت کو آشکار کیا گیا ہے کہ اسلام سے پہلے رعایا محصولوں کے بھاری بوجھ سے دبی ہوئی تھی اسلام نے اس مصیبت سے انھیں نجات دلائی۔

سہولت کی خاطر مالیات عامہ کے باب کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ایک میں سرکاری آمدنی کے مختلف ذرائع سے بحث کی گئی ہے اور دوسرے میں سرکاری مصارف کی تفصیل بتائی گئی ہے۔

پہلے حصہ میں سرکاری آمدنی کے مختلف ذریعوں، بالواسطہ اور بلاواسطہ محصول کو بتایا گیا ہے اور محصول جزیہ اور اس کی اہم خصوصیتوں پر معاشی نقطۂ نظر سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ محصول درآمد کی تفصیل میں بتایا گیا ہے کہ اسلام آزاد تجارت کا حامی ہے کہ بے روک ٹوک ایک ملک کی زائد پیداوار دوسرے ملک کو آتی اور جاتی رہے۔ اسلامی حکومت کی یہ معاشی پالیسی رہی کہ اجنبی ممالک اگر اسلامی مملکت کے

باشندوں سے کچھ چنگی نہ لیں تو اسلامی مملکت بھی اس کے باشندوں سے کوئی محصول نہ لے گی اور محض معاشی اغراض کے لیے یہ محصول عائد کیا جاتا تھا۔

اسلامی معاشرہ میں زکات کی اہمیت واضح کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ زکات کو آمدنیوں کی عدم مساوات کم کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ یہ اسلامی ٹکس آمدنی یعنے انکم پر وصول نہیں کیا جاتا بلکہ سرمایہ پر وصول کیا جاتا ہے اور خوبی میں ان محصولوں سے بڑھ جاتا ہے جو آج ساڑھے تیرہ سو برس بعد انسانیت نے اپنی ترقی یافتہ ضرورتوں کے مدنظر قائم کیے ہیں اور بتایا گیا ہے کہ دنیا نیں سب سے پہلے کیپٹل لیوی یا سرمایہ پر محصول لگانا جیسے یورپ اور امریکہ میں اب تک باقاعدہ رائج نہیں کیا جا سکا یہ اسلامی محاصل کا طغرائے امتیاز ہے جس کے بغیر انسانیت اجتماعی طور پر ترقی نہیں کر سکتی۔

ایک مغربی مصنف مسٹر جافری مارک نے اپنی کتاب "موجودیت پرستی" میں تمام امانتوں پر محصول عائد کرنے کی جو اسکیم پیش کی ہے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ شائد اسے معلوم نہیں کہ آج سے ساڑھے تیرہ سو سال پہلے اسلام نے سود کی ممانعت کے ساتھ فاضل رقموں پر زکات کی شکل میں ۲½ فی صدی کا محصول عاید کیا ہے۔

آخر میں پیغمبر اسلام کے پہلے جانشین حضرت صدیق اکبرؓ نے مانع زکات دولت مندوں کے خلاف جو جنگ کی تھی اس کا پس منظر پیش کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ اس کی اہمیت ابھی تک مورخین نے نہیں سمجھی ہے ورنہ تاریخ معاشرہ انسانی میں وہ ایک نقطۂ انقلاب ہے۔

جدید یا ہنگامی محصولوں (نوائب)، سرکاری قرضوں اور جنگی چندوں کا تذکرہ کرتے ہوئے آدم اسمتھ کے قوانین کی روشنی میں اسلامی محاصل پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ آدم اسمتھ کے مختلف قوانین محصول اندازی کو سامنے رکھ کر اسلامی محاصل کو آزادانہ زاویہ نگاہ سے جانچا جا سکتا ہے۔

پھر اسلامی محاصل کی ان گنت خوبیوں کو پیش کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ خود آدم اسمتھ نے اس کو نظر انداز کر دیا تھا لیکن بعد کے معاشیین مثلاً جرمن معاشیات داں واگنر نے ان کی اہمیت تسلیم کی ہے۔

اس باب کے دوسرے حصہ میں سرکاری مصارف کی وضاحت کی گئی ہے۔ مفاد عامہ کی خاطر مصارف میں احتیاط برتنے کی ضرورت ہے اسی احتیاط کا اقتضا تھا کہ خود قرآن مجید نے سرکاری آمدنیوں کے بعض مصارف کو خود ہی بیان کر دیا ہے۔

بیت المال کی آمدنیوں کی مختلف مدوں کو خاص طور پر منظم کیا گیا تھا اور ہر قسم کی آمدنی کے لیے ایک جداگانہ شعبہ قائم کیا گیا تھا۔ کسی ایک شعبہ کے مصارف بڑھنے کی صورت میں دوسرے شعبہ کی مد سے رقم بطور قرض لے لی جاتی تھی۔

پھر مختلف آمدنیوں کے مصارف کی تشریح کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ جس آن میں بیت المال کی بنا پڑی اسی آن سے غریب اور نادار طبقہ کی احتیاجات کو نظر انداز نہیں کیا گیا۔ اسی ضمن میں اس امر کی صراحت کی گئی ہے کہ انگلستان کا مالیہ ترقی کرتے کرتے آج اس بلند درجہ پر پہنچا ہے کہ اب وہاں موازنہ کی ترتیب کے وقت مختلف سماج سدھار اسکیموں کو پیش نظر رکھا جا رہا ہے۔

زکوٰۃ کے مصارف کے سلسلے میں یہ وضاحت کی گئی ہے کہ مفلسوں کی امداد بھی حکومت کا ایک فرض ہے اور محتاجوں کی اس وقت تک خاطر خواہ مدد نہیں کی جا سکتی جب تک کہ حکومت کی نگرانی میں اس کا باقاعدہ انتظام نہ ہو۔ محتاجوں کی امداد ایک ایسا مسئلہ ہے جو سرکاری انتظام اور حکومت کی کوششوں ہی سے حل ہو سکتا ہے۔

بیت المال سے جو پیدا آور اور غیر پیدا آور قرضے دیے جاتے تھے ان کا تذکرہ کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ اسلامی قلمرو میں سودی قرضوں کا

نام و نشان تک نہ رہا۔ اسلامی معاشیات نے یہ بڑی اچھی اصلاح کی کہ اگر ایک طرف سودی لین دین کی ممانعت کی تو دوسری طرف بیت المال سے قرضہ حسنہ کا انتظام کیا۔ اسی طرح اسلام نے اگر ایک طرف گداگری کا انسداد کیا تو دوسری طرف محتاجوں کی امداد کے لیے زکات کا ادارہ قایم کیا۔

بیت المال کے مختلف مصارف سلسلہ وار بیان کیے گئے ہیں بعد ازآں اسلامی معاشیات میں بیمہ (انشورنس) کا جو بدل بتایا گیا ہے اسے بھی پیش کیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ بیمہ کی ایک غیر سودی شکل "معاقل" عہد نبوی سے رائج ہے۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں اہل دیوان یعنے ایک دفتر کے جملہ لوگ جن کے نام ایک ہی رجسٹر میں درج تھے اغراض معاقل کے لیے ایک ہی وحدت قرار دیے گئے تھے نیز ایک ہی شہر کے جملہ ہم پیشہ لوگ ٹریڈ گلڈ یا ٹریڈ یونین کی طرح ایک سماجی وحدت قرار دیے گئے تھے۔

اسلامی حکومت نے ذمیوں کو نظر انداز نہیں کیا تھا اور سرکاری بیت المال سے ان کی بھی بے دریغ امداد کی جاتی تھی اور ان کا بھی سماجی تحفظ کیا گیا تھا۔ حکومتوں کو چاہیے کہ جس طرح وہ مالداروں سے محصول وصول کرتی ہیں۔ اسی طرح ان کا یہ فرض ہونا چاہیے کہ نادار اور مفلس ہو جانے کی صورت میں سرکاری خزانہ سے ان کی مدد کریں۔

غرض اس طرح اسلامی معیشت کے یہ ساتوں باب ختم ہوئے ہیں مقالہ میں دکھایا گیا ہے کہ اسلامی نظم معیشت واقعی نوع انسانی کے لیے برکت ہے ہمارا معاشی نظام بھوک اور برہنگی کو مکمل طور سے دُور کرنے والا نظام ہے اسلامی اصول معاشیات بذات خود ایک مکمل اور مستقل نظام ہے جو نہ تو سرمایہ داری ہے اور اشتراکیت بلکہ اس میں ان دونوں کی خوبیاں جمع ہو گئی ہیں اور ساتھ ہی دونوں کی برائیوں سے

اس نظام کو محفوظ رکھنے کا انتظام کر دیا گیا ہے۔

رسول کریمؐ اور صحابہ کرامؓ کے معاشی اصلاحات یقیناً مشعل راہ اور روشن مینار کا کام دیں گے۔ لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ۔ (رسول اللہ کی زندگی میں تمھارے لیے ایک بہترین نمونہ ہے)

پہلا حصہ حکومت کی آمدنی

(۱) محصول کی تعریف اور محصول بالواسطہ اور بلاواسطہ

جس طرح ہر شخص کو اپنی گذر بسر کے لیے دولت کی ضرورت ہے اسی طرح حکومت کو بھی ـــــ جو کہ افراد ہی کا مجموعہ ہوتی ہے ـــــ اپنے فرائض کی انجام دہی کے لیے رقم کی ضرورت ہے۔ حکومت مختلف محصولات وغیرہ کے ذریعہ یہ رقم وصول کرتی ہے۔

محصول کی تعریف مختلف معاشئین نے محصول کی مختلف تعریفیں بیان کی ہیں، آئرستان کے ایک مستند مالیات کے ماہر پروفیسر بیسٹیبل نے محصول کی یہ تعریف بیان کی ہے کہ

"محصول سے کسی شخص یا جماعت کی دولت کا وہ حصہ مراد ہے جو سرکاری اغراض کے لیے لازمی طور پر لیا جاتا ہے"[۱]

عصر جدید کے ایک ماہر مالیات پروفیسر ڈالٹن نے محصول کی یہ تعریف کی ہے کہ

"محصول ایک لازمی مطالبہ ہے جو سرکار کی طرف سے عائد کیا جاتا ہے"[۲]

---

[۱] بیسٹیبل: پبلک فینانس حصہ سوم باب ۱ صفحہ ۲۶۱ میکملن کمپنی ۱۹۱۷ء

[۲] ڈالٹن: پرنسپلز آف پبلک فینانس باب ۳ صفحہ ۲۶ گیارھویں اشاعت لندن ۱۹۴۰ء

گو مذکورہ دونوں تعریفیں اپنی جگہ ٹھیک ہیں لیکن محاصل کے مصارف کے سلسلے میں یہ واضح رہے کہ اسلامی نظام کے تحت محصول سرکاری اخراجات کی بجائی ہی کے لیے نہیں لیا جاتا بلکہ بعض محاصل محض غریبوں، بے روزگاروں، اپاہجوں، مسافروں اور مقروضوں کی دستگیری کے لیے بھی وصول کیے جاتے ہیں

محصول بالواسطہ اور بلاواسطہ اسلامی حکومت کی آمدنی کے مختلف ذرائع کا تذکرہ کرنے سے پہلے محصول بالواسطہ اور محصول بلاواسطہ کا تذکرہ ضروری ہے۔ "محصول بلاواسطہ تو اسی شخص کی جانب سے ادا کیا جاتا ہے جس پر قانوناً عائد کیا گیا ہے برخلاف اس کے محصول بالواسطہ ایک شخص پر عائد کیا جاتا ہے مگر جزوی طور پر یا کُل کا کُل دوسرا ادا کرتا ہے"[1]

ماہرین مالیات کا اس بات میں اختلاف ہے کہ آیا ملک کے رہنے والوں پر محاصل بالواسطہ عائد کرنے چاہئیں یا بلاواسطہ؟ ہنری جارج فطر آئین مکتب خیال کا حامی یہ کہتا تھا کہ دنیا میں صرف مالگزاری ہی کا ایک محصول لگانا چاہیے[2]۔ فطر آئینیوں کے ہاں زراعت ہی پیدا آور سمجھی جاتی تھی چونکہ زراعتی پیداوار ضروریات زندگی میں شامل ہے لہٰذا ہر ایک اس کا استعمال کرتا ہے اس طرح بالواسطہ ملک کے ہر باشندہ پر اس کا بار پڑ سکتا ہے اس فطر آئینی نظریہ کے نقص کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دولت مندوں کی دولت کے لحاظ سے بہت کم بار پڑتا ہے اور مفلسوں پر بہت زیادہ، خیر یہ فطر آئینی نظریہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ محصول بالواسطہ میں لوگوں کی آنکھوں میں خاک جھونک کے محصول اس طرح لیا جاتا ہے کہ عوام کو کانوں کان خبر بھی نہیں ہوتی کہ ان پر بھی محصول کا بوجھ پڑ رہا ہے برخلاف اس کے محصول بلاواسطہ میں چونکہ باشندوں سے راست محصول لیا جاتا ہے اس لیے اگر محصول زیادہ لگایا جائے تو ہل چل پڑ جاتی ہے

---

[1] ڈالٹن: پبلک فینانس باب ۵ صفحہ ۲۳۔ [2] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو آرمٹیج اسمتھ: پرنسپلز اینڈ میتھڈ آف ٹیکسیشن ص ۲۴

لیکن اس کی خوبی یہ ہے کہ عام لوگوں کو اپنی حکومت کے امور سے دلچسپی ہو جانے کی وجہ سے ان میں جمہوری خیالات اور مشاورتی نظام کی ترقی ہوتی ہے عام طور سے موجودہ حکومتوں کا ہر ایک وزیر مالیہ اس کوشش میں لگا رہتا ہے کہ بغیر کسی گڑبڑ کے ملک کے باشندوں سے محصول اس طرح وصول کیا جائے کہ عوام کو اس کا احساس تک نہ ہو۔ ایک فرانسیسی وزیر مسمی کول بیر کا یہ مقولہ تھا کہ "ہنس (قاز) کے پر اس طرح نوچو کہ وہ چیخنے چلانے نہ پائے"[1]

غرض محصولوں کی وصولی کے ہر ایک طریقہ میں کچھ خامیاں بھی ہیں اور کچھ خوبیاں بھی۔ ان ہی کے پیش نظر ماہرین مالیات یہ رائے دیتے ہیں کہ دونوں قسم کے ملے جلے محاصل ایک وقت میں لگانے چاہئیں تاکہ ہر ایک کی خوبیاں ان سے پیدا ہونے والی خامیوں کو دور کر دیں۔ اسلامی محاصل کی خوبی یہی ہے ان میں چند محصولات تو بلا واسطہ ہیں مثلاً زکات، جزیہ وغیرہ اور چند بالواسطہ ہیں مثلاً خراج، محصول درآمد وغیرہ۔

(۲) حکومت کے مصارف کا ایک سرسری خاکہ

اسلامی حکومت میں محاصل کی جو غرضیں معین کی گئی ہیں ان کا اندازہ خلیفہ یا صدر حکومت کے فرائض کا ایک سرسری تذکرہ سے ہو سکتا ہے۔

خلیفہ یا صدر جمہوریت کے فرائض

امام ماوردی نے خلیفہ کے حسب ذیل فرائض گنائے ہیں۔

۱۔ "پہلا فرض یہ ہے کہ "وہ دین کی حفاظت کرے......"

۲۔ "جھگڑنے والوں میں شرعی احکام نافذ کرے اور مخاصمتوں کا فیصلہ کرے تاکہ انصاف کا دور دورہ ہو کوئی زبردست، ظلم نہ کرنے پائے اور کوئی کمزور مظلوم نہ بنے"

---

[1] ٹاسگ: پرنسپلز آف اکنامکس ج ۲ باب ۶ صفحہ ۵۰۹ نیز آدم اسمتھ کی مذکورہ بالا کتاب ملاحظہ ہو

۳۔ "ملک کی حفاظت کرے اور دشمن سے اُسے بچائے تاکہ سب لوگ اطمینان سے اپنے معاشی کاروبار میں مصروف ہوں اور جان و مال کے کسی خطرے کے بغیر اطمینان سے سفر کر سکیں۔"

۴۔ "شرعی حدود کو قایم کرے تاکہ جن باتوں کو اللہ نے حرام قرار دیا ہے کوئی ان کا ارتکاب نہ کر سکے نیز اس کے بندوں کے حقوق تلف اور برباد نہ ہوں۔"

۵۔ "سرحدوں کی ایسی پوری حفاظت کی جائے کہ دشمن کو اس میں اچانک دراندازی کا کوئی موقع نہ ملے تاکہ مسلمانوں اور ذمیوں (غیر مسلم رعایا، جن کی حفاظت کی ذمہ داری اسلامی مملکت قبول کرتی ہے) کی جانیں محفوظ رہیں۔"

۶۔ "پہلے اسلام کی دعوت دے نہ ماننے پر اسلام کے مخالفین سے جہاد کرے تاکہ وہ مخالف یا تو اسلام قبول کریں یا ذمی بن جائیں کیونکہ خدا کی جانب سے خلیفہ پر یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اسلام کے لیے دوسرے تمام ادیان پر غلبہ اور فوقیت حاصل کرے۔"

۷۔ "خوف، جبر اور زیادتی کے بغیر شرعی احکام اور فقہی اجتہاد کے مطابق خراج اور صدقات وصول کرے۔"

۸۔ "بیت المال سے مستحقوں کے لیے ایسے وظیفے اور تنخواہیں مقرر کرے کہ نہ اس میں فضول خرچی ہو اور نہ کنجوسی یہ وظیفے اور تنخواہیں مستحقین کو بروقت دیے جائیں۔"

۹۔ "دیانت داروں کو اپنا قایم مقام اور بھروسے کے قابل لوگوں کو حاکم و عامل (گورنر) مقرر کرے اور خزانہ کو بھی ایسے ہی لوگوں کے سپرد کرے تاکہ قابل لوگوں سے انتظام مضبوط ہو اور خزانہ دیانت داروں کے قبضہ میں رہے۔"

۱۰۔ "خود سلطنت کے تمام امور کی نگرانی کرے اور تمام واقعات سے باخبر رہے تاکہ وہ امت کی پاسبانی اور ملت کی حفاظت کر سکے اور عیش و عشرت یا عبادت میں مشغول ہو کر اپنے فرائض دوسروں کے حوالے نہ کردے

کیونکہ ایسی صورت میں دیانت دار بھی خیانت کرنے لگتا ہے اور وفادار اور بہی خواہ کی نیت میں بھی فرق آجاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ

يَا دَاوُدُ إِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ	اے داؤد! ہم نے تمھیں زمین کا خلیفہ بنایا ہے
فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ،	تم لوگوں میں حق و صداقت سے حکومت کرو
وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوَىٰ فَيُضِلَّكَ عَنْ	اور خواہشوں کے پیچھے نہ پڑ جانا ورنہ وہ
سَبِيلِ اللَّهِ ـ	تمھیں اللہ کے راستہ سے بھٹکا دیں گی۔

پ ۲۳ سورۃ ۳۸ ع ۲

"اس آیت شریفہ میں خداوند عالم نے خلافت کی محض تفویض پر اکتفا نہیں کیا بلکہ خود خلیفہ کو امور سلطنت انجام دینے کا حکم دیا ہے نیز نفسیاتی خواہشات کی پیروی میں انھیں بری الذمہ نہیں کیا بلکہ اسے گمراہی سے تعبیر کیا ہے اگرچہ نفسیاتی خواہشات کے پورا کرنے کا دینی احکام اور منصب خلافت کی وجہ سے اسے حق حاصل ہے مگر رعیت کے جو حقوق اس پر واجب الادا ہیں ان کی بنا پر ان باتوں سے اسے بچنا چاہیے۔ رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ تم میں کا ہر شخص راعی ہے اور ہر ایک اپنی رعیت کی فلاح و بہبود کا جواب دہ ہے"[1]

حکومت کے مصارف کا ایک سرسری خاکہ

ابھی اوپر بیان کیا گیا ہے کہ اشخاص کی طرح حکومت کو بھی دولت کی ضرورت ہے اشخاص کے مصارف تو ان کی آمدنی کے لحاظ سے ہوتے ہیں لیکن حکومت اپنے مصارف کے لحاظ سے آمدنی کے ذریعے ڈھونڈتی اور محصول لگاتی ہے ملک کے باشندے جتنے دولت مند اور خوش حال ہونگے اتنا ہی زیادہ محصول وصول ہو گا۔ اسلامی حکومت کفایت شعاری سے مصارف کا پورا لحاظ رکھتی تھی تاکہ محصول سے ملک کے باشندوں پر زیادہ بار نہ پڑے۔

حکومت کو اپنے فرائض کی انجام دہی کے لیے سب سے پہلے ایک بڑی طاقتو

---

[1] ـ ماوردی الاحکام السلطانیہ باب ۱ ص ۱۶ نیز ابویعلی: الاحکام السلطانیہ ص ۱۲

برّی اور بحری فوج اور اس زمانہ میں ہوائیہ کی بھی ضرورت ہے تاکہ ملک کو بیرونی حملوں سے بچا سکے۔ جس طرح مملکت کی بقاء کے لیے ملک کو بیرونی دشمنوں سے بچانا لازمی ہے اسی طرح اندرونِ ملک امن و امان اور انصاف کرنے کے لیے پولیس اور حاکمانِ عدالت کی ضرورت ہوتی ہے۔ حاکمانِ عدالت کو نہ صرف خوں ریزی، چوری، اور جعل سازی کا تصفیہ کرنا ہوتا ہے بلکہ بہت سے معاشی امور مثلاً مقروضوں اور قرض خواہوں کے جھگڑے، راہن اور مرتہن کے تصفیے، مشترکہ سرمایہ دار کمپنیوں اور شراکتوں اور نیز مال و جائداد اور وراثت کے جھگڑے بھی چکانے پڑتے ہیں۔ بیسیوں مالی نزاعی امور کا تصفیہ کرنا پڑتا ہے اسلامی حکومت میں حاکمانِ عدالت کے سپرد یتیموں سفیہوں کے مال اور جائداد کی نگرانی بھی ہوتی تھی نیز تاجروں کو احتکار سے روکنا اور تعمیل نہ کرنے پر سزا دینا بھی حاکم عدالت ہی کے سپرد تھا۔ پھر مجرموں کو سزا دینے کے لیے قید خانے تادیب خانے بھی قایم کرنے پڑتے ہیں غرض اَلاِمَامُ یَعْصِمُ النَّفْسَ وَالْمَالَ[۱] امام (صدرِ مملکت) جان و مال کی حفاظت کرتا ہے۔

ملک کو اندرونی اور بیرونی دشمنوں سے بچانا ہی مملکت کا اصلی مقصد نہیں کیونکہ اس پر تو خود حکومت کے وجود کا انحصار ہے عصرِ حاضر میں حکومت کے وجود کا اصلی مقصد یہ ہے کہ ملک کے باشندوں کی اخلاقی اور روحانی ترقی کے دوش بدوش ان کی مادّی خوش حالی میں بھی اضافہ ہو۔ باشندوں کی تعلیم و تربیت کے لیے تعلیمی اشاعت کی ضرورت ہے۔ اسلام میں تو ہر ایک پر چاہے مرد ہو کہ عورت تعلیم کا حاصل کرنا فرض ہے[۲] پھر صحت اور کارکردگی بڑھانے کے لیے حکومت کو حفظانِ صحت کے مختلف وسیلے جیسے دواخانے، صحت گاہیں، چمن پارک، ڈرینج سسٹم اور صاف پانی کی دستیابی کے لیے آب رسانی اور اسی طرح برقی روشنی اور صفائی کا انتظام کرنا پڑتا ہے۔

---

[۱] ھدایہ ج ۲ کتاب السیر۔
[۲] پیدائش دولت کے باب ۳ میں ص ۲۱۰ پر تفصیل گذر چکی۔

پیدائش دولت کے میدان میں حمل ونقل کے انتظام کے لیے پلوں، سڑکوں، بندرگاہوں، روشنی گھروں، ہوائی اڈوں اور ریلوے اسٹیشنوں کی ضرورت ہے نیز رسل ورسائل کے سلسلہ میں ڈاک، تار، ٹیلیفون اور لاسلکی کا انتظام بھی حکومت کے ذمہ ہے۔ پھر زراعتی ترقی کے لیے آب پاشی کے مختلف ذریعے تالاب، نہریں اور بڑے بڑے بند اور ساگر بنانے پڑتے ہیں۔ تجارت ہی کے سلسلہ میں حمل ونقل کے ذریعوں کی فراہمی کے علاوہ دوسرے ممالک سے تجارتی اور سیاسی تعلقات قائم کرنے پڑتے ہیں اور ان تعلقات کی استواری کے لیے سفیروں اور تجارتی قونصلوں وغیرہ کی ضرورت پیش آتی ہے۔ صنعت و حرفت کے سلسلہ میں حکومت کو آجر اور مزدور کے درمیانی جھگڑے چکانے اور مزدوروں کے حقوق اور صحت وغیرہ کی دیکھ بھال کے لیے لیبر آفیسر مقرر کرنے پڑتے ہیں۔ ان کے علاوہ جنگلات وغیرہ کی حفاظت ہے اور یہ تمام فرائض پیدائش دولت کے میدان میں انجام دینے پڑتے ہیں۔

تقسیم دولت کے شعبہ میں اس زمانہ میں حکومت کی یہ کوشش رہتی ہے کہ مزدور کی ادنیٰ شرح اجرت کا تعین کر دیا جائے تاکہ اس سے کم اجرت نہ ہو اور پیدائش دولت سے اس کو زیادہ سے زیادہ حصہ ملے۔ اسلامی حکومت اس سے بھی آگے غریبوں، بے روزگاروں اور اپاہجوں کے روزگار کی بھی ذمہ داری لیتی تھی۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں تو باقاعدہ یہاں تک تجربے کیے گئے کہ ہر شخص کتنا کھا سکتا ہے اسی کے مطابق آٹا، زیتون وغیرہ دیا جانے لگا۔[۱] اس عطا میں نہ صرف شہری ہی شریک تھے بلکہ اضلاع کے دیہاتی بھی شریک تھے۔ اسی طرح اسلامی حکومت مسافروں کی امداد ان کے قیام کا انتظام اور ان کے مال کی چوکسی کرتی اور مسافر خانے بنواتی تھی۔ اس کے علاوہ مقروضوں کو قرضہ حسنہ دیتی اور انتقال کے بعد نادار مرنے پر مقروضوں کے قرضوں کی بابجائی بھی کرتی نیز یتیموں اور بیواؤں کی امداد کرتی تھی۔

---

[۱] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو کتاب الاموال صفحہ ۳۴۷ نمبر ۶۰۸ باب اجراء الطعام علی الناس من الفئ

اسلامی محصول زکات کا بھی مصرف ہے کہ دولت مالداروں سے لے کر ناداروں کو دی جائے۔

پھر مبادلہ دولت کے سلسلہ میں حکومت کو زر کی اجرائی اور بہترین تکنیک نیز پیمانوں کا بڑا اچھا انتظام کرنا پڑتا ہے۔ اسلامی حکومت نے محتسبوں کے فرائض میں سکہ کی دیکھ بھال، جعل سازی کا انسداد اور پیمانوں کی نگرانی رکھی تھی۔ صناع اور تاجروں کو ان کے کاروبار کے فروغ کے لیے بیت المال سے بلاسودی قرض حسنہ دیا جاتا تھا۔ اسی طرح کاشتکاروں کو بھی تقاوی کی رقم قرض حسنہ کے طور پر دی جاتی تھی۔ ناگہانی اوقات جیسے قحط اور جنگ کے دوران میں حکومت کو غلہ کی فراہمی، راتب بندی اور فروخت پر نگرانی کرنی پڑتی ہے۔

پھر صرف دولت کے میدان عمل میں اسلامی حکومت یتیموں اور سفیہوں کے مال اور جائداد کی نگرانی کرتی اور ان کی دولت کو پیداآور اغراض میں لگاتی تھی۔ نیز اسی صرف دولت کے سلسلہ میں حکومت باشندوں کو مسکرات سے روکتی تھی۔ یہ تو حکومت کے فرائض ہوئے۔

آمدنی حاصل کرنے کے لیے حکومت کو مالگذاری وصول کرنے والوں رائلٹی وصول کرنے والوں، زمین کی پیمایش اور بندوبست کرنے والوں، مردم شماری، بہائم شماری اور زرعی اعداد و شمار فراہم کرنے والوں۔ نیز چنگی محصول وصول کرنے والوں اور اسلامی حکومت کو زکات وصول کرنے والوں کی ضرورت پڑتی ہے اور ساتھ ہی محصول خانوں کی چوکیاں سرحدوں پر قایم کرنی پڑتی ہیں۔ نیز اسلامی مملکت میں نقیب الانساب کے نام سے ایک عہدہ دار ہوتا جو لوگوں کی پیدایش اور موت قلمبند کیا کرتا تھا[1]۔ خود بیت المال کے

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ماوردی الاحکام السلطانیہ باب ۸ صفحہ ۹۱ "کہ نقیب الانساب ہر ایک کی پیدائش و موت قلمبند کرتا رہے تاکہ ہر بچہ کا نسب محفوظ و معلوم رہے کوئی دوسرا شخص میت کے ساتھ اپنا فرضی نسب جتانے کی جرأت نہ کر سکے"۔ نیز ابو یعلی الاحکام السلطانیہ صفحہ ۷۵ میں امیر معاویہ نے حیات و ممات کے اندراج کے لیے باقاعدہ ایک محکمہ بھی قائم کیا تھا۔ مصر کے ہر عرب قبیلے کے لیے ایک ایک انسپکٹر مقرر کیا تھا جو ہر صبح دورہ کر کے مرنے والوں اور پیدا ہونے والوں کو نوٹ کر لیتا اور جب اس کام سے فارغ ہوتا تو دفتر آ کر دیوان میں ان کا اندراج کرتا۔ تفصیل الکتانی: نظام الحکومت النبویہ ج ۱ ص ۲۲۹ بحوالہ مقریزی کی الخطط۔

آمد و خرچ حساب کتاب اور موازنہ کی ترتیب کے لیے ایک خاص محکمہ مالیات کی ضرورت ہے۔

غرض حکومت کے بہت سے فرائض ہیں اور اسی اعتبار سے انتظام و اہتمام کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر انتظام و اہتمام میں کفایت اور خوبی ملحوظ رہے اور کام دیانت داروں کے سپرد ہو تو محاصل کی ضرورت کم پڑتی ہے اگر بد انتظامی کا راج ہو، بد دیانت راج پاٹ پوچھا گئے ہوں اور حکمراں طبقہ عیش و عشرت کا متوالہ ہو تو محصولوں کی زیادتی کا سلسلہ اتنا آگے بڑھتا ہے کہ رعایا چیخ اٹھتی ہے۔ اسلام سے پہلے یہی حال تھا جس کی رُوداد آئندہ فصل سے معلوم ہو گی۔

(۳) اسلام سے پہلے محصولوں کا بھاری بوجھ

اسلام سے پہلے دنیا کے بہت سے حصوں میں بڑی بڑی سلطنتوں کی رعایا اپنے حکمرانوں کی حرص و ہوس کا شکار تھی۔ عرب کے گرد ایرانی اور رومی شہنشاہیتوں کی رعایا بھی محصولوں کے بوجھ سے دبی رہتی تھی مورخین لکھتے ہیں کہ "کاشتکار شہنشاہی دربار اور فوج کے لیے غذا اور پوشاک مہیا کیا کرتے تھے[1] شام اور فلسطین میں ـــــ جو کہ رومی شہنشاہیت کے زیر اقتدار تھے ـــــ "مجموعی طور پر لوگوں کو ان کی آمدنی کا چالیس فی صد بلکہ اس سے بھی زیادہ محصول ادا کرنا پڑتا تھا[2]" اسی شام و فلسطین کے علاقہ میں جو عرب تاجر اپنا سامان تجارت لے جاتے ان پر بھی بڑا بھاری محصول لگایا جاتا تھا۔ مشرقی رومی سلطنت میں آزاد تجارت کا پتا بھی نہ تھا۔ "بیزنطینی حکومت اجنبیوں اور خاص کر بدوؤں کو اور زیادہ شبہہ کی نظر سے

---

[1] - فنلے: ہسٹری آف گریس جلد ۱ صفحہ ۲۸۱ -

[2] - لارڈ اسٹامپ: کرسچیانٹی اینڈ اکنامکس صفحہ ۱۶ میکملن کمپنی ۱۹۳۹ء -

دیکھتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اسے بڑی بڑی قربانیاں دینی پڑتی تھی، انھیں بڑے بھاری محصولات نیز مسلسل محصول درآمد اور چینگی بھی ادا کرنے پڑتے تھے اور بات چیت سے پہلے یرغمال حوالہ کرنے پڑتے تھے[1]

قریشی تاجروں کے ساتھ چونکہ شام وغیرہ میں بڑا برا برتاؤ ہوتا تھا اس لیے جو بیرونی تاجر مکہ آتا تو اس پر بھاری محصول اور بڑی سخت پابندیاں لگائی جاتی تھیں۔ مکہ کو بھی کسی منصفانہ اصول کا احساس نہ تھا۔ اس کے سامنے یہ امر رہتا تھا کہ بیرونی تاجروں سے اس کی تلافی کر لی جائے۔ ان پر مختلف محاصل لگائے جاتے۔ عشر، ملک میں قیام کرنے کا محصول، ادھر ادھر سفر کرنے اور تجارت کرنے کا محصول، مکہ میں داخل ہونے سے پہلے ہی عشر ادا کرنا پڑتا۔ پالمیرا کی طرح یہاں بھی محصول "روانگی" یا برآمد کرنے کا محصول تھا[2]

دریائے نیل کا زرخیز خطہ یعنی مصر بھی رومی شہنشاہیت کے پنجہ میں تھا۔ کسانوں کی پوری آبادی جس کی کہ ملک میں اکثریت تھی موجودہ ہندستانی کاشتکاروں کی طرح غربت اور افلاس کی زندگی بسر کرتی تھی۔ حضرت عمرو بن العاصؓ نے جب مصر فتح کیا تو حضرت عمرؓ کو اپنے ایک خط میں مصری کسانوں کے متعلق یہ لکھا کہ

"ایک مخلوق جس پر خدا کی مہربانی ہے اور جو شہد کی مکھیوں کی طرح دوسروں کے لیے مشقت اور محنت کرتی ہے اپنے گاڑھے پسینے کی کمائی سے کچھ فائدہ نہیں اٹھاتی ہے[3]

مقوقس مصر کا دیسی حکمراں رومی شہنشاہیت کا باج گزار تھا اور ہر سال بڑا بھاری خراج ادا کیا کرتا تھا نیز رومی قبطیوں سے محصول جزیہ (پول ٹکس) بھی

---

[1] ۔ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام ج ۳ صفحہ ۳۸۴ عنوان مکہ ۔
[2] ۔ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام ج ۳ صفحہ ۳۸۴ عنوان مکہ ۔
[3] ۔ موسیو لی بان: تمدن عرب مترجمہ شمس العلماء سید علی بلگرامی مرحوم صفحہ ۲۰۴

لیا کرتے تھے۔" رومی محصول کے گوشوارہ کی بہت سی مدوں میں سے ایک پول ٹکس (محصول جزیہ) بھی تھا۔ شام کی طرح مصر والوں کو بھی بڑے بھاری محصول ادا کرنے پڑتے تھے" بلاشبہ یا تو رومی محاصل مقدار میں زیادہ تھے اوران محاصل کا اثر غیر منصفانہ پڑتا تھا اس وجہ سے کہ خاص خاص لوگوں اور گروہوں کے ساتھ رعایت کی جاتی اور انھیں محصول سے مستثنیٰ کیا جاتا تھا یا ہرقل کو عربوں کی فتح سے پہلے رقم کی سخت ضرورت تھی مسلمان مورخین کے واضح بیان کو غلط ٹھہرانے کی کوئی وجہ نہیں کہ فتح کے بعد محصول کا بوجھ ہلکا ہو گیا تھا۔ انہی بھاری محاصل کی بنا پر قبطیوں نے مسلمان حملہ آوروں کو خوش آمدید کہا اور رومی جو اتار پھینکنے میں مسلمانوں کی مدد کی، ایک انگریز مورخ بٹلر کے الفاظ ہیں۔

"عرب حکمرانی نے مصریوں کو بھاری محصول سے بہت بڑی نجات دلائی ہے"

ہندوستان میں بھی برہمنوں کے راج پاٹ نے اپنی شودر رعایا کو کچل ڈالا تھا۔

"عرب کے قدیم معاشی نظام" میں اوپر تفصیل سے واضح کیا گیا ہے کہ گو قبیلہ کے سردار کی کوئی مستقل آمدنی نہ تھی مگر مال غنیمت کا ایک بڑا حصہ اس کی جیب میں جاتا تھا نیز اس بستی میں لگنے والے میلے یا ہاٹ کا عشر (محصول) بھی اسی کو ملتا تھا۔

(۴) اسلامی حکومت کی آمدنی کے مختلف ذرائع

قرآن مجید میں ذیل کے محاصل کا تذکرہ ہے۔

سلہ۔ بٹلر: دی عرب کانکوسٹ آف ایجپٹ ص [illegible]

سلہ بٹلر: دی عرب کانکوسٹ آف ایجپٹ [illegible] — [illegible] ایضاً ص [illegible]

۱۔ زکات اور صدقات، عشر یا مسلمانوں کی اراضی کا لگان، لگان والی آیتوں سے فقہا نے عشر کے علاوہ معدنی دولت کی رائلٹی کو بھی شریک کیا ہے۔
۲۔ فئی، جزیہ اور مال غنیمت۔ فئی میں غیر مسلموں کی زمین کے لگان یعنے خراج کو بھی شامل کیا گیا ہے۔

محصولات جو رسول کریمؐ یا خلفاء راشدین کے زمانہ میں عائد کئے گئے وہ حسب ذیل ہیں۔

۱۔ رکاز (دفینہ) ۲۔ رائلٹی ۳۔ لگان اجارہ ۴۔ محصول درآمد ۵۔ سمندر سے حاصل شدہ پیداوار (سیف البحر) کا پانچواں حصہ۔ ۶۔ مال لاوارث۔ ۷۔ منافع تکنیک (جو دیگر صغار صحابہ اور تابعین کے زمانہ میں وصول ہونے لگا) نیز ان محصولات کی فہرست میں جنگلات کی آمدنی کو بھی شریک کیا جاسکتا ہے کیونکہ معدنیات کی طرح جنگلات بھی سرکاری ملک قرار دیے گئے تھے۔

فقہاء اسلام نے ان محاصل کو بیان کرنے کے مختلف طریقے اختیار کیے ہیں مثلاً ان کے بیان کرنے کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ انھوں نے محصول کی مقدار کے لحاظ سے مختلف گروپ بنا دیے۔

۱۔ عشر۔ وہ محصولات جن میں دسواں حصہ لیا جاتا ہے مثلاً مسلمانوں کی اراضی کے پیداوار کا حاصل۔ کروڑگیری کا محصول وغیرہ۔
۲۔ خمس۔ وہ محاصل جس میں پانچواں حصہ حکومت وصول کرتی ہے مثلاً مال غنیمت کا پانچواں حصہ، معدنی دولت کا پانچواں حصہ، سمندر کی پیداوار کا پانچواں حصہ وغیرہ۔
۳۔ زکات صدقات اور فئے (جزیہ اور خراج) خراج اور جزیہ کا تعین حکومت کی جانب سے ہوتا تھا، اسی طرح زکات ہے کہ مختلف اشیا میں مختلف ہے۔
۴۔ لاوارث مال۔ تمام مال سرکاری خزانہ میں داخل ہوتا ہے،

ان محاصل کو بیان کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سرکاری آمدنی کی دو مدین

بنائی جائیں ایک مد میں ان محاصل کی آمدنیوں کو رکھا جائے جن کے مصارف کی قرآن میں وضاحت کی گئی ہے اور دوسرے مد میں ان آمدنیوں کو رکھا جائے جن کے مصرف کا تعین خلیفہ یا حکومت وقت کے اختیار تمیزی پر موقوف ہے چنانچہ سرکاری مصارف کے تذکرہ میں ہم نے سرکاری آمدنی کو اسی آخری طریقہ پر بیان کیا ہے۔ اب سرکاری آمدنی کی مختلف مدوں کی وضاحت علیحدہ علیحدہ فصلوں میں کی جائے گی۔

(۵) غنیمت اور فئی

مال غنیمت ایک اتفاقی آمدنی یا لوٹ ہے جو میدان جنگ میں بزور حاصل ہوتی ہے۔ مدینہ میں ہجرت فرمانے کے بعد آنحضرتؐ کو جو مال حاصل ہوا وہ جنگ بدر کا مال غنیمت تھا اس لیے ہم مال غنیمت سے ہی ابتدا کریں گے۔

فقہا نے مال غنیمت کی چار قسمیں قرار دی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں جنگ جیتنے پر یا جنگ کے دوران میں ذیل کی چار قسم کی غنیمتیں فاتحین کے ہاتھ آتی ہیں۔

۱۔ اسری ۲۔ سبی ۳۔ اراضی ۴۔ اموال (مال منقولہ)

۱۔ اسری:۔ اسری سے مراد وہ لڑنے والے مرد کفار ہیں جن کو مسلمان زندہ گرفتار کرلیں[۱]۔ ان جنگی قیدیوں کو قتل کرنا، غلام بنانا، مال لے کر چھوڑنا، مسلمان قیدیوں کے بدلے چھوڑنا یا بغیر فدیہ لیے احسان رکھ کر چھوڑ دینا امام کے اختیار تمیزی پر موقوف ہے۔ وہ قیدیوں کے حالات کی تفتیش کرکے اپنی رائے سے کام لیتا ہے[۲]۔ خود قرآن مجید نے صدر مملکت کو یہ اختیار عطا کیا ہے کہ وہ اپنے اختیار تمیزی سے فدیہ لے کر یا بغیر فدیہ لیے

۱۔ ماوردی: الاحکام السلطانیہ باب ۱۲ ص ۱۲۵ نیز ابویعلیٰ: الاحکام السلطانیہ ص ۱۲۵

۲۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ماوردی: الاحکام السلطانیہ باب ۱۲ ص ۱۲۵ و ۱۲۶

احسان رکھ کر چھوڑ دے کہ

فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَاءً حَتّٰی تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا۔	پھر اس کے بعد احسان رکھ کر (چھوڑ دے) یا فدیہ لے کر یہاں تک کہ لڑائی اپنے ہتھیار ڈال دے۔
پ ۲۶ محمد ۴۷ ع ۱	

رسول کریمؐ نے بدر کے بعض قیدیوں کو فدیہ لے کر چھوڑا بعض کو تبادلے میں دوسرے کے عوض چھوڑا[1] ماسوا اس کے "بدر کے جنگی قیدیوں کا فدیہ مختلف تھا ان میں سے بعض کا فدیہ یہ تھا کہ لڑکوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں[2]"

دیگر دوسرے غزوات میں رسول کریمؐ نے احسان رکھ کر بھی قیدیوں کو چھوڑ دیا۔

جنگی قیدیوں کو اگر غلام بنایا جائے تو وہ بھی مال غنیمت کی طرح تقسیم ہوں گے اگر قیدیوں کی بابت حربی مملکت سے مالی فدیہ وصول ہو تو وہ بھی مال غنیمت ہی سمجھا جائے گا اور شرکاء جنگ پر تقسیم ہوگا اور خمس بیت المال میں داخل کیا جائے گا۔

۲۔ سبی:۔ "سبی سے مراد اسیر عورتیں اور نابالغ بچے ہیں۔ رسول اکرمؐ نے عورتوں اور بچوں کے قتل کی ممانعت فرمائی ہے[3]"

امام ابویعلی کہتے ہیں کہ "عورتوں اور بچوں کا قتل جائز نہیں چاہے اہل کتاب ہوں چاہے نہ ہوں جیسے دہریے یا بت پرست ہے[4] انھیں لونڈی غلام بنا کر مال غنیمت کی طرح تقسیم بھی کیا جا سکتا ہے یا ور فدیہ لے کر چھوڑا بھی جا سکتا ہے ان کا فدیہ بطور مال غنیمت کے ہوگا اور مال غنیمت ہی کی طرح خمس بیت المال کی ملک قرار دیا جائے گا۔

۱۔ ماوردی: الاحکام السلطانیہ باب ۱۲ ص ۱۲۶
۲۔ کتاب الاموال صفحہ ۱۱۶ نمبر ۳۰۹ ما صنع النبی فی اساری بدر۔
۳۔ ماوردی: الاحکام السلطانیہ باب ۱۲ صفحہ ۱۲۸
۴۔ ابویعلی: الاحکام السلطانیہ صفحہ ۱۲۷۔

فقہاء اسلام نے سبی کے تذکرہ میں خاص طور پر اس کی بھی صراحت کر دی ہے کہ "ذمیوں کی آزاد اولاد کا خریدنا اور سبی بنانا دونوں جائز نہیں ہے"[1]

۳۔ **اراضی:** مفتوحہ اراضی کو تقسیم کرنے یا نہ کرنے کا صدر مملکت کو اختیار ہے اگر چاہے تو زمینیں تقسیم کر دے جس طرح کہ رسول کریم ؐ نے خیبر کی زمینوں کو تقسیم فرما دیا تھا اور چاہے تو مصلحت عامہ کو دیکھ کر انہیں تقسیم نہ کرے اور مفتوحہ اراضی کو بیت المال کی ملک قرار دے جس طرح کہ حضرت عمرؓ نے مصر، شام اور عراق کی اراضی کو تقسیم نہ کرکے بیت المال کی ملک قرار دیا تھا۔[2]

۴۔ **اموال:** مال منقول عام غنیمتوں کے حکم میں ہے "غنیمتیں جمع ہو جا نیں تو لڑائی کے ختم ہونے سے پہلے تقسیم نہ کی جائیں تاکہ پوری فتح اور ملکیت کا ہونا معلوم ہو جائے مبادا غازی اس میں مصروف ہو کر شکست اٹھائیں۔ لڑائی فتح ہونے کے بعد آیا فوراً دار الحرب میں یا دار الاسلام میں جا کر تقسیم کر اس کے متعلق امیر لشکر کی رائے معتبر ہے جیسا مناسب ہو عمل میں لائے! امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ دار الحرب میں تقسیم کرنا جائز نہیں دار الاسلام جانے کے بعد تقسیم کرے۔ تقسیم کرنے کے وقت سب سے پہلے مقتولوں کا سلب تقسیم کرے ہر قاتل کو اس کے مقتول کا سلب دے خواہ امام نے اس کی شرط کی ہو یا نہ کی ہو"[3]

"سلب مقتول کے بدن کے لباس، ہتھیاروں اور اس گھوڑے کو کہتے ہیں جس پر وہ سوار ہو۔ لشکر گاہ میں اس کا جو سامان موجود ہو وہ سلب نہیں ہے"[4]

---

[1] ۔ ماوردی: الاحکام السلطانیہ باب ۱۲ صفحہ ۱۴۱
[2] ۔ تقسیم دولت کے باب میں تقسیم اراضی کے تحت کافی تفصیل بیان کی جا چکی ہے۔
[3] ۔ ماوردی: الاحکام السلطانیہ باب ۱۲ صفحہ ۱۴۳
[4] ۔ ماوردی: الاحکام السلطانیہ باب ۱۲ صفحہ ۱۴۴ نیز کتاب الاموال صفحہ ۳۱۱ نمبر ۷۸۵۔

"غنیمت ان لوگوں کے لیے مختص ہے جو جنگ میں شریک ہوں سوار کا حصہ زیادتی مشقت کی وجہ سے زائد رکھا گیا ہے۔ امام ابو حنیفہؒ کہتے ہیں کہ سوار کے دو حصے ہیں اور پیدل کا ایک۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ سوار کے تین حصے اور پیدل کا ایک حصہ ہے[1] اس اختلاف رائے کی وجہ روایتوں کا اختلاف ہے۔

"عبید اللہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ نے خیبر کے دن مال غنیمت سے گھوڑے کے دو حصے دیے اور پیادے کو ایک حصہ دیا۔ عبید اللہ بن عمرؓ (راوی حدیث) کہتے ہیں کہ نافعؒ نے اس کی تفسیر بیان کی اور کہا کہ اگر کسی شخص کے پاس گھوڑا ہوتا تو اسے تین حصے ملتے اگر اس کے پاس گھوڑا نہ ہوتا تو اسے ایک ہی حصہ ملتا ہے[2]"

"سوار کا حصہ گھوڑے سوار (فارس) کو دیا جائے گا۔ خچر، گدھے، اونٹ اور ہاتھی سوار (راکب) کو پیدل کا حصہ دیا جائے گا[3]"

"غنیمت میں تنخواہ دار اور غیر تنخواہ دار (منتطوعۃ یعنی والنٹیر، رضاکار) دونوں موجود ہوں تو دونوں کو مساوی حصے دیے جائیں گے[4]"

"سپاہیوں میں سے اگر کسی نے اس طرح جان توڑ کوشش کی ہو کہ اس کی بہادری اور پیش قدمی کا سکہ بیٹھ گیا ہو تو غنیمت کے اصل حصے کے علاوہ مصالح عامہ کے حصے سے اس کو مناسب انعام (نفل) دیا جائے گا[5]"

آنحضرتؐ اور خلفاء راشدینؓ کے زمانہ میں یہی عمل درآمد رہا۔

مال غنیمت میں سرکاری بیت المال کا حصہ

جاہلی عرب مال غنیمت کو شرکاء جنگ پر تقسیم کرتے تھے لیکن مال غنیمت کا بہت بڑا حصہ قبیلہ کے سردار کو ملتا تھا[6] آنحضرتؐ حکم قرآنی کے بموجب

۱۔ ماوردی الاحکام السلطانیہ باب ۱۲ صفحہ ۱۳۴ ۲۔ بخاری پ ۱۷ کتاب المغازی

۳۔ ماوردی الاحکام السلطانیہ باب ۱۲ صفحہ ۱۳۴۔

۴۔ ماوردی الاحکام السلطانیہ باب ۱۲ صفحہ ۱۳۵ نیز ابو یعلی صفحہ ۱۳۶۔

۵۔ ماوردی الاحکام السلطانیہ باب ۱۲ صفحہ ۱۳۵

۶۔ عرب کا قدیم معاشی نظام باب ۳ صفحہ ۷۷ پر تفصیل بیان کی جا چکی۔

۴/۵ حصہ شرکارِ جنگ میں تقسیم کر دیا کرتے تھے اور ۱/۵ حصہ بیت المال کے لیے محفوظ رکھا کرتے، اس خمس کے جو مصرف ہیں اس کی وضاحت سرکاری مصارف کے ضمن میں آگے کی جائے گی۔ گو کہ خمس ایک اتفاقی آمدنی ہے تاہم پہلی صدی ہجری میں خمس کی کثیر آمدنی سرکاری خزانہ کو حاصل ہو رہی تھی[۱]۔

مالِ فئی

اسلامی مملکت کی آمدنی کا ایک بڑا اور مستقل ذریعہ مالِ فئی بھی تھا جو مال غیر مسلموں سے بدوں قتال اور چڑھائی کے حاصل ہو جیسے مال صلح، جزیہ، ان کی تجارت کا عشر اور جس کے حاصل ہونے کا سبب ان کی طرف سے ہو جیسے مال خراج[۲]۔ تو یہ سب فئی میں شامل ہے۔ فئی اور غنیمت میں ایک فرق یہ ہے کہ "مال فئے بہ رضامندی لیا جاتا ہے اور مال غنیمت زبردستی[۳]"۔ ان مختلف مدات کا تفصیلی تذکرہ آگے فصلوں میں آئے گا۔

---

[۱]۔ یہ تمام دولت مسلمانوں کو تنظیم و اطاعت سے حاصل ہو رہی تھی ورنہ عرب کے اکثر باشندوں کو ہزار سے اوپر کا ہندسہ بھی معلوم نہ تھا۔ "حریم بن اوس بن حارثہ طائی نے رسول اللہؐ سے درخواست کی کہ اگر اللہ تعالیٰ حیرہ فتح کرا دے تو آپ مجھے بنت نفیلہ مرحمت فرما دیں۔ جب خالد نے حیرہ سے مصالحت کا ارادہ کیا تو حریم نے کہا کہ رسول اللہؐ نے بنت نفیلہ مجھے مرحمت فرمائی ہے اس کو صلح سے مستثنیٰ کر دو اور گواہی میں بشیر بن سعد اور محمد بن مسلمہ کو پیش کیا، خالد نے بنت نفیلہ کو مستثنیٰ کر کے حریم کے حوالے کر دیا اور پھر وہ حریم سے ایک ہزار درہم میں خریدی گئی۔ بڑھیا تھی، جوانی کا دور گزر چکا تھا۔ کسی نے حریم سے کہا کمبخت! تو نے سستی دے دی اس کے رشتہ دار تجھے اس سے دوگنا دینا چاہتے تھے۔ حریم نے کہا مجھے یہ خبر نہ تھی کہ دس سو سے اوپر بھی کوئی عدد ہے" (ماوردی: احکام السلطانیہ باب ۱۷ صفحہ ۱۸۲ نیز بلاذری صفحہ ۲۴۴ نیز طبری صفحہ ۲۰۴۷)

اسی طرح ۱۶ھ میں مدائن کی فتح کے دن بعض مسلمان کافور لے کر اپنی دیگچیوں میں ڈال رہے تھے اور یہ سمجھ رہے تھے کہ یہ نمک ہے" تاریخ طبری صفحہ ۲۴۴۵ ۱۶ھ نیز بلاذری فتوح البلدان صفحہ ۲۶۴ نیز دینوری صفحہ ۱۳۴ نیز ابو یوسف کتاب الخراج صفحہ ۱۷)

[۲]۔ ماوردی الاحکام السلطانیہ باب ۱۲ صفحہ ۱۲۱ [۳]۔ ماوردی: احکام السلطانیہ باب ۱۲ صفحہ ۱۲۱

(۶) خراج

اسلام کے آغاز سے قبل مصر، شام، عراق اور ایران وغیرہ کی محکوم رعایا کو دو قسم کے محصول ادا کرنے پڑتے تھے ایک محصول خراج تھا اور دوسرا محصول جزیہ۔ رومی اور ایرانی سلطنت میں ان دونوں محصولوں کا رواج تھا۔

تقسیم دولت کے باب میں خراج سے متعلق کافی وضاحت کی جاچکی یہاں چند اور امور کا تذکرہ کیا جائے گا۔

رسالت مآبؐ کے عہد میں جو اراضی تقسیم نہیں کی جاتی وہ سرکاری ملکیت قرار پاتی اور آپ بذات خود اس کا انتظام فرماتے اور آپ کی ضرورتوں سے جو زائد ہوتا عام مفاد پر صرف ہوتا تھا۔

پھر حضرت عمرؓ کے زمانہ میں مصر، شام، عراق اور ایران وغیرہ کے علاقے فتح ہوئے تو حضرت عمرؓ نے صحابہ کرامؓ سے کئی دن تک مشورہ لینے کے بعد یہ تصفیہ فرمادیا کہ اراضی کو قدیم مالکوں ہی کے قبضہ میں رہنے دیا جائے اور انھیں ان کی زمینوں سے بے دخل نہ کیا جائے اور ان اراضی کے لگان سے نہ صرف فاتحین اور عام مسلمان متمتع ہوں بلکہ ساتھ ہی بعد میں آنے والے مسلمان بھی مستفید ہوں[1] ۔ یہ دراصل پروفیسر ڈالٹن کے الفاظ میں اس کا مصداق ہے کہ "تدبر نہ صرف حال کا بلکہ مستقبل کا بھی امین ہوتا ہے، افراد مرتے ہیں لیکن ملت جس کا افراد خود ایک حصہ ہوتے ہیں باقی رہتی ہے اسی لیے کسی تدبر کو چاہیے کہ مستقبل کے ایک وسیع تر سماجی فائدہ کو آج کے ایک چھوٹے سے فائدہ پر ترجیح دے"[2]

غرض حضرت عمرؓ نے مفتوحہ اراضی کو فلاحِ عامہ کی خاطر تقسیم نہیں کیا اور

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ابویوسف کتاب الخراج صفحہ ۱۲ تا ۱۵ نیز کتاب الاموال وغیرہ۔ اس کی وضاحت تقسیم دولت کے باب میں تقسیم اراضی کے تحت کی جاچکی۔ [2] ڈالٹن: پبلک فینانس ص

I لفظ خراج فارسی زبان کا لفظ ہے۔ عربی زبان کا لفظ طسق اور انگریزی زبان کا لفظ (Task) اور (Tax.) دونوں کا ایک ہی مادہ ہے۔ (وعلی ارضہم الطسق یعنی الخراج۔ تاج العروس صفحہ ۔ نیز صفحہ ۶۸)

زمین کو بیت المال کی ملک قرار دے کر قدیم کاشتکاروں کے ہی قبضہ میں رہنے دیا۔ یہ کاشتکار ایک مقررہ لگان سرکاری خزانہ کو ادا کرنے لگے اور اسلامی قانون کی اصطلاح میں یہ زمینات خراجی زمینات کہلانے لگیں۔

کاشت کاروں پر جو لگان (خراج) عائد کیا گیا تھا اس میں اس بات کا اچھی طرح سے اندازہ کیا گیا تھا کہ دیکھا جائے کہ ان کو جو اراضی دی گئی ہیں معاشی حیثیت سے ان کی کیا قیمت ہو سکتی ہے؟ اور کاشت کار ان اراضی سے کس حد تک فائدہ اٹھا رہے ہیں؟ پھر اسی حساب سے محصول عاید کیا گیا تھا۔ ایک حیثیت سے اگر دیکھا جائے تو خراج کو محصول نہیں کہا جا سکتا بلکہ خراج زمین کو استعمال کرنے کا گویا کرایہ یا معاوضہ تھا چنانچہ فقہا نے خراج کو زمین یا مکان کے کرایہ سے تشبیہ دی ہے کہ جس طرح کرایہ دار مکان دار کو مکان کا کرایہ ادا کرتا ہے اسی طرح کاشت کار سرکار کو خراج ادا کرتا ہے۔[۱]

"حضرت عمرؓ نے عراق کے بعض حصوں پر فی جریب ایک قفیز اور ایک درہم مقرر کیا۔ آپ نے اس میں کسریٰ بن قباذ (شاہ ایران) کی رائے کو اختیار کیا۔"[۲]

اسی طرح آپ نے مصر میں صدیوں کے فرعونی اور رومی قدیم نظام مالگزاری کو باقی رکھتے ہوئے اس میں ضروری اصلاح فرما دی بلکہ ایک حیثیت سے دیکھا جائے تو کسانوں کو زمینوں کا مالک بنا دیا کیونکہ ان کو اس سے بے دخل نہیں کیا جاتا تھا۔ اور بے دخلی کو قانوناً ناجائز قرار دیا گیا تھا۔[۳]

مسلم اور غیر مسلم کو حق شفعہ میں مساوات[۴]

ابھی اوپر بیان کیا گیا کہ کسانوں کی ان کی اراضی سے بے دخلی کو قانوناً ناجائز قرار دیا گیا تھا

یہاں ضمناً حق شفعہ کا تذکرہ بے جا نہ ہوگا کہ اسلامی قانون نے حقوق ہمسایہ کو خاص طور پر تسلیم کیا ہے۔ اگر کوئی شخص اپنی اراضی، کھیت، باغ، فیکٹری، دوکان یا مکان فروخت کرنا چاہے تو فروخت کے وقت ہمسایہ کو ترجیح دی جاتی ہے خواہ ہمسایہ مسلم ہو یا غیر مسلم۔ صاحب ہدایہ لکھتے ہیں کہ

۱ے تفصیل کتاب الاموال صفحہ ۷۳ - ۲ے ماوردی: احکام السلطانیہ باب ۱۳ صفحہ ۱۶۱ ۳ے ملاحظہ ہو ابویوسف کتاب الخراج ۵ ۴ے تفصیل ج ۱ باب ۲ صفحہ ۳۲۳ پر گذر چکی۔

اَلْمُسْلِمُ وَالذِّمِّيُّ فِي الشُّفْعَةِ سَوَاءٌ[1] حق شفعہ میں مسلمان اور ذمی برابر ہیں۔

مقاسمہ

خراج کا پس منظر

"پہلے شاہان فارس کے عہد میں سواد کا محصول (یعنے پیداوار کو تقسیم کرکے) لیا جاتا تھا۔ قباذ بن فیروز (شاہ ایران) نے پیمائش کراکر خراج مقرر کیا۔ پیمائش کرنے سے اس کو پندرہ کروڑ درہم (بوزن مثقال) آمدنی ہوئی، تقسیم (پیداوار) کے طریقے کو چھوڑنے کے متعلق یہ حکایت مشہور ہے کہ ایک روز قباذ بن فیروز شکار کو گیا۔ ایک گھنے باغ پر پہنچا تو اس کے اندر دیکھنے کے لیے ایک ٹیلہ پر چڑھا۔ دیکھتا کیا ہے کہ ایک عورت بارآور کھجور اور انار کے باغ میں کھود رہی ہے اس کے ساتھ اس کا بچہ انار کھانا چاہتا ہے اور ماں منع کرتی ہے۔ یہ دیکھ کر اسے بڑا اچمبا ہوا اور عورت کو بلا بھیجا اور بچہ کو انار لینے سے روکنے کا سبب پوچھا۔ اس نے کہا کہ اس میں بادشاہ کا حق ہے تحصیلدار اب تک وصول کرنے نہیں آیا ہے۔ بادشاہ کا حق نکلنے سے پہلے ہم لیتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ یہ سن کر قباذ کے دل پر بہت اثر ہوا۔ اپنی رعایا پر رحم آیا۔ اور اپنے وزیروں کو پیمائش کا حکم دیا تاکہ آمدنی تو اسی قدر ہو جو بصورت تقسیم حاصل ہوتی تھی اور ساتھ ہی لوگوں کو بوقت ضرورت اپنی ملکیت میں تصرف کا موقع ملے۔ شاہان ایران کے آخر دور تک یہی صورت رہی۔ اسلامی عہد شروع ہوا تو حضرت عمرؓ نے بھی اسی کو نافذ رکھا"[2]

غرض حضرت عمرؓ نے "کسریٰ بن قباذ (شاہ ایران) کی رائے کو اختیار کیا سب سے پہلے اس نے زمینوں کی پیمائش، حدبندی، خراج اور دفاتر قایم کیے تھے اور زمین کے متعلق ایسے تمام امور کا لحاظ کیا جس میں مالک زمین اور کاشت کار دونوں کو نقصان نہ پہنچے"[3]

خراج یا لگان بشکل زر۔

خراج یا لگان بہ شکل زر ادا کرنے کی صورت میں کاشتکار کو اپنی پیداوار میں تصرف کرنے کا حق ہوتا ہے رقم بھی معین ہو جاتی ہے اور سرکار کو بھی اپنے موازنے کے ترتیب دینے کا

---

[1] ہدایہ ج ۴ کتاب الشفعۃ

[2] ماوردی: احکام السلطانیہ باب ۱۳ صفحہ ۱۶۷ [3] ماوردی: احکام السلطانیہ باب ۱۳ صفحہ ۱۴۱

موقع ملتا ہے اس کے سوا بھی لگان بشکل زر لینے میں اور بھی خوبیاں ہیں جنھیں اس سے قبل "تقسیم دولت" کے باب ۴ میں واضح کیا جا چکا۔

حضرت عمرؓ نے تمام مفتوحہ علاقوں میں لگان بشکل زر لینے کے طریقہ کو بحال رکھا۔ عثمان بن حنیفؓ کے مشورہ سے حضرت عمرؓ نے زمین کی حیثیت سے مختلف پیداواروں پر جو مختلف لگان مقرر کیا تھا اس سے پہلے اس کی وضاحت کی جا چکی[1]۔

خراج مقرر کرتے وقت احتیاط سے مختلف امور کی جانچ پڑتال کی جاتی تھی امام ماوردی لکھتے ہیں کہ "خراج مقرر کرنے والے کو اختلاف زمین، اختلاف کاشت اور سیرابی کے اختلاف کا لحاظ رکھنا ضروری ہے تاکہ زمین کی حیثیت کے موافق کاشتکار اور اہل فئی کے معاملہ میں عدل و انصاف کر سکے کسی فریق کا نقصان نہ ہو۔

بعض (فقہاء) ایک چوتھی شرط لگاتے ہیں وہ یہ کہ شہروں اور بازاروں سے قرب و بعد کا لحاظ رکھے کیونکہ یہ قیمتوں کی کمی زیادتی میں موثر ہے مگر یہ شرط اس صورت میں قابل اعتبار ہے جبکہ خراج میں روپیہ لیا جائے اگر غلہ لیا جائے تو یہ غیر معتبر ہے"[2]

"ہر علاقہ کا مختلف خراج مقرر کرنا جائز ہے زمین کی انتہائی حیثیت و وسعت پر خراج نہ لگانا چاہیے۔ اس قدر نرمی کی جانی چاہیے کہ اس کی وجہ سے کاشتکار مختلف حادثوں اور آفتوں کی کمی پوری کر سکیں کہتے ہیں کہ حجاج نے عبدالملک بن مروان سے محصولات بڑھانے کی اجازت چاہی۔ عبدالملک نے اسے منظور نہیں کیا اور جواب میں لکھا کہ جو درہم تم کو ملے اسی پر اکتفا کرو اور جو نہ ملے اس کی حرص نہ کرو کاشتکاروں کے لیے بھی کچھ چھوڑ دیا جائے تاکہ اس سے وہ راحت کی زندگی بسر کریں"[3]

---

[1] ۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تقسیم دولت باب ۴ زرعی نظام ص ۳۴۱

[2] ۔ ماوردی الاحکام السلطانیہ باب ۱۳ صفحہ ۱۴۴ ۔

[3] ۔ ماوردی الاحکام السلطانیہ باب ۱۳ صفحہ ۱۴۴ ۔

خود حضرت عمرؓ بھی اسی پر زور دیتے تھے کہ کاشتکاروں پر خراج کا بار زیادہ نہ پڑے اور مرتے دم تک آپ کو اسی بات کا خیال رہا چنانچہ عثمان بن حنیف اور حذیفہ بن یمانؓ سے اپنی شہادت کے چند روز قبل جو بیان لیا تھا اور جو ہدایت دی تھی اس کا تذکرہ باب ۷ میں لگان کے تحت ہو چکا۔

"عبدالرحمٰن بن جعفر بن سلیمان لکھتے ہیں کہ اس علاقہ سواد کا پورا محصول دونوں کے حق میں ایک ارب ہے اگر رعایا کا مال کم ہو تو سرکار کا بڑھ جائیگا اور سرکار کا کم ہو تو رعایا کی آمدنی میں اضافہ ہوگا محصول کا یہ طریقہ مدتوں جاری رہا"

"پھر منصور خلیفہ عباسی کے عہد میں جب غلوں کا نرخ گھٹ گیا۔ سواد تباہ ہوا اور محصول پورا وصول نہ ہوتا تھا تو اس نے اس کو چھوڑ کر تقسیم پیداوار کا طریقہ پھر جاری کر دیا"[1]

"اور یہ ہم نے سواد کے خراج کی وہ کیفیت بیان کی ہے جو وہاں ہوتی رہی لیکن اصل حکم یہی ہے کہ وہی خراج (لگان بشکل زر) لیا جائے جو پہلے مقرر ہو چکا ہے تقسیم پیداوار کا طریقہ مقتضائے وقت اور اجتہاد آئمہ سے جاری ہوا ہے لہذا جب تک اس کی ضرورت باقی رہے اس وقت تک اس پر عمل کیا جائے۔ اور جب ضرورت نہ رہے تو پھر اسی سابق اور اصل حکم پر عمل ہونا چاہیے کیونکہ امام کو سابق اجتہاد کے نقض کا حق نہیں ہے"[2]

خراج کی معافی اور کمی

صدر مملکت یا اس کے نائب کو خاص وجوہ یا خدمات کے صلہ میں خراج کی معافی یا کمی کرنے کا حق حاصل ہے۔ "خالد بن الولیدؓ نے دبہ خالد کے ساکنوں سے ان کے خراج میں کمی کرنے کا وعدہ کیا تھا کیونکہ انھوں نے ان کو وہ سیڑھی لا کر دی تھی جس پر وہ چڑھے تھے اور ابو عبیدہؓ نے یہ شرط نافذ کر دی"[3]

زراعت پر کچھ آفت آجائے تو کاشت کار سے لگان نہیں لیا جاتا تھا

۱۔ ماوردی: الاحکام السلطانیہ باب ۱۳ صفحہ ۱۶۸ ۲۔ ماوردی: الاحکام السلطانیہ باب ۱۳ صفحہ ۱۶۸

۳۔ بلاذری: فتوح البلدان صفحہ ۱۲۹ ۔

چنانچہ "امام مالکؒ، امام ابوحنیفہؒ، سفیان ثوریؒ اور امام اوزاعیؒ کہتے ہیں کہ اگر زمین پر آفت آجائے یا وہ غرق ہو جائے تو اس کے مالک سے خراج ساقط ہو جائے گا۔[1]"

اسی طرح امام ماوردیؒ لکھتے ہیں کہ "زمین شق ہونے یا نہر کے بے کار ہو جانے سے زراعت میں نقصان آئے تو اگر اس کی اصلاح و درستی ممکن ہو تو امام پر واجب ہے کہ مصالح کی مد سے روپیہ صرف کر کے اصلاح ہونے تک خراج کی معافی کا اعلان کرے اور اگر نہ اصلاح ہو سکے اور نہ زمین کسی اور کام آسکے تو خراج بالکل نہ لیا جائے۔[2]"

خراج کی آمدنی کا اندازہ

پہلی صدی ہجری میں سرکاری خزانہ کو کروڑوں درہموں اور لاکھوں دیناروں کی آمدنی ہوتی رہی، مختلف مورخین نے مختلف صوبوں کی مختلف مالگذاری کی رقم بتائی ہے اس اختلاف کی وجہ ظاہر ہے کہ کسی نے کسی سال کا اندازہ بتایا ہے تو کسی نے کسی اور سال کا۔

ذیل میں چند بیانات درج کیے جاتے ہیں تاکہ مالگذاری کی رقم کا ایک سرسری سا اندازہ ہو جائے۔

عراق کا خراج

مورخ یعقوبی کا بیان ہے کہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں بندوبست کے دوسرے ہی سال خراج کی مقدار آٹھ کروڑ سے دس کروڑ بیس ہزار درہم تک پہنچ گئی۔[3] امام ماوردی لکھتے ہیں کہ "حضرت عمرؓ کے زمانہ میں سواد کا محصول بارہ کروڑ درہم تھا۔ عبید اللہ بن زیاد کے جبر و ظلم سے تیرہ کروڑ پچاس لاکھ درہم تک پہنچا، حجاج کی تباہ کاریوں پر بھی محصول گیارہ کروڑ اسی لاکھ رہا اور حضرت عمر بن عبد العزیز کی رعایا پروری اور عدل و انصاف سے

---

[1] بلاذری: فتوح البلدان صفحہ ۴۴۷ خراجی زمینوں کے احکام

[2] ماوردی: احکام السلطانیہ باب ۱۳ صفحہ ۱۴۴

[3] تاریخ یعقوبی ج ۲ صفحہ ۱۷۴

بارہ کروڑ درہم محصول وصول ہوا۔[1]

واقدی کا بیان ہے کہ "عمر بن عبدالعزیزؒ نے کہا کہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں سواد کا خراج دس کروڑ درہم تھا لیکن حجاج کے زمانہ میں صرف چار کروڑ درہم رہ گیا۔"[2] "عمر بن عبدالعزیزؒ فرمایا کرتے تھے کہ حجاج پر خدا کی لعنت ہو کمبخت کو نہ دین کی لیاقت تھی نہ دنیا کی۔ حضرت عمرؓ نے عراق کی مالگذاری دس کروڑ ۲۸ لاکھ درہم وصول فرمائی۔ زیاد نے دس کروڑ ۵ لاکھ اور حجاج نے باوجود جبر و ظلم کے صرف دو کروڑ ۴۰ لاکھ وصول کیے۔"[3]

بعد کے زمانہ میں "ابن ہبیرہ فوجی مصارف کے علاوہ دس کروڑ، اور یوسف بن عمر چھ کروڑ سے سات کروڑ درہم تک سالانہ وصول کرتے تھے۔"[4]

مصر کا خراج

عراق میں معیار سیم کا رواج تھا اس لیے وہاں کا خراج اور جزیہ وغیرہ چاندی کے سکوں (درہموں) میں وصول ہوتا لیکن مصر میں معیار طلاء رائج تھا اس لیے وہاں سونے کے سکوں (دیناروں) میں خراج اور جزیہ وغیرہ وصول کیا جاتا تھا۔

"عمرو بن العاصؓ کے زمانہ میں مصر کا خراج اور جزیہ بیس لاکھ دینار اور عبداللہ بن سعد بن ابی سرحؓ کے عہد میں چالیس لاکھ دینار وصول ہونے لگا۔ حضرت عثمانؓ نے عمرو بن العاصؓ سے کہا کہ تمہارے بعد مصر کی اونٹنیاں زیادہ دودھ دینے لگیں۔ عمرو بن العاصؓ نے کہا اس لیے کہ تم نے ان کے بچوں کو سوکھا لگا دیا۔"[5]

شام و فلسطین کا خراج

شام و فلسطین میں بھی معیار طلاء کا رواج تھا۔ سرسری اندازہ کے لیے ۱۸ھ کی مالگذاری کا اندازہ یہاں

---

[1] ماوردی: الاحکام السلطانیہ باب ۱۳ صفحہ ۱۶۷ نیز ابویعلی صفحہ ۱۶۹۔

[2] بلاذری: فتوح البلدان صفحہ ۲۷۱ جلولاء کی جنگ۔ [3] یاقوت: معجم البلدان ذکر سواد ج ۵ صفحہ ۱۸۶

[4] ماوردی: الاحکام السلطانیہ باب ۱۳ ص ۱۶۷ نیز ابویعلی صفحہ ۱۶۹

[5] بلاذری: فتوح البلدان صفحہ ۲۱۶ مصر نیز ابن عبدالحکم: فتوح مصر ص ۔۔ نیز مقریزی ج ۱ صفحہ ۱۵۹۔

درج کیا جاتا ہے مذکورہ سنہ میں خلیفہ عبدالملک نے سلیمان بن سعد کو رومی زبان سے عربی میں دیوان منتقل کرنے کا حکم دیا تھا۔ سلیمان بن سعد نے اردن کا سال بھر کا خراج مانگا۔ راوی کا بیان ہے کہ اردن کا خراج جو اس کام کے لیے بطور امداد کے دیا گیا ایک لاکھ اسی ہزار دینار تھا۔ دمشق کا خراج چار لاکھ دینار تھا اور حمص اور قنسرین اور اس علاقہ کا جو آج کل (زمانہ مورخ بلاذری) العواصم کہلاتا ہے آٹھ لاکھ اور بقول بعض سات لاکھ دینار تھا۔[1]

خراج کے بجائے عشر

جیسا کہ اوپر بیان ہوا عراق اور مصر وغیرہ کی مفتوحہ اراضی کو بیت المال کی ملک قرار دیا گیا تھا اور کاشت کار خراج ادا کرتے تھے لیکن جو اراضی کہ بیت المال کی ملک نہیں قرار پائی تھی وہاں کے مسلمان باشندے اپنی زراعتی پیداوار کا عشر ادا کرتے تھے۔ عراق اور مصر وغیرہ کے باشندوں کی اکثریت ایک ہی صدی کے اندر اسلام کی حلقہ بگوش ہو گئی اور اس وقت کے حکمرانوں کے دباؤ کے باوجود وہ اپنے بھائی عرب مسلمانوں کی طرح اپنی زراعتی پیداوار کا حاصل زکات لیے عشر کی شکل میں ادا کرنے لگے اور خراج دینا چھوڑ دیا اور اس طرح ان صوبوں کی قانونی حیثیت رفتہ رفتہ فئی کی نہ رہی۔ یہ تمام تفصیلیں اسلامی تاریخوں میں محفوظ ہیں۔

مکانوں اور دکانوں کا محصول

کاشت کار اگر "خراجی زمین پر مکانات یا دکانیں بنوائے تب بھی خراج کی ادائی واجب ہے کیونکہ اس کو ہر طرح منفعت حاصل کرنے کا حق ہے اور امام ابو حنیفہ رح خراج ساقط کر دیتے ہیں" امام ماوردی فرماتے ہیں کہ "میرا خیال یہ ہے کہ کاشتکار کو رہنے کے لیے مکان کی ضرورت ہوتی ہے اس کے بغیر چارہ نہیں اس لیے جتنی زمین پر رہنے کی ضرورت کے لیے بنوائے اس کا خراج معاف اور ضرورت سے زائد کا خراج معاف نہیں۔"[2]

---

[1] بلاذری: فتوح البلدان صفحہ ۱۹۳ رومی سے عربی زبان میں دیوان کی منتقلی۔

[2] ماوردی: الاحکام السلطانیہ باب ۱۳ صفحہ ۱۴۵

"امام ابو حنیفہؒ اور سفیان ثوری کہتے ہیں کہ اگر خراجی زمین پر کسی مسلم یا ذمی نے دکانیں وغیرہ بنائی ہوں تو اس سے کچھ نہ لیا جائے اگر اس نے باغ لگایا تو اس پر خراج مقرر کیا جائے لیکن امام مالکؒ اور ابن ابی ذئب کہتے ہیں کہ بہر صورت اس پر خراج مقرر کیا جائے کیونکہ اس کو جیسا نفع کاشت سے ہوگا ویسے ہی نفع دکانوں وغیرہ سے بھی ہوگا۔ رہی عشری زمین تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اس میں کیا کیا جائے"[1] تو گویا عشری زمین پر اگر مکانات دکانیں بنوائی جائیں تو ان پر بھی محصول لگانا یا نہ لگانا امام کی اختیار تمیزی پر موقوف ہے۔

(۷) محصولِ جزیہ

فئی کی ایک قسم محصول جزیہ بھی ہے۔ محصول جزیہ غیر مسلم حلقوں میں سخت تنقید کا موضوع بنا رہا ہے۔ یہاں بے محل نہ ہوگا اگر محصول جزیہ پر صرف معاشی نقطہ نظر سے بحث کی جائے۔

"لفظ جزیہ جزا (بدلہ، معاوضہ) سے مشتق ہے"[2] اور یہ "امن دینے کی جزا ہے"[3]

قرآن مجید میں بھی محصول جزیہ کا اس طرح تذکرہ ہے کہ

حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ۔ — یہاں تک کہ وہ نیاز مند بن کر اپنے ہاتھ سے جزیہ ادا کریں[4]

پ۱۰ التوبہ ۹ ع۴

---

[1] بلاذری: فتوح البلدان صفحہ ۴۲۸ خراجی زمینوں کے احکام۔

[2،3] ماوردی: الاحکام السلطانیہ باب ۱۳ ص ۱۳۶ نیز ابو یعلی: الاحکام السلطانیہ ص ۱۳۷

[4] یا اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں سے محصول چونکہ زیادہ وصول کیا جاتا تھا اس لیے وہ محصول ادا کرنے والوں میں بڑے شمار ہوئے اور غیر مسلموں سے کم اس لیے وہ چھوٹے ہوئے۔

"حاکم ہر اہل کتاب پر جو ہماری حفاظت میں داخل ہو جزیہ مقرر کرے تاکہ اس کی وجہ سے وہ دارالاسلام میں رہ سکیں۔ جزیہ ادا کرنے سے ان کو دو حق حاصل ہوتے ہیں، ایک یہ کہ ان سے جنگ نہ کی جائے۔ دوسرا یہ کہ ان کی حمایت کی جائے تاکہ امن و امان اور حفاظت کی زندگی بسر کریں۔ نافع ابن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول کریمؐ نے آخری وصیت یہ فرمائی کہ

اِحْفَظُونِی فِی ذِمَّتِی[1]" ۔ جو لوگ میرے ذمے ہیں۔ ان کی حفاظت کرو

حضرت عمرؓ نے بھی اس وقت جبکہ آپ کی زندگی کے آخری سانس باقی رہ گئے تھے آپ نے کہا کہ جو شخص میرے بعد خلیفہ ہو میں اس کو اللہ کے ذمے اور اس کے رسول کے ذمے کی وصیت کرتا ہوں کہ ان لوگوں سے عہد پورا کیا جائے اور ان کی مدافعت اور حفاظت کے لیے جنگ کی جائے اور ان کی طاقت سے باہر ان سے کام نہ لیا جائے[2]"

ایرانی اور رومی سلطنت میں جزیہ

جزیہ کا محصول کچھ نیا محصول نہیں تھا۔ اسلامی مملکت کے قیام سے قبل بھی رومی اور ایرانی سلطنتوں میں جزیہ کا رواج تھا۔" ساسانی اور بیزنطینی سرزمین پہ جزیہ کا محصول پایا جاتا تھا[3]" نیز "جزیہ سے متعلق ہم جانتے ہیں کہ ایران کی ساسانی حکومت میں بھی اس کا وجود تھا[4]" مورخ ابن اثیر کا بیان ہے کہ کسریٰ انوشیروان نے "عظمائے سلطنت اور اہل بیوتات (ذی قدر والوں) اور ہربد (مذہبی لوگوں) اور وزرائے لشکر اور ان لوگوں کو جو بادشاہ کی خدمت میں تھے چھوڑ کر

۱۔ ماوردی: الاحکام السلطانیہ باب ۱۳ صفحہ ۱۳۷۔

۲۔ بخاری پ ۱۲ کتاب الجہاد باب: ذمی کافروں کی طرف سے جنگ کی جائے اور وہ غلام نہ بنائے جائیں، نیز بخاری پ ۱۴ فضائل عثمانؓ۔

۳۔ فان کریمر: اورینٹ انڈر دی کیلیفس صفحہ ۶۷ انگریزی ترجمہ نیز براؤن: لٹریری ہسٹری آف پرشیا صفحہ ۲۰۱ تا ۲۰۲۔

۴۔ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام ج ۱ صفحہ ۱۰۵۱ عنوان جزیہ۔

باقی سب لوگوں پر علیٰ قدر مراتب جزیہ لگایا کسی پر بارہ درہم کسی پر آٹھ درہم کسی پر چھ اور کسی پر چار درہم مقرر کیے۔ لیکن حضرت عمرؓ نے اس میں یہ ترمیم کی تھی کہ بیس سال کی عمر سے کم اور پچاس سال کی عمر سے زاید کے آدمی سے نہیں لیتے تھے[1]

اس نوبت پر اس کا تذکرہ باعث دلچسپی ہوگا کہ قرآن مجید میں محصول وصول کرنے کا سب سے قدیم تذکرہ ذوالقرنین بادشاہ کے تذکرہ میں ملتا ہے ذوالقرنین بادشاہ ملک فتح کرتا ہوا ایک طرف "ننگوں کی بستی" تک جا پہنچا جو نہ لباس پہننا جانتی تھی اور نہ مکان بنانا اسے معلوم تھا۔ پھر دوسری طرف ملک گیری کرتا ہوا وہ ایک ایسی قوم میں پہنچ گیا جو گفتگو تک برابر نہ سمجھتی تھی اور یاجوج، ماجوج نے انھیں پریشان کر رکھا تھا۔ اس قوم نے اپنی حفاظت کے لیے ذوالقرنین کو خراج کا پیش کش کیا لیکن اس نے کہا کہ بجائے رقمی خراج کے مجھے دو پہاڑیوں کے درمیان فصیل اور مورچہ بندی کے لیے لیبر (مزدوروں) سے امداد دی جائے۔

قَالُوْا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ اِنَّ يَاْجُوْجَ وَمَاْجُوْجَ مُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ۔ فَهَلْ نَجْعَلُ لَكَ خَرْجًا عَلٰٓى اَنْ تَجْعَلَ بَيْنَنَا وَبَيْنَهُمْ سَدًّا۔

انھوں نے کہا اے ذوالقرنین بے شک یاجوج ماجوج زمین پر فساد مچایا کرتے ہیں۔ کیا ہم تمھارے لیے خراج مہیا کریں تاکہ تم ہمارے اور ان کے درمیان ایک دیوار ایسی بنا دو کہ وہ ہم تک نہ آ سکیں۔

قَالَ مَا مَكَّنِّيْ فِيْهِ رَبِّيْ خَيْرٌ فَاَعِيْنُوْنِيْ بِقُوَّةٍ اَجْعَلْ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ رَدْمًا

پ۱۶ الکہف ۱۱ع

اس نے کہا میرے رب نے جو مال عطا کیا ہے وہ تمھارے خراج سے بہتر ہے مجھے قوت سے مدد دو تاکہ میں تمھارے اور ان کے درمیان ایک دیوار بنا دوں۔

---

[1] تاریخ کامل ابن اثیر کسریٰ کا خراج اور لشکر ج ا ص ۱۶۱

جزیہ کی معاشی نوعیت

محصول جزیہ ادا کرنے پر اسلامی مملکت کی حدود میں غیر مسلموں کی جان و مال اور ان کے مذہب اور شریعت کی حفاظت کی ذمہ داری اسلامی مملکت اپنے سر لیتی تھی۔ حکومت ملک کا سب سے بڑا اور منظم ادارہ ہوتا ہے اور اس کو رقم کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے ظاہر ہے کہ جب غیر مسلموں کی جان و مال عزت و آبرو کی حفاظت کی جاتی اور اندرونی امن دینے کے علاوہ بیرونی دشمنوں سے بھی بچایا جاتا اور غیر مسلم غریبوں، اپاہجوں، مسکینوں اور غیر مسلم یتیموں کا سماجی تحفظ بھی کیا گیا تھا تو آخر ان سب مصارف کے لیے رقم کہاں سے آتی! اگر فطرائیٹی منری جارج کے تصور کے مطابق اسلامی حکومت بھی صرف غیر مسلم کاشتکاروں پر محصول کا بار ڈالتی تو واقعی ان کے ساتھ یہ بڑی ناانصافی ہوتی۔ ضرورت تھی کہ کاشتکاروں کے علاوہ غیر مسلم صناعوں کاریگروں، غیر مسلم تاجروں اور دوسرے غیر مسلم مالداروں پر بھی مسلمانوں کی طرح محصول کا بوجھ ڈالا جائے چنانچہ اسلامی مملکت کا یہی دستور تھا کہ اگر مسلمان کسانوں سے ان کی پیداوار کا عشر لیا جاتا تو ساتھ ہی دوسرے دولت مند مسلمانوں سے زکات کی شکل میں رقم لی جاتی تھی۔ اگر زکات ہی کے نام سے غیر مسلموں سے بھی محصول لیا جاتا تو اس صورت میں بھی غیر مسلم حلقوں سے شور بلند ہوتا اور جزیہ سے کچھ زیادہ ہی شور بلند ہوتا کہ غیر مسلموں سے زکات لیکر مسلمان بنا دیا جا رہا ہے۔ اس کے سوا بھی غیر مسلم تاجر، غیر مسلم صناع وغیرہ جزیہ ادا کرنے پر فوجی خدمت کی انجام دہی سے بری ہو جاتے تھے اور جنگ کے زمانے میں بھی اسلامی مملکت کی حدود میں امن و امان سے تجارت، زراعت، صنعت و حرفت اور دوسرے کاروبار میں لگے رہتے تھے لیکن جنگ کا اعلان ہوتے ہی مسلمانوں پر جنگ کی شرکت مذہبی فریضہ کی شکل میں لازم ہو جاتی اور اب یہ حکومت یا امام کے اختیار تمیزی کی بات تھی کہ ضرورت ہو تو ہر جنگ کے قابل مسلمان کو طلب کر لے یا چاہے تو ضرورت کے لحاظ سے ان کو جمع کر لے، پہلی صورت میں یعنی جب حکومت کی طرف سے عام مطالبہ ہو تو جہاد کے فریضہ سے بچنا

اسلامی نکتہ نظر سے بہت بڑا مذہبی گناہ ہے۔ مسلمان لازمی طور پر فوجی خدمت نہ صرف رسول کریمؐ اور تمام خلفائے راشدینؓ کے دور میں انجام دیتے رہے بلکہ بعد کے زمانہ میں بھی یہی عمل درآمد رہا، ؎ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اپنے عاملوں کو لکھ بھیجا کہ ہر ایک کو پندرہ برس کا ہوتے ہی فوج میں بھرتی کرلیں۔

رسول کریمؐ کا حفاظت کی ذمہ داری میں وسعت دینا

قرآن مجید سے تو صرف اہل کتاب کی حفاظت کی ذمہ داری ثابت ہوتی ہے

... وَلَا يَدِينُونَ دِينَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ حَتَّىٰ يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَن يَدٍ وَهُمْ صَاغِرُونَ۔

پ۱۰ التوبہ ۹ ع۴

اور جو اہل کتاب دین حق نہیں قبول کرتے (ان سے لڑو) یہاں تک کہ وہ اپنے ہاتھ سے نیازمند بن کر جزیہ ادا کریں

؎ اہل کتاب سے مراد یہودی اور نصرانی ہیں، ان کی کتاب توریت اور انجیل ہے۔ لیکن رحمت للعالمینؐ نے قرآن پاک کے شارح کی حیثیت سے حفاظت کی ذمہ داری لینے میں ایسی وسعت پیدا کی کہ آپ نے ھجر، بحرین کے مجوسیوں (آتش پرستوں) کا بھی جزیہ قبول فرمالیا اور ان کی جان و مال عزت و آبرو اور ان کے آتش کدوں کی بھی حفاظت کی جانے لگی۔

حضرت عمرؓ کا عمل

اپنی خلافت کی ابتدا میں ؎ حضرت عمرؓ مجوسیوں سے جزیہ نہیں لیتے تھے یہاں تک کہ حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ نے اس امر کی شہادت دی کہ رسول اللہؐ نے ھجر کے مجوسیوں سے جزیہ لیا تھا۔؎ مورخ بلاذری نے اس واقعہ کو ذرا تفصیل سے بیان کیا ہے چنانچہ

؎۱ بخاری پ۱۰ کتاب الشہادت۔

؎۲ ۔ ماوردی: الاحکام السلطانیہ باب ۱۳ صفحہ ۱۳۷ نیز ابویعلی صفحہ ۱۳۸ نیز تفسیر طبری ج ۱۰ آیت: مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ حَتَّىٰ يُعْطُوا الْجِزْيَةَ۔

؎۳ بخاری پ۱۲ کتاب الجہاد نیز مسلم، ترمذی ابواب السیر ج ۷ صفحہ ۸۵۔

لکھتے ہیں کہ "مسجد نبوی میں مہاجرین کی ایک مجلس تھی جس میں حضرت عمرؓ ان کے ساتھ بیٹھ کر دنیا بھر کے معاملات پر جو ان کے پاس فیصلے کے لیے آتے تھے گفتگو کیا کرتے تھے۔ ایک دن انھوں نے کہا کہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ مجوسیوں کے ساتھ کیا کیا جائے (اور وہ اہل کتاب بھی نہیں ہیں)؟ عبدالرحمٰن بن عوفؓ اُٹھے اور انھوں نے کہا کہ میں اس بات کی شہادت دیتا ہوں کہ رسول کریمؐ نے فرمایا کہ ان کے ساتھ اسی قانون کے مطابق برتاؤ کرو جو اہل کتاب کے لیے ہے۔"[1]

حضرت عثمانؓ کا عمل

حضرت عثمانؓ نے اپنی خلافت کے دوران میں ذمہ داری قبول کرنے میں اور وسعت پیدا کی اور اسی زمرہ میں شمالی افریقہ کے کافر بربروں وغیرہ کو بھی شریک کر لیا چنانچہ ابن شہاب زہری بیان کرتے ہیں کہ "مجھے یہ بات معلوم ہوئی کہ رسول اللہؐ نے بحرین کے مجوسیوں سے جزیہ لیا اور حضرت عمرؓ نے ایران کے مجوسیوں سے اور حضرت عثمانؓ نے اہل بربر سے جزیہ لیا۔"[2]

ان ہی نظائر کو پیش نظر رکھ کر فقہاء نے اپنی یہ رائے ظاہر کی ہے کہ ہر ایک غیر مسلم چاہے وہ اہل کتاب ہو کہ نہ ہو اگر وہ اسلامی مملکت کے زیر سایہ رہنا چاہے تو اسلامی مملکت کی جانب سے محصول جزیہ لے کر اس کے معاوضہ میں جان و مال عزت و آبرو اور عبادت گاہوں کی حفاظت کی ذمہ داری قبول کی جا سکتی ہے چنانچہ قاضی القضاۃ امام ابو یوسفؒ کی رائے کے مطابق تمام مشرکوں یعنی مجوسیوں، بت پرستوں، آفتاب پرستوں، ماہتاب پرستوں، صابین اور سامرہ سے جزیہ لیا جائے گا۔[3]

محصول جزیہ کے بجائے محصول زکات

اگر غیر مسلم محصول جزیہ ادا کرنے کو اپنی کسر شان سمجھے تو بجائے محصول جزیہ کے

---

[1] بلاذری: فتوح البلدان صفحہ ۲۶ نیز امام مالک: موطا کتاب الزکات باب الجزیہ بروایت علی بن حسینؒ نیز کتاب الاموال صفحہ ۳۲ نمبر ۷۸۔

[2] امام مالک: موطا کتاب الزکات باب الجزیہ نیز کتاب الاموال صفحہ ۳۲ نمبر ۷۹

[3] ابو یوسف: کتاب الخراج صفحہ ۷۳ مطبوعہ بولاق مصر۔

محصول زکات ادا کرنے کی آزادی رکھتے تھے۔ بعض عرب قبیلے مثلاً بنو تغلب، تنوخ اور بہراء وغیرہ جو عیسائی تھے اور خاص آن بان رکھتے تھے بجائے محصول جزیہ کے محصول زکات ادا کرتے تھے۔" حضرت عمرؓ نے بنو تغلب کے عیسائیوں سے جزیہ لینے کا ارادہ کیا گر وہ مختلف شہروں میں منتشر ہو گئے، اس پر نعمان بن زرعہ یا زرعہ بن النعمان نے حضرت عمرؓ سے کہا کہ یہ بنو تغلب عرب کی ایک قوم ہے جو اپنے کو جزیہ سے بالاتر سمجھتی ہے اور ان کے پاس مال نہیں ہے اور وہ کھیتوں اور مویشیوں کی مالک اور بڑی جنگ آزما ہے اس سے بگاڑ کر اپنے دشمن کے مقابلہ میں اسے قوی نہ بناؤ۔ حضرت عمرؓ نے ان سے اس پر صلح کر لی کہ ان سے دگنا صدقہ لیا جائے[۲] اور یہ دگنا صدقہ وصول کرنے کی وجہ بآسانی سمجھ میں آ سکتی ہے کہ یہ خاص قسم کا صدقہ صرف غیر مسلم مردوں پر ہی عاید کیا جاتا تھا اور ان کی عورتیں اور بچے مستثنیٰ تھے۔ برخلاف اس کے وہ صدقہ جو مسلمانوں سے لیا جاتا تھا وہ مسلمانوں کی عورتوں اور بچوں سے بھی لیا جاتا تھا۔ غرض وہ اگر جزیہ سے دو چند صدقہ ادا کرنے پر آپس میں صلح ہو جائے تو درست ہے چنانچہ حضرت عمرؓ نے شام میں تنوخ، بہراء اور بنو تغلب سے دو چند صدقہ لینا منظور فرمایا تھا مگر عورتوں اور بچوں سے نہ لیا جائے کیونکہ در اصل یہ جزیہ ہے جس کے مستحق اہل فئی ہیں زکات نہیں جو عورتوں اور بچوں سے بھی لی جاتی ہے[۳]

جزیہ کے محصول سے استثناء

جزیہ کا محصول صرف ایسے آزاد مردوں پر عائد کیا جاتا تھا جن میں جسمانی اور دماغی صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ محصول جزیہ ادا کرنے کی سکت بھی ہوتی تھی۔ عورتیں، بچے، بوڑھے، مجنون اور اسی طرح غلام بھی جزیہ کی ادائی سے مستثنیٰ قرار دیے گئے تھے۔ "جزیہ صرف مردوں پر ہے عورتوں اور بچوں پر نہیں ہے[۴]

۱۔ ہم مناعزوں کی جگہ ہم کا بروں بننے کی یہ ترکیب تھی۔
۲۔ کتاب الاموال صفحہ ۲۸ نمبر ۷۱ نیز صفحہ ۴۱ ۵ نمبر ۱۶۹۴ نیز فتوح البلدان ۱۰۲ بنو تغلب
۳۔ ماوردی: الاحکام السلطانیہ باب ۱۳ جزیہ صفحہ ۱۲۸
۴۔ ابو یوسف: کتاب الخراج صفحہ ۴۶ ۔

غرض "جزیہ صرف آزاد عاقل مردوں پر واجب ہوتا ہے۔ عورت، بچے مجنون اور غلام سے نہیں لیا جاتا کیونکہ وہ تابع اور اولاد کے حکم میں ہیں۔ اگر کوئی عورت اپنے شوہر یا رشتہ دار سے الگ ہو تو بھی اس سے جزیہ نہیں لیا جائے گا اس صورت میں وہ اپنی قوم کے مردوں کے اگرچہ وہ رشتہ دار نہ ہوں تابع سمجھی جائے گی۔ اگر کوئی عورت دارالحرب چھوڑ کر دارالاسلام میں رہنے لگے اور یہاں رہنے کی وجہ سے وہ خود جزیہ دینا چاہے تو یہ جزیہ دینا اس پر واجب نہ ہوگا بلکہ اس کی طرف سے ہدیہ سمجھا جائے گا اور اگر وہ جزیہ دینا چھوڑ دے تو جزیہ کی ادائی پر وہ مجبور نہ کی جائے گی اگرچہ اس صورت میں وہ اپنی قوم کے تابع نہیں مگر اس کی حفاظت کی پوری ذمہ داری لی جائے گی۔[1]

عورتوں کی طرح بوڑھے لوگوں سے بھی جزیہ کا محصول وصول نہیں کیا جاتا تھا "جزیہ ایسے بوڑھوں سے نہ لیا جائے جو نہ کوئی کام کر سکتے ہوں اور نہ ان کے پاس کوئی چیز ہو۔ اسی طرح فاتر العقل سے بھی کچھ نہ لیا جائے گا"[2]

نابینا اور اپاہجوں سے اسی صورت میں لیا جاتا تھا جبکہ وہ دولتمند ہوں "اسی طرح مسکینوں سے ادائی کی توقع ہی نہیں کی گئی" اور جزیہ ایسے مسکین سے نہ لیا جائے جس کو صدقہ دیا جاتا ہے اور نہ جزیہ ایسے اندھوں سے لیا جائے جو نہ کوئی پیشہ کرتے ہوں اور نہ کوئی کام[3]

استثناء کا دائرہ اور بڑا ہوا ہے کہ تارک الدنیا، راہب، بھکشو اور جوگی بیراگی بھی اگر غریب ہوں تو محصول جزیہ سے مستثنیٰ قرار دیے گئے تھے۔[4]

جزیہ کی ادائی کی بنا پر دوسرے محاصل سے استثنا

ذمی محصول جزیہ ادا کر دینے سے بعض اور محصولات سے بچ جاتے تھے مثلاً مسلمانوں سے ان کے جانوروں اور نقدین (سونا چاندی) سے بھی محصول لیا

---

[1] ۔ ماوردی: الاحکام السلطانیہ باب ۱۳ صفحہ ۱۴۷ جزیہ ۔ [2] ۔ ابویوسف: کتاب الخراج صفحہ ۷۰
[3] ۔ ابویوسف: کتاب الخراج صفحہ ۷۰ ۔
[4] ۔ ھدایہ ج ۲ کتاب السیر باب الجزیہ ۔

جاتا تھا لیکن "اہل ذمہ کے مویشیوں، اونٹ بیل اور بکری پر زکات نہیں ہے مرد اور عورتیں اس میں برابر ہیں"[1]

فوجی خدمت سے استثناء

سب سے آخر میں لیکن اہمیت کے لحاظ سے سب سے اہم بات یہ ہے کہ محصول جزیہ ادا کرنے پر ذمی فوجی خدمت سے مستثنٰی ہو جاتے تھے۔ صلح کے معاہدات میں بھی خاص طور پر اس کی صراحت کی جاتی تھی کہ "انھیں فوجی خدمت کے لیے نہیں بلایا جائے گا"[2] لیکن ذمی اگر فوجی خدمت انجام دیں تو خود بخود ان سے محصول جزیہ ساقط ہو جاتا تھا۔ تاریخوں اور دوسرے مستند اسلامی ماخذوں میں اس کی بہت سی نظیریں ملتی ہیں۔ حضرت عمرؓ نے ١٧ھ میں عراق کے ایک افسر کو لکھ بھیجا اور ساتھ ہی یہ ہدایت کردی کہ "وہ سواروں میں جن سے مدد لینے کی ضرورت ہو ان سے مدد لو اور ان پر سے جزیہ اٹھا لو"[3]

حضرت عمرؓ کا یہ فرمان تو ان ذمیوں کے لیے تھا جو ہمیشہ فوجی خدمت انجام دیا کرتے تھے لیکن اگر کوئی ذمی صرف کسی ایک سال فوجی خدمت انجام دیتا تو اس سال کا جزیہ اس پر عاید نہیں کیا جاتا تھا چنانچہ ٢٢ھ میں جب اس وقت کے روسی علاقہ کا ملک آذربیجان فتح ہوا تو حضرت عمرؓ نے شہر کے باشندوں کے نام فرمان میں یہ صراحت فرمادی کہ "ان میں سے جو کوئی کسی سال فوج میں کام کرے گا تو اس سال کا جزیہ اس سے نہ لیا جائے گا"[4] بہر طور ذمی اگر جنگ میں شریک ہو کر ملک کو دشمن سے بچاتے تو خود بخود محصول جزیہ سے مستثنٰی قرار پاتے تھے۔

اسلامی مملکت میں غیر مسلموں کو ملازمتیں

اس موقع پر اس کا تذکرہ بے محل نہ ہوگا کہ اسلامی مملکت میں غیر مسلموں کے لیے بھی ملازمتوں کے دروازے کھلے ہوئے تھے، کشوری اور فوجی عہدوں پر انھیں امور کیا جاتا تھا

---

[1] ابو یوسف کتاب الخراج صفحہ ٧٠۔ [2] فتوح البلدان صفحہ ٦٥ صلح نجران
[3] تاریخ طبری صفحہ ٢٤٩٢ ١٧ھ کے واقعات۔ [4] تاریخ طبری صفحہ ٢٦٦٢ ٢٢ھ کے واقعات۔

اوپر تذکرہ گزر چکا کہ رسول اللہ کا ایک خادم یہودی تھا اور بیمار ہونے پر آپ نے اس کی عیادت بھی کی تھی[۱] نیز عبداللہ بن اریقط کو ہجرت کے وقت آپ نے اجرت پر رکھا تھا کیونکہ وہ راستہ بتانے میں ماہر تھا[۲]

حضرت عمر فاروقؓ کے عہد میں علاوہ کشوری ملازمتوں کے کئی ایک عیسائی قبیلے مثلاً بنو تغلب، بہراء وغیرہ فوج میں بھرتی کیے گئے تھے۔

اسلامی پرچم جب دریائے سندھ کے کنارے لہرانے لگا تو "محمد بن قاسم نے عرب فوجوں کے علاوہ غیر مطمئن جاٹوں اور میو قوم کو بھرتی کیا۔ یہ لوگ قدیم زمانہ غیر رواداری نہ ہندو حکومت سے نالاں تھے کیونکہ انھیں گھوڑے کی سواری کرنے اچھے کپڑے پہننے اور سر کھلا رکھنے سے منع کر دیا گیا تھا وہ تو بس پانی کھینچنے والے اور لکڑیاں کاٹنے والے بن کر رہ گئے تھے وہ حکومت سے اس قدر شاکی اور نالاں تھے کہ انھوں نے اپنی قسمت کو ایک نوارد سے وابستہ کر لیا"[۳]

"برہمنوں کے ساتھ بہترین برتاؤ کیا گیا اور ان کی شان و عزت کو برقرار رکھا گیا انتظام مملکت کے سلسلے میں بہت سے عہدے ان کے سپرد کیے گئے اور ملک کی حکومت میں انھیں بھی شریک کیا گیا"[۴]

---

۱ ـ ملاحظہ ہو باب ۴ صفحہ ۳۷۶ ـ ۲ ـ ملاحظہ ہو باب ۱ صفحہ ۵۸ ـ

۳ ـ اشوری پرشاد: میڈیول انڈیا صفحہ ۵۶ مطبوعہ انڈین پریس الہ آباد ۱۹۴۰ء

۴ ـ اشوری پرشاد میڈیول انڈیا صفحہ ۹۰ ـ ڈاکٹر جے۔ این چودھری ایم اے پی ایچ ڈی اپنی کتاب ملک عنبر میں ملک عنبر کی حکومت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "خصوصیت کے ساتھ ہندو رعایا کے ساتھ برتاؤ سے متعلق انتظام مملکت کے سلسلے میں بڑی دوربینی کام لیا گیا تھا۔ نظام شاہی حکومت کے فیاضانہ دور میں مذہبی رواداری کی پالیسی اختیار کی گئی تھی کبھی بھی ہندوؤں کے مندروں کو تباہ و برباد کرنا تو کجا ہاتھ تک نہیں لگایا گیا ہر کوئی خواہ ہندو ہو یا مسلمان اپنے مذہبی اصولوں پر کاربند تھا حکومت اس میں مداخلت نہیں کرتی تھی۔ علاوہ بریں حکومت کے تقررات کے سلسلے میں کچھ بھی رکاوٹیں نہیں تھیں تمام ملازمتوں کے لیے صرف قابلیت ہی ایک پاسپورٹ سمجھی جاتی تھی اور ہر کسی کا

"فتح و کامرانی کے بعد محمد بن قاسم نے ملتان کا رُخ کیا جو بالائی سندھ کا بڑا شہر تھا، ملتان کے باشندوں، تاجروں، سوداگروں ــ کاریگروں اور

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گذشتہ) خواہ کوئی سی ذات پات رکھتا ہو تقرر ہو سکتا تھا حقیقت تو یہ ہے کہ بہت سی اعلیٰ جائدادوں پر ہندوؤں کا تقرر کیا جاتا تھا۔ شاہ جی، شریف جی، وٹھل راج اور جدا او سرائو وغیرہ حکومت کے اعلیٰ ترین عہدوں پر فائز تھے اور انھوں نے بڑی عمدگی سے فوجی اور کشوری خدمتیں انجام دیں۔ یہ تمام کے تمام اپنے مسلم بھائیوں کے پہلو بہ پہلو دوستی اور یگانگت سے خدمتیں انجام دیتے تھے اور یوں تمام ملک دوستی، محبت اور رواداری کی فضا میں سانس لیتا تھا" (صفحہ ۱۴۳ تا ۱۴۴)

بعض انگریز مورخوں نے عالمگیر کو ظالم اور ستم گر بنا کر پیش کیا ہے لیکن خود ایک بے تعصب انگریز پروفیسر آرنلڈ لکھتے ہیں:

"اورنگ زیب عالمگیر کے فرامین اور مراسلات کے ایک قلمی مجموعہ میں جو ابھی تک طبع نہیں ہوا ہے مذہبی آزادی کا وہ جامع و مانع اصول درج ہے جو ہر ایک بادشاہ کو غیر مذہب کی رعایا کے ساتھ برتنا ضروری ہے۔ عالمگیر کو ایک شخص نے عرضی دی کہ دو پارسیوں کو جو تنخواہ تقسیم کرنے پر مقرر تھے اس علت میں برخاست کر دیا جائے کہ وہ آتش پرست ہیں اور ان کی جگہ کسی تجربہ کار معتبر مسلمان کو مقرر کیا جائے۔ عالمگیر نے عرضی پر حکم لکھا کہ مذہب کو دنیا کے کاروبار میں دخل نہیں ہے اور نہ ان معاملات میں تعصب کو جگہ مل سکتی ہے اور اس قول کی تائید میں یہ آیت نقل کی: لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْنِ (تم کو تمھارا دین اور ہم کو ہمارا دین) سرکاری نوکریاں لوگوں کو ان کی لیاقت اور قابلیت کے موافق ملیں گی" ارنلڈ: پریچنگ آف اسلام یعنی ہندوستان میں اسلام کی اشاعت۔

آج بیسوی صدی عیسوی میں جنوبی افریقہ کی نوآبادیات میں رنگ کی بنا پر امتیاز برتا جاتا ہے تو خود ہند میں حال حال تک غیر مذہبی حکومت میں مذہب کی بنا پر امتیاز برتا گیا چنانچہ ۱۱رڈسمبر ۱۹۴۷ء کو مدراس پریسیڈنسی کی مقننہ کے فرش پر کھڑے ہو کر وزیر داخلہ ڈاکٹر سبارایں (حال سفیر انڈونیشیا) نے اعلان کیا کہ

"اسپیشل مسلح پولیس میں مسلمان بھرتی نہیں کیے جائیں گے" (بحوالہ اخبار ہند مدراس مورخہ ۱۲رڈسمبر ۱۹۴۷ء)

ملحقہ علاقوں کے جاٹ اور لیست اقوام نے جنھیں تنگ نظر ہندو حکومت نے کچل رکھا تھا اس فاتح کا استقبال کیا اور خوش آمدید کہا[1]

"ہندوستان والوں نے محمد بن قاسم کے جانے کا بہت غم کیا۔ اس کے لیے روئے اور کیرج میں اس کی شبیہ بنا کر رکھی"[2]

غرض اسلامی مملکت میں اعلیٰ ادنیٰ عہدے ایک طرف اسلامی قانون کی رو سے "ایک ذمی وزیر تنفیذ بھی ہو سکتا ہے"[3] آج مصر اور پاکستان میں عملاً غیر مسلم وزرا موجود ہیں۔

جزیہ کی واپسی اگر کسی وجہ سے اسلامی مملکت ذمی رعایا کی حفاظت نہ کر سکے تو محصول جزیہ بھی نہیں لیتی اور اگر جزیہ لے بھی لے تو اسے واپس کر دیتی تھی۔ خالد بن الولیدؓ نے بانقیا اور بسما کی بستیوں سے جو معاہدہ کیا تھا اس کے آخری الفاظ مورخ طبری نے یہ لکھے ہیں کہ "آج سے تم ہماری ذمہ داری اور حفاظت میں داخل ہو، ہم تمھاری حفاظت کریں گے تو جزیہ کے حق دار ہوں گے ورنہ نہیں"[4]

خالدؓ کی معزولی کے بعد مسلمانوں کی شمالی کمان ابو عبیدہ بن الجراحؓ کے حوالے کی گئی۔ ابو عبیدہؓ کو چاروں طرف سے اطلاع ملی کہ رومیوں نے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) جس دیس میں ملک کے اعلیٰ ترین عہدوں پر فائز ہو کر مہاراجہ چندو لال، مہاراجہ سرکشن پرشاد اور نواب فریدوں جی فریدالملک رسوں تک دیوانی اور وزارت عظمیٰ چلا چکے تھے اسی دیس میں چند ماہ قبل مسٹر پی۔ سی۔ جین سیول اڈمنسٹر محبوب نگر نے ملک کی ادنیٰ ترین جائداد چپراسی گری، نمبر اندازی اور اہلکاری تک کے لیے اخبار میں اعلان کیا کہ "صرف غیر مسلم درخواست دیں" (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو دکن کرانیکل مورخہ ۱۵ر جولائی ۱۹۴۹ء صلہ) لیکن شکر ہے کہ انڈیا یونین کے جدید دستور نے اس قسم کی تنگ نظری کو بڑی حد تک دور کر دیا ہے اور "نہرو لیاقت معاہدہ" میں صاف اور واضح طور پر اقلیتوں کے حقوق کو تسلیم کر لیا گیا ہے۔ [1] ایشوری پرشاد: میڈیول انڈیا صفحہ ۶۲

[2] بلاذری: فتوح البلدان صفحہ ۴۴۱ – [3] احکام السلطانیہ ماوردی باب ۲ صفحہ ۲۶

[4] تاریخ طبری صفحہ ۱۲ھ کے واقعات

ایک بڑا لشکر جمع کیا ہے اور حملہ کرنے کی فکر میں ہیں تو" ابو عبیدہؓ نے ہر اس شہر کے حاکم کو کہ جہاں کے لوگوں سے صلح ہوئی تھی یہ حکم لکھ بھیجا کہ ان سے جو جزیہ اور خراج بطور محصول کے وصول کیا گیا ہے واپس کر دیا جائے اور نیز یہ بھی لکھا کہ ان (ذمیوں) سے کہدو کہ ہم نے تم سے جو رقم لی ہے وہ تمھیں واپس کی جاتی ہے ہم نے تم سے یہ شرط کی تھی کہ ہم تمھاری حفاظت کریں گے لیکن اب ہم میں اس کی سکت نہیں رہی[1] مورخین کا بیان ہے کہ یہ کئی لاکھ کی رقم تھی۔
اس رعایت کے سوا مسلمانوں نے شام کے علاقوں کے مختلف فرقوں میں ہم آہنگی پیدا کی تھی۔ کسی زمانہ میں یہودی شام کے مالک تھے رومی ان پر حملہ آور ہوئے اور ان پر ظلم و ستم کرتے رہتے ان کا ابھی اقتدار باقی تھا کہ عیسائیت کی ابتدا ہوئی رومی اور یہودی غریب عیسائیوں پر طرح طرح کے ظلم و ستم ڈھانے لگے حد یہ پہنچی کہ عیسائیوں کو زندہ آگ میں جھونک دیا جاتا تھا۔ جب عیسائیوں کو عروج ہوا تو انھوں نے بدلہ لینے کے لیے یہودیوں کی بڑی لے دے کی لیکن رومی سلطنت تو غیر ملک والوں کی سلطنت تھی انھیں ان دونوں سے کیا ہمدردی ہو سکتی تھی! وہ ان دونوں کا خون چوستی تھی مسلمان شام میں گویا خدا کی رحمت اور سنجات دہندہ تھے۔ عیسائی اور یہودی کچھ ہی دنوں میں ان کے گرویدہ ہو گئے" جب مسلمانوں کو یہ خبر ملی کہ ہرقل نے فوجیں جمع کی ہیں جو یرموک کی جنگ کے لیے ان کی طرف بڑھ رہی ہیں تو انھوں نے اہل حمص کو وہ سارا خراج واپس کر دیا جو ان سے لیا تھا، اور کہا کہ ہم دوسری مصروفیتوں کی وجہ سے تمھاری مدد اور حفاظت نہیں کر سکتے اب تم جانو اور تمھارا کام جانے۔ اس پر اہل حمص نے کہا نہیں تمھاری حکومت اور تمھارا انصاف اس جور و ظلم سے بہت زیادہ محبوب ہے جس میں ہم تمھارے آنے سے پہلے مبتلا تھے۔ ہم ہرقل کی فوج کو تنگ کریں گے اور تمھارے عامل کے ساتھ مل کر شہر کی حفاظت کریں گے۔ اور یہودیوں نے کہا کہ توراۃ کی قسم!

---

[1] ابو یوسف کتاب الخراج صفحہ ۸۱ –

ہرقل کا عامل حمص میں اس وقت تک داخل نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ ہمیں مغلوب نہ کر لے اور ہماری تمام کوششیں ضائع نہ ہو جائیں۔ پھر انھوں نے شہر کے دروازے بند کر لیے اور ان کی حفاظت کرنے لگے۔ اور یہی ان شہروں کے یہودیوں اور عیسائیوں نے بھی کیا جن سے صلح ہو چکی تھی۔ انھوں نے کہا کہ اگر رومی اور ان کے ساتھی مسلمانوں پر غالب ہو گئے تو ہماری پہلے جو حالت تھی پھر وہی ہو جائے گی۔ اور اگر ایسا نہ ہوا تو جب تک ایک مسلمان بھی زندہ ہے اسی حالت پر رہیں گے۔ پھر جب اللہ نے کافروں کو شکست دی اور مسلمانوں کو فتح کا شرف عنایت کیا تو انھوں نے شہر کے دروازے کھول دیے اور گانے بجانے والوں کو ساتھ لیکر نکلے، جشن منایا اور خراج ادا کیا۔ اس کے بعد ابو عبیدہؓ جند قنسرین اور انطاکیہ کی طرف روانہ ہوئے اور اس کو فتح کیا۔[1]

جزیے کے محصول کی مقدار اور خصوصیت

جزیہ دراصل ایک محصول متنزاید تھا جس کی تفصیل ذیل میں کی گئی ہے۔

ابتداءً شام کے علاقہ میں ہر شخص پر ایک دینار سالانہ محصول لگایا گیا تھا۔ ہر شخص پر ایک ہی مقررہ محصول لگانے کے طریقہ کی خامی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ غریب طبقہ تو حکومت کے محصولوں کے بہت بھاری بوجھ کے نیچے دب کے رہ جاتا ہے اور امیر طبقہ پر اس کا بہت ہی کم بار پڑتا ہے۔ ایک مالدار کے لیے سالانہ دو دینار ادا کر دینا کوئی بات ہی نہیں ہے مگر ایک غریب کسان (فلاح) کے لیے یہی ادائی گویا پہاڑ بن جاتی ہے۔

حضرت عمرؓ کو مذکورہ طریقہ محصول کی خامی واضح ہو چکی تو آپ نے اس میں مناسب اصلاح فرما دی اور دولت کے لحاظ سے دولتمند، متوسط اور غریب کے تین گروہ بنائے اور ہر ایک پر ایک علیحدہ محصول لگایا، نیز جن ممالک میں مثلاً شام، مصر وغیرہ میں جہاں کہ معیار طلاء رائج تھا وہاں

---

[1] بلاذری: فتوح البلدان صفحہ ۱۳۷ دمشق، حمص اور یرموک کا دن، یورپی مورخین اور خصوصاً پروفیسر آرنلڈ نے اپنی کتاب پریچنگ آف اسلام باب ۳ میں خاص طور پر اس واقعہ کا تذکرہ کیا ہے۔

سونے کے سکوں (دینار) کی شکل میں جزیہ عائد کیا اور جن ممالک میں مثلاً یمن، عراق، بحرین، ایران اور آرمینیا وغیرہ میں جہاں کہ زر سیم کا معیار رائج تھا وہاں چاندی کے سکوں (درہم) کی شکل میں محصول جزیہ عائد کیا" ملک شام میں جزیہ ابتداءً ایک جریب اور ایک دینار فی کس مقرر کیا گیا تھا، پھر حضرت عمرؓ نے زر طلاء والوں پر چار دینار اور زر سیم والوں پر چالیس درہم فی کس مقرر کیا اور دولتمند کی دولت، مفلس کے افلاس اور متوسط کی حالت کے مطابق ان کے طبقے مقرر کیے؟ خود حضرت عمرؓ ہی کے آزاد کردہ غلام اسلم بیان کرتے ہیں "حضرت عمرؓ نے زر طلاء والوں پر چار دینار اور زر سیم والوں پر چالیس درہم عائد کیے۔ اور یہ کہ مسلمانوں کو کھانا کھلائیں اور تین روز تک مہمانی کریں"[۲]

اسی طرح سفیان بن عیینہ ابن نجیح سے روایت کرتے ہیں کہ

قُلْتُ لِمُجَاهِدٍ: مَا شَانُ اَهْلِ الشَّامِ عَلَيْهِمْ اَرْبَعَةُ دَنَانِيْرَ وَاَهْلُ الْيَمَنِ عَلَيْهِمْ دِيْنَارٌ قَالَ جُعِلَ ذٰلِكَ مِنْ قِبَلِ الْيَسَارِ[۳]

"میں نے مجاہد سے کہا کہ اہل شام کا کیا حال ہے کہ ان پر چار دینار جزیہ کے مقرر ہیں اور اہل یمن پر ایک ہی دینار ہے؟ انھوں نے کہا کہ یہ مالداری کی حیثیت پر ہے۔

---

[۱] بلاذری: فتوح البلدان صفحہ ۱۲۴ دمشق اور اس کی فتح۔ [۲] امام مالک: موطا، کتاب الزکاۃ باب الجزیۃ نیز کتاب الاموال صفحہ ۳۹ نمبر ۱۰۰ حدیث میں مہمانی کا جو تذکرہ ہے وہ رسول اللہؐ ہی نے مسلمانوں اور غیر مسلموں پر واجب کیا ہے۔ اگر مسلمان مسافروں کی مہمانی پر مصالحت ہو تو تین دن کی مہمانی مقرر کی جائے اور اسی کا ان سے مطالبہ ہو اس سے زیادہ مدت مقرر نہ کی جائے، حضرت عمرؓ نے شام کے عیسائیوں سے مسلمان مسافروں کی تین دن کی مہمانی پر مصالحت کی تھی۔ جو خود کھاتے ہوں وہی کھانا طلب کیا جائے ایسا نہ ہو کہ بکری اور مرغی کھلانے پر مجبور کیا جائے اور ان کے جانوروں کو جو بھی میسر ہو، اس مہمانی کا تعین دیہات والوں پر ہونا چاہیے شہریوں پر نہیں ماوردی: الاحکام السلطانیہ باب ۱۳ صفحہ ۱۳۸

[۳] بخاری پ ۱۲ کتاب الجہاد نیز کتاب الاموال صفحہ ۴۱ نمبر ۱۰۷ نیز فتوح البلدان صفحہ ۷۳۔

حضرت علیؓ نے بھی محصول متزاید کے طریقے کو برقرار رکھا جیسا کہ ابو زید انصاری سے ان کے والد نے بیان کیا ہے کہ "مجھے حضرت علیؓ نے اس علاقہ میں جسے دریائے فرات سیراب کرتا ہے بھیجا۔ حضرت علیؓ نے بہت سے دیہات کا نام لے کر حکم دیا کہ

"ایسے زمیندار جو ترکی گھوڑوں پر سوار ہوتے ہوں اور ہیروں میں سونے کے کپڑے پہنتے ہوں فی کس اڑتالیس درہم سالانہ عائد کرو"

"اوسط درجہ کے تاجر پر فی کس چوبیس درہم سالانہ"

کسانوں اور دوسرے لوگوں پر فی کس بارہ درہم سالانہ مقرر کردو"[۱]

امام ابویوسفؒ (المتوفی ۱۸۲ھ) نے اپنے زمانہ کا لحاظ کرتے ہوئے صرافوں، پارچہ فروشوں، زمینوں کے مالکوں، تاجروں اور ڈاکٹروں (طبیبوں) کو مالدار طبقہ میں اور دستکاروں مثلاً درزیوں، رنگریزوں، موچیوں اور کفش سازوں کو غریب طبقہ میں شمار کیا ہے اور یہ درجہ بندی اس زمانہ یعنی دوسری صدی ہجری کے معیار کے لحاظ سے ہے حالانکہ آج کل کفش ساز مثلاً باٹا بڑا دولتمند شخص ہے۔ امام صاحب لکھتے ہیں کہ "پھر ان کے جو طبقے مقرر کیے گئے ہیں اسی کے مطابق لیا جائے دولت مندوں جیسے صرافوں، پارچہ فروشوں، زمینوں کے مالکوں، تاجروں اور ڈاکٹروں (معالج) سے اڑتالیس درہم لیے جائیں اور ہر ایک دستکار اور صناع کاریگر سے اس کی صنعت اور تجارت کے مطابق اڑتالیس درہم دولتمند سے اور متوسط طبقے سے چوبیس درہم لیے جائیں۔ اور دستکاروں مثلاً درزیوں، رنگریزوں، موچیوں اور کفش سازوں اور ان جیسے لوگوں سے بارہ درہم لیے جائیں"[۲] لیکن امام صاحب نے متوسط طبقہ کی تفصیل نہیں بتائی۔

امام مالکؒ المتوفی ۱۷۹ھ نے دولتمند طبقہ سے ۴۰ درہم یا چار دینار جزیہ

---

[۱] بلاذری: فتوح البلدان ص ۲۷۱۔

[۲] ابویوسف: کتاب الخراج صفحہ ۱۲۲ مطبوعہ بولاق مصر۔

بیان کیا اور امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے دولتمند سے اڑتالیس درہم بیان کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سونے چاندی کی قیمت کا تناسب امام مالک رحمہ اللہ کے زمانہ میں ۱ : ۱۰ ایک اور دس کی تھی اور امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے زمانہ میں ۱ دینار ۱۲ درہم کے مساوی تھا یعنے سونے اور چاندی کی قیمت میں ایک اور بارہ کا تناسب تھا۔

غرض محصول جزیہ کی مقدار نہایت ہی عدل و انصاف سے مقرر کی تھی دولتمندوں، متوسط درجہ کے لوگوں اور غریبوں پر ہر ایک کی حیثیت کے لحاظ سے جزیہ کا محصول لگایا گیا تھا۔ اور ناداروں سے تو کچھ بھی نہ لیا جاتا تھا

عصر جدید کے معاشیین بھی محصول متزائد ہی کے حامی نظر آتے ہیں یہاں بطور مثال صرف دو ایک بیانات پیش کیے جاتے ہیں۔ پروفیسر ٹاسگ نے لکھا ہے کہ "محصول متزائد کے بالعموم موئد اپنے خیالات ٹھیک اس بنا پر قائم کرتے ہیں کہ موجودہ معاشری نظام مکمل نہیں ہے اور یہ کہ محصول اس نظام کی اصلاح و درستی کرنے والے آلات میں سے ایک ہونا چاہیے، خواہ یہ کھلا ہوا سوال ہی کیوں نہ ہو کہ آیا دولت و آمدنی کی سب عدم مساوات غیر منصفانہ ہے یا نہیں! پھر بھی موجودہ زمانہ میں بڑے درجوں کی جیسی عدم مساوات پائی جاتی ہے اس کو عدل و انصاف کے ضابطوں کے ہم آہنگ نہیں سمجھا جاتا بڑے مالداروں سے مطالبہ کرنا چاہیے کہ وہ نہ صرف اپنی آمدنیوں کے تناسب سے محصول ادا کریں بلکہ اس تناسب سے زاید مقداریں ادا کریں اس تجویز کو اشتراکی کہا گیا ہے[1]" "محصول متزائد کی اس بنا پر تائید کی جا سکتی ہے کہ سماجی پالیسی کا اقتضاء یہ ہے کہ دولتمند زیادہ ادا کریں[2]"

غرض "اگر جزیہ دولت اور افلاس کے اعتبار سے مختلف ہو تو ذمیوں کی تعداد کے ساتھ ان کے نام بھی لکھے جائیں" تاکہ ہر ایک کی دولت اور افلاس کا حال معلوم ہو سکے کہ کون بالغ ہوا تاکہ اس سے لیا جائے اور کون کون مرا اور

---

[1] ۔ ٹاسگ : اصول معاشیات ج ۲ باب ۶۸ صفحہ ۵۰۹ ۔

[2] ۔ ایس ۔ ای تھامس : ایلیمنٹس آف اکنامکس باب ۲۲ صفحہ ۵۸۹ نواں ایڈیشن ۔

مسلمان ہوا کہ ان سے ساقط کیا جائے اور اس سے کل واجب جزیہ کی مقدار معین ہو سکے[1]

جزیہ میں بجائے رقم کے اشیاء

گو کہ جزیہ کا محصول عموماً زر ہی کی شکل میں لیا جاتا تھا تاہم ذمی اگر چاہتے تو محصول جزیہ اپنی مصنوعات اور پیداوار کی شکل میں بھی ادا کر سکتے تھے۔ خود رسول کریمؐ نے نجران کے عیسائیوں پر جنھوں نے سب سے پہلے جزیہ ادا کیا تھا ان کی مصنوعات یعنے حلوں کی شکل میں محصول جزیہ عائد کرتے ہوئے اس کی مقدار کا تعین فرمایا تھا۔ "یمن والوں کی بابت رسول کریمؐ نے حضرت معاذ بن جبلؓ کو لکھ بھیجا تھا کہ ہر ایک بالغ شخص سے ایک دینار یا اس کا بدل معافر (کپڑے کی ایک قسم) لیا جائے"[2]

حضرت عمرؓ کی خلافت میں بعض عاملوں نے شراب اور سور کی شکل میں بھی جزیہ اور خراج وصول کرنا شروع کیا لیکن حضرت عمرؓ نے اس سے روک دیا اور کہا کہ ان سے یہ نہ لو ان کو بیچ ڈالو اور تم ان کی قیمت لے لو۔[3]

حضرت علیؓ ہر ایک صناع (کاریگر) سے اس کی مصنوعات کی شکل میں جزیہ لیتے تھے سوئیاں بنانے والے سے سوئیاں رسیوں والوں سے رسیاں اور اونٹ پالنے والوں سے اونٹ لیتے تھے[4]

خدمات کی شکل میں ایک انوکھا محصول

حضرت امیر معاویہؓ نے خدمات کی شکل میں ایک انوکھا شخصی محصول (پرسنل ٹکس) لگایا تھا۔ "نصیبین کے عامل نے معاویہؓ کو جو حضرت عثمانؓ کی طرف سے شام اور جزیرہ کے والی تھے لکھا کہ میرے ساتھی مسلمانوں کی ایک جماعت کو بچھوؤں سے بڑی تکلیف ہے۔ معاویہؓ نے اس کے جواب میں

۱۔ ماوردی: الاحکام السلطانیہ باب ۱۳ صفحہ ۱۴۷ نیز ابویعلی: الاحکام السلطانیہ صفحہ ۲۲۹

۲۔ ابوعبید: کتاب الاموال صفحہ ۳۲ نمبر ۶۶ نیز ابویوسف: کتاب الخراج صفحہ ۷۵

۳۔ کتاب الاموال صفحہ ۵۰ نمبر ۱۲۹۔

۴۔ کتاب الاموال صفحہ ۴۴ نمبر ۱۱۷ نیز ابویوسف: کتاب الخراج صفحہ ۷

انہیں یہ لکھا کہ شہر کے تمام محلہ والوں پر بچھوؤں کی تعداد مقرر کردو کہ وہ روزانہ اتنے بچھو لایا کریں۔ انھوں نے یہی کیا، وہ لوگ بچھو لے کر آتے اور وہ ان کو مار ڈالنے کا حکم دیتا۔[1] اس شخصی محصول کے عائد کرنے کا مقصد یہ تھا کہ ملک میں بچھوؤں کا وجود باقی نہ رہے۔ ممکن ہے کہ پڑھنے والوں کو یہ محصول عجیب سا معلوم ہو لیکن اس سے بھی عجیب تر وہ محصول ہے جو " پطرس اعظم (زار روس) نے داڑھیاں چھوڑنے والوں پر لگایا تھا تاکہ داڑھیوں کے صفائی کی ہمت افزائی کی جائے، وہ بھی اس مفہوم میں ایک شخصی محصول تھا[2]

جزیہ ادا کرنے کی تاریخ

" جزیہ ہلالی مہینوں سے ایک سال گذرنے پر سال میں ایک مرتبہ واجب ہوتا ہے۔ سال کے اندر جو شخص مر جائے اس کے ترکہ سے اور جو مسلمان ہو جائے اس کے گذرے ہوئے ایام کا واجب شدہ جزیہ وصول کیا جائے۔ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک موت اور اسلام سے جزیہ ساقط ہو جاتا ہے۔ اگر لڑکا بالغ ہو جائے یا مجنون کو افاقہ ہو جائے تو سال شروع ہونے دیا جائے اس کے بعد سے جزیہ لیا جائے، فقیر مالدار ہو جائے تو لیا جائے اور کوئی تنگ دست ہو جائے تو اسے مہلت دی جائے[3]

مسلمان ہو جانے پر جزیہ کے محصول کا ساقط ہو جانا۔

اگر کوئی ذمی مسلمان ہو جائے تو محصول جزیہ ساقط ہو جاتا تھا کیونکہ اس کی حیثیت معاہدہ کنندہ کی نہیں رہتی تھی بلکہ وہ بھی ملت کا ایک فرد بن جاتا تھا۔ اور اس پر وہ ساری ذمہ داریاں عائد ہو جاتی تھیں جو ایک مسلمان شہری کے ذمہ ہوتی ہیں، خلافت راشدہ اور اس کے بعد بھی یہی عمل درآمد رہا چنانچہ " عمر بن عبدالعزیزؒ نے اپنے عاملوں کو لکھ بھیجا کہ

---

[1] ۔ بلاذری: فتوح البلدان صفحہ ۱۷۸ فتوح الجزیرۃ
[2] ۔ ڈالٹن: پرنسپلز آف پبلک فینانس باب ۶ صفحہ ۳۹
[3] ۔ ماوردی: الاحکام السلطانیہ باب ۱۳ صفحہ ۱۳۹ نیز ابویعلیٰ: الاحکام السلطانیہ ص ۱۴۴

جزیہ دینے والوں میں سے جو کوئی مسلمان ہو جائے اس کا جزیہ معاف کر دو[1]۔ اسلام کی اس پالیسی سے اکثر غیر مسلم مستشرق چراغ پا ہوئے ہیں کہ مالی پالیسی کے ذریعہ ذمیوں کو مسلمان بنا لیا گیا لیکن یاد رہے کہ گو وہ محصول جزیہ سے مستثنیٰ قرار پاتے تاہم انھیں بھی اور مسلمان بھائیوں کی طرح فوجی خدمت انجام دینی پڑتی تھی۔ اگر وہ صاحب نصاب ہوتے تو زکات ادا کرتے اور اگر ان کے پاس مویشی ہوتے تو ان کی بھی زکات ان سے وصول کی جاتی تھی۔

گو حکومت کی یہ عام پالیسی رہی لیکن وقت یا ایسا بھی ہوتا تھا کہ کسی طرح بھی حکومت کی آمدنی گھٹنے نہ پائے اور جزیہ کے گوشوارہ میں کمی ہو کر موازنہ میں خسارہ نہ آئے، اس کے لیے وہ کچھ نہ کچھ حیلے تراشنے کی کوشش کرتا۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ (المتوفی [illegible]) نے اپنے خراسان کے گورنر "جراح" کو یہ حکم دیا کہ دیکھو جو بھی تمہارے سامنے قبلہ کی طرف نماز پڑھے اس سے جزیہ نہ لو۔ اس حکم کے پہنچتے ہی لوگ دھڑا دھڑ مسلمان ہونے لگے یہ حالت دیکھ کر جراح سے کسی نے کہا کہ یہ لوگ اسلام کی خوبیوں کی وجہ سے نہیں بلکہ جزیہ سے بچنے کے لیے مسلمان ہو رہے ہیں، اس لیے ذرا ختنہ کرنے کا حکم دے کر ان کا امتحان تو کیجیے۔ جراح نے اس معاملہ کو بارگاہ خلافت میں منظوری کے لیے بھیجا۔ امیر [illegible] نے اس کے جواب میں لکھا کہ اللہ نے رسول اللہؐ کو اسلام کا داعی بنا کر مبعوث فرمایا تھا محصول وصول کرنے والا بنا کر نہیں[2]۔

اسی طرح عمر بن عبدالعزیز نے یہ مراسلہ عبدالحمید بن عبدالرحمان کو بھیجا کہ "تم نے جزیہ والوں میں سے جو یہودی، عیسائی اور مجوسی مسلمان ہو گئے ہیں اور جن سے بہت سا جزیہ وصول شدنی ہے ان سے جزیہ لینے کی بابت دریافت کیا ہے، اللہ جل شانہ نے آنحضرتؐ کو اسلام کا داعی بنا کر بھیجا تھا

---

[1] امام مالک، موطا کتاب الزکاۃ باب الجزیہ [2] تاریخ طبری ج ۲ صفحہ ۱۳۷۵۔

نہ کہ محصول وصول کرنے والا، جو کوئی بھی ان ملل میں سے اسلام لے آئے تو اس کے مال پر صدقہ ہے جزیہ نہیں[1]۔ جب مصر کے کاشتکاروں (فلاحوں) نے اسلام قبول کرنا شروع کیا تو مصر کے گورنر شریح بن حیان نے لکھا کہ ذمی رعایا تیزی سے اسلام میں داخل ہوتی چلی جا رہی ہے جس سے جزیہ کی آمدنی میں خسارہ آرہا ہے" تو عمر بن عبدالعزیزؒ نے پھر لکھا کہ "حضور کریمؐ کو خدا نے محصول وصول کرنے والا بنا کر نہیں بھیجا، جو کوئی اسلام لائے اس کا جزیہ معاف کر دو اور حساب کتاب لپیٹ کر میرے پاس چلے آؤ[2]"۔

جزیہ میں وصول شدہ رقم کی مقدار

خراج کی طرح محصول جزیہ سے بھی حکومت کو وافر آمدنی ہوتی تھی، پوری اسلامی مملکت میں لاکھوں غیر مسلم ذمی بسے ہوئے تھے۔ کوئی نیا شہر یا نیا علاقہ فتح ہوتا تو صلح نامہ میں محصول جزیہ کی مقدار بتا کر عہد نامہ میں یہ صراحت کر دی جاتی تھی کہ "اس میں اضافہ نہیں کیا جائے گا"۔ "امیر معاویہؓ نے وردان کو لکھا کہ تمام قبطیوں پر ایک قیراط بڑھا دو، اس نے جواب دیا: کیسے بڑھا دوں جبکہ ان سے عہد کیا جا چکا ہے کہ کچھ نہ بڑھایا جائے گا[3]۔"

"حضرت عمرؓ نے حذیفہ بن یمانؓ اور عثمان بن حنیفؓ کو خانقین کی طرف بھیجا، یہ مسلمانوں کے ابتدائی فتح کیے ہوئے مقامات میں سے تھا، ان دونوں نے

۱۔ ابو یوسف: کتاب الخراج صفحہ ۷۵۔ ۲۔ ابن سعد ج ۵ صفحہ ۳۱۰۔

فیروز شاہ تغلق نے اپنی سوانح عمری میں لکھا ہے کہ "میں نے اپنی بت پرست رعایا کو اسلام قبول کرنے کی ترغیب دی اور منادی کی کہ جو شخص اسلام لائے گا وہ جزیہ سے بری سمجھا جائے گا۔ جب یہ خبر عام ہوئی تو ہندوؤں کے جوق کے جوق حاضر ہو کر اسلام لائے ہر طرف سے روزانہ ہندوؤں کے جتھے کے جتھے آتے اور اسلام قبول کر کے جزیہ سے بری اور انعام و اکرام سے مالا مال ہو کر واپس جاتے تھے"۔ (آرنلڈ: پریچنگ آف اسلام باب نہم ہندوستان میں اشاعت اسلام، بحوالہ ایلیٹ ج ۲ صفحہ ۳۸۵)

۳۔ بلاذری: فتوح البلدان صفحہ ۲۱۷ فتوح مصر۔

ذمیوں کی گردنوں میں مہریں لگائیں اور خراج وصول کیا[1] عراق میں "عثمان بن حنیف رضؓ نے پانچ لاکھ پچاس ہزار علوج (کافر مردوں) کی گردنوں میں مہریں لگائیں اور ان کے زمانہ ولایت میں خراج دس کروڑ درہم تک پہنچ گیا[2]"

"حضرت عمرؓ نے عثمان بن حنیف کو بھیجا اور انھوں نے پانچ لاکھ کافروں کی گردنوں میں ۴۸، ۲۴ اور ۱۲ کے طبقے بنا کر مہریں لگائیں اور جب غرض پوری ہوئی تو مہریں توڑ ڈالیں[3]"

"جزیہ ادا ہو جانے کے بعد ہر شخص کو ایک سیسہ کی مہر دے دی جاتی جس کو وہ اپنی گردن میں باندھ لیتا لیکن خلیفہ ہشام نے باقاعدہ رسیدیں جاری کیں ان میں سے بعض رسیدیں اب تک پائی جاتی ہیں[4]"

اسکندریہ کا جزیہ اٹھارہ ہزار دینار تھا لیکن جب ہشام بن عبدالملک والی ہوا تو ۲۶ ہزار دینار تک پہنچ گیا[5] بیان کیا جاتا ہے کہ حکومت کو محصول جزیہ سے بھی ایک کروڑ چالیس لاکھ دینار وصول ہوتے تھے[6]

ذمی رعایا کو ہر قسم کی آزادی

محصول جزیہ کی ادائی کا معاہدہ ہو جانے کے بعد ذمی رعایا کو اسلامی مملکت کے اندر پوری آزادی حاصل ہو جاتی تھی۔

۱۔ مذہبی آزادی:۔ اسلامی جمہوریت کی سب سے اہم اور نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ غیر مسلموں کو کامل مذہبی آزادی عطا کرتی ہے مذہبی آزادی کا یہ منشور قرآن پاک نے ہی عطا کیا ہے کہ

لَا اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ — دین کے بارے میں جبر نہیں۔
پ۳ بقرہ ۲ ع ۳۴

۱۔ بلاذری: فتوح البلدان صفحہ ۲۷۱ نیز کتاب الخراج صفحہ ۷۳

۲۔ کتاب الخراج صفحہ ۷۳ ۳۔ فتوح البلدان صفحہ ۲۲۳ فتح اسکندریہ

۴۔ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام ج ۱ صفحہ ۱۰۵۱ عنوان جزیہ۔

۵۔ بلاذری: فتوح البلدان صفحہ ۲۲۳ فتح الاسکندریہ۔

۶۔ سیوطی: حسن المحاضرہ صفحہ ۶۰ — ۷۰ —

رسالت مآب سے قرآن مجید مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ غیر مسلموں کے بارے میں آپ باقاعدہ اعلان فرما دیں کہ

لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ — تمہارے لیے تمھارا دین ہے اور میرے لیے میرا دین ہے۔
پ الکافرون ع

یہ آیت مذہبی آزادی کی گویا اساس اور بنیاد ہے۔

مذہبی آزادی کے سلسلے میں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ اسلامی مملکت کے حدود میں غیر مسلموں کو اپنے مذہبی مراسم اور اپنے اپنے طریقوں پر عبادت کرنے کی پوری آزادی حاصل رہتی ہے۔

مملکت شام و فلسطین پر جب مسلمانوں کا اقتدار قایم ہوا تو مسلمانوں کے سپہ سالار اعظم حضرت ابو عبیدہؓ نے وہاں کے غیر مسلم باشندوں کو باقاعدہ یہ تحریری اجازت عطا فرمائی کہ

يَضْرِبُوا نَوَاقِيسَهُمْ فِي أَيِّ سَاعَةٍ شَاءُوا مِنَ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ إِلَّا فِي أَوْقَاتِ الصَّلَوَاةِ[1] — نماز کے اوقات کے سوا غیر مسلم رات دن میں جس وقت چاہیں ناقوس بجائیں۔

حضرت ابو عبیدہؓ نے تہوار کے دن عیسائیوں کو قدیم عمل درآمد کے مطابق مذہبی جلوس نکالنے کی بھی اجازت دی تھی[2]

محمد بن قاسم نے بھی ہندوؤں کو مذہبی آزادی عطا کی تھی "محمد بن قاسم نے تمام غیر مسلموں کے ساتھ رواداری کا سلوک کیا۔ مندروں کے متعلق اس نے کہا کہ ان کی بھی ویسی ہی حفاظت ہونی چاہیئے جیسی کہ عیسائیوں کے گرجا گھروں، یا یہودیوں کے عبادت خانوں اور پارسیوں کے آتش کدوں کی حفاظت ہوتی ہے۔"

"جب برہمن آباد کے لوگوں نے محمد بن قاسم سے استدعا کی کہ انھیں

---

[1] ابو یوسف: کتاب الخراج صفحہ ۸۶۔

[2] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ابو یوسف: کتاب الخراج صفحہ ۸۶ اور صفحہ ۸۰۔

مذہبی آزادی عطا کی جائے تو اس نے اس معاملہ کو عراق کے گورنر حجاج بن یوسف کی خدمت میں لکھ بھیجا اور حجاج بن یوسف نے مندرجہ ذیل جواب لکھ بھیجا:

"چونکہ وہ ہماری اطاعت قبول کر چکے ہیں اور خلیفہ کو محاصل ادا کرنے کا بھی انھوں نے اظہار کیا ہے لہذا اب ان سے کچھ مزید طلب نہ کیا جائے۔ اب چونکہ وہ ہماری حفاظت میں آ گئے ہیں لہذا ان کی جانوں اور مالوں پر دست درازی نہ ہونی چاہیے۔ انھیں اس بات کی اجازت دی جائے کہ وہ اپنے دیوتاؤں کی پرستش کریں۔ کسی شخص کو اس کے اپنے مذہب کی پیروی کرنے سے نہ روکنا چاہیے وہ اپنے گھروں میں جس طرح چاہیں رہیں"[1]

غرض "تمام باشندگانِ ملک کو مذہبی آزادی عطا کی گئی تھی اور عبادت کے معاملہ میں برہمنوں کے جذبات کا بھی خیال رکھا جاتا تھا"[2]

۲ ۔ قانونی آزادی :۔ اسلامی مملکت میں غیر مسلموں کو یہ آزادی بھی حاصل رہتی تھی کہ وہ اپنے مقدمہ کو اپنے حاکموں کے پاس لے جانے اور اپنے مذہب اور قانون کے مطابق فیصلہ کر لینے کی آزادی رکھتے تھے ۔ امام ماوردی لکھتے ہیں کہ

"ذمی اپنے حقوق کا مقدمہ اپنے حاکم کے پاس لے جانے سے نہ روکے جائیں۔ اگر ہمارے حاکم کے پاس مرافعہ کریں تو وہ اسلامی قانون کے ماتحت تصفیہ کرے یا سزائے حدود کے مستوجب ہوں تو ان پر حد جاری کی جائے"[3]

خود ہندوستان میں اسلامی عہد کی تاریخ شاہد ہے کہ جب تک اسلامی عہد کا دور دورہ رہا ہندوؤں کے حقوق اور نزاعات کا تصفیہ پنڈت لوگ کیا کرتے تھے ۔ ڈاکٹر ایشوری پرشاد شہادت دیتے ہیں کہ "قانون کی نظر میں سب برابر تھے ۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں کچھ فرق روا نہیں رکھا جاتا تھا"

---

[1] ۔ ڈاکٹر ایشوری پرشاد : میڈیول انڈیا صفحہ ۶۰ مطبوعہ الہ آباد ۔ [2] ۔ ایضاً صفحہ ۶۰

[3] ۔ ماوردی : الاحکام السلطانیہ باب ۱۳ صفحہ ۱۳۹ ۔

"ایسے تمام مقدمے جو قرضوں، معاہدوں، وراثتوں، جائدادوں اور زناکاری وغیرہ سے متعلق ہوتے تھے ان تمام کا تصفیہ ان ہی کے ہندو اپنی پنچایتوں میں کرتے تھے یا ثالثی مجلس اس کام کو انجام دیتی تھی اور بہترین کارکردگی سے یہ اپنا کام کرتی تھی"[1]

آج بیسویں صدی کی مہذب سے مہذب حکومت بھی اپنے باشندوں کو قانونی آزادی دینے آمادہ نہیں ہے۔ غرض تدبر اور حکمت عملی سے پوری اسلامی مملکت میں امن و امان اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کا دلچسپ سماں دکھائی دیتا تھا، ذمی رعایا کو جو حقوق حاصل تھے ان پر ایک علحدہ مقالہ ہی لکھا جا سکتا ہے۔

محصول جزیہ کی ادائی سے انکار

اگر ذمی محصول جزیہ نہ دیں تو وہ باغی یا قتل کے قابل نہیں بلکہ صرف معاہدہ شکن سمجھے جاتے تھے۔ امام ماوردیؒ نے اس مسئلہ کو جس عمدہ طریقہ اور خوش اسلوبی سے بیان کیا ہے اسے پڑھ کر ہم داد دیے بغیر نہیں رہ سکتے چنانچہ امام صاحب لکھتے ہیں "ذمی نقض عہد کے بعد جب تک قتال نہ کریں ان کو قتل کرنا، ان کا مال لوٹنا یا ان کے بال بچوں کو گرفتار کرنا جائز نہیں، اس سے پہلے ضروری ہے کہ ان کو امن کے ساتھ دارالاسلام سے نکال کر دارالحرب کے قریب ترین مقام میں پہنچا دیا جائے اگر خود نہ جائیں تو زبردستی نکالا جائے"[2]

اہل عہد

اسلامی مملکت کی حدود میں علاوہ مسلمانوں کے ایک تو ذمی رعایا ہوتی جو دارالاسلام میں مستقل سکونت رکھتی تھی لیکن غیر ممالک کے باشندے بھی ——— جیسا کہ آج کل ایک ملک کے باشندے دوسرے ملک میں پاسپورٹ لے کر آیا جایا کرتے ہیں ——— دارالاسلام میں تجارت وغیرہ کی غرض سے آیا جایا کرتے تھے اور ان کو مستامن کہا

---

[1] ڈاکٹر ایشوری پرشاد: میڈیول انڈیا ص ۶۶ سندھ پر عربوں کا قبضہ
[2] ماوردی: الاحکام السلطانیہ باب ۱۳ ص ۱۴۰۔

اہل عہد کہا جاتا تھا" اہل عہد دارالاسلام میں آکر جان و مال سے محفوظ ہو کر چار مہینے تک بغیر جزیہ اور سال بھر جزیہ دے کر رہ سکتے ہیں۔ ان دونوں مدتوں کے درمیان کے متعلق اختلاف ہے۔ ذمیوں کی طرح ان کو بھی نقصان پہنچانے کی اجازت نہیں۔ ذمیوں سے غیروں کا دفاع بھی ضروری ہے۔ عاقل، بالغ مسلمان کسی حربی کو امان دے تو عام مسلمانوں پر اس کی پابندی ضروری ہے۔ امان دینے میں عورت، مرد، غلام اور آزاد سب برابر ہیں[1]

جزیہ کے محصول کا ادا نہ کرنا

"ذمی جزیہ دینا چھوڑ دیں تو یہ نقض عہد ہے امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک اس صورت میں دارالحرب جانے سے پہلے نقض عہد نہیں ہے اور قرضوں کی طرح جبراً وصول کیا جائے گا[2] یہ اس صورت میں ہے جبکہ ذمی مالدار ہوں اور محصول جزیہ ادا کرنے کی قابلیت رکھتے ہوں لیکن ذمی اگر نادار ہوں اور محصول ادا نہ کر سکتے ہوں تو انھیں کسی قسم کی سزا مثلاً کوڑے لگانا یا دھوپ میں بٹھانا اسلامی اصول حکمرانی کے خلاف ہے۔

"حضرت عمرؓ جب شام سے واپس آ رہے تھے تو راستہ میں چند لوگوں کو دیکھا کہ دھوپ میں کھڑے ہیں اور ان کے سر پر تیل ڈالا جا رہا ہے حضرت عمرؓ نے پوچھا کہ یہ کیا ماجرا ہے؟ معلوم ہوا کہ ان لوگوں کے ذمہ جزیہ تھا اور انھوں نے ادا نہیں کیا اس لیے انھیں یہ سزا دی جا رہی ہے تاکہ وہ ادا کریں۔ حضرت عمرؓ نے دریافت فرمایا کہ آخر وہ کہتے کیا ہیں؟ اور ان کا عذر کیا ہے؟ لوگوں نے کہا کہ ناداری۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ چھوڑ دو اور اگر ادا کرنے کی ان میں قابلیت نہ ہو تو انھیں اس کی تکلیف نہ دو، میں نے رسول کریمؐ کو یہ فرماتے سنا کہ لوگوں کو تکلیف نہ دو کیونکہ جو لوگ دنیا میں لوگوں کو عذاب دیتے ہیں قیامت کے دن

---

[1] ماوردی: الاحکام السلطانیہ باب ۱۳ صفحہ ۱۳۹ جزیہ

[2] ماوردی: الاحکام السلطانیہ باب ۱۳ صفحہ ۱۴۰ جزیہ

اللہ انھیں عذاب دے گا، پھر حضرت عمرؓ نے انھیں چھوڑ دینے کا حکم دیا اور انھوں نے اپنا راستہ لیا۔[1]

یونان اور روما میں اگر کوئی شخص محصول ادا نہ کرتا تو اس کو بیچ ڈالا جاتا تھا، مورخین کا بیان ہے کہ "آزاد اشخاص فروخت کر دیئے جاتے تھے اور محصول سے بچنے کی خاطر تاکستانوں کو اکھیڑ کر پھینک دیا جاتا تھا اور عمارتیں تباہ کر دی جاتی تھیں۔[2]

اس فصل کی ابتدا میں ہم نے بتایا تھا کہ جزیہ کے محصول کا رواج ایران اور روم کی سلطنتوں میں بھی تھا، جزیہ کی یہ فصل ایک عیسائی مورخ جرجی زیدان کے اس بیان پر ختم کی جاتی ہے:

"جزیہ کا جو محصول ایرانی اور رومی سلطنت کی رعایا، مسلمانوں کو ادا کرتی تھی وہ ان مجموعی محصولوں کی مقدار سے بہت ہی کم تھی جو وہ ایران یا روم کی سلطنت کو ادا کیا کرتے تھے۔[3]

جزیہ کے محصول کا جو مصرف تھا اور پھر حکومت کی جانب سے ذمی محتاجوں اور اپاہجوں کا جو سماجی تحفظ کیا گیا تھا سرکاری مصارف میں اس کا تذکرہ کیا جائے گا۔

(۸) محصول درآمد

اسلامی مملکت کی آمدنی کا ایک اور ذریعہ محصول درآمد (عُشر) تھا محصول جزیہ کی طرح، محصول درآمد بھی کچھ نیا نہ تھا" یہ جاہلیت میں بھی لیا جاتا رہا، عرب اور عجم کے بادشاہ بھی سب اس طرح کا محصول وصول

۱؎ ۔ ابویوسف: کتاب الخراج صفحہ ۷۲، نیز کتاب الاموال صفحہ ۴۲ نمبر ۱۱۰ و ۱۱۱

۲؎ ۔ فنلے: ہسٹری آف گریس ج ا ص ۴۳۳ و ۳۴ ۳؎ جرجی زیدان: تاریخ التمدن الاسلامی ج ا صفحہ ۷۰۱ ۔

کیا کرتے تھے۔ ان کی یہ عادت تھی کہ تاجروں سے جب وہ ان کی سرحدوں سے گزرتے تو ان کے مال کا دسواں حصہ (عُشر) لیتے تھے[1] مکہ والے بھی دیگر ہمسایہ قوموں کی طرح محصول درآمد وصول کرتے تھے[2]۔

اسلامی معاشیات آزاد تجارت کی حامی ہے کہ ایک ملک کی پیداوار بے روک ٹوک دوسرے ملک کو جاتی آتی رہے۔ رسالت مآبؐ اور حضرت صدیق اکبرؓ کے زمانہ میں کسی قسم کا محصول درآمد نہیں لیا جاتا تھا لیکن حضرت فاروق اعظمؓ کے عہد میں اسلامی مملکت کی حدیں بڑھتے بڑھتے روم اور ایران کی سلطنتوں سے ملیں تو سیاسی اور معاشی مصلحتوں کی بنا پر حضرت عمرؓ کو اپنی پالیسی میں اس لیے تبدیلی کرنی پڑی کہ اسلامی مملکت کے مسلم باشندے یا ذمی اجنبی ملکوں میں تجارت کی غرض سے جاتے تو ان کے تجارتی مال پر محصول لگایا جاتا تھا، حضرت عمرؓ کو بھی اسی قسم کا محصول درآمد اجنبی ملکوں کی رعایا پر عائد کرنا پڑا۔ غرض کہ "اسلام میں پہلے پہل حضرت عمرؓ ہی نے محصول درآمد (عُشر) عائد کیا"[3]۔

محصول درآمد کی ابتداء

ذیل کے دو واقعات سے اسلامی مملکت میں محصول درآمد کی ابتدا پر روشنی پڑے گی۔

پہلا واقعہ:۔ "اہل حرب میں سے قوم منبج نے جو دریا پار رہتی تھی حضرت عمرؓ کو لکھا کہ آپ اپنی سرزمین پر ہمیں تجارت کرنے کی اجازت دیں اور ہم سے عشر وصول کریں، حضرت عمرؓ نے رسول کریمؐ کے صحابہؓ سے مشورہ لیا اور سب نے اس کا مشورہ دیا۔ اہل حرب میں سے عشر ادا کرنے والے یہی پہلے لوگ ہیں"[4]۔

دوسرا واقعہ:۔ بصرہ کے گورنر حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ نے حضرت عمرؓ کو لکھا مسلمان تاجروں سے حربی علاقہ میں عشر لیا جاتا ہے، حضرت عمرؓ نے انھیں

١۔ کتاب الاموال صفحہ ۵۲۹ نمبر ۱۶۳۷۔ ٢۔ مقالہ کے پہلے باب میں صفحہ ۷۰ پر تفصیل گزر چکی۔
٣۔ کتاب الاموال صفحہ ۵۳۴ نمبر ۱۶۶۵۔
٤۔ ابو یوسف: کتاب الخراج صفحہ ۷۰، فصل فی العشور۔

لکھا کہ جس طرح وہ مسلمان تاجروں سے لیا کرتے ہیں اسی طرح تم بھی ان سے عشر لیا کرو۔[1]

حضرت عمرؓ نے خشکی اور تری سے آنے کے راستوں مثلاً مصر، شام اور عراق وغیرہ کی سرحدوں پر باقاعدہ محصول خانے قائم کیے تھے۔

محصول درآمد کی تائید میں فقہا یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ حکومت اس محصول کے معاوضہ میں ان کے تجارتی مالوں کی حفاظت کرتی ہے چنانچہ شمس الائمہ سرخسی نے لکھا ہے کہ "عاشر وہ ہے جس کو امام نے تاجروں سے صدقات وصول کرنے اور انھیں چوروں کی مقاومت سے بچانے کے لیے راستہ پر متعین کیا ہو"[2]

ابتدا میں صرف اجنبی مملکت کے باشندوں (حربیوں) سے عشر لیا جاتا تھا۔ یہ بات ظاہر ہے کہ تاجر اپنے تجارتی مال کا جو محصول کرتا ہے وہ اپنی جیب سے نہیں بلکہ خریداروں کی جیب سے ادا کرتا ہے۔ اس طرح جب حربی تاجروں سے محصول وصول کیا جائے اور ذمیوں یا مسلمان تاجروں سے نہ لیا جائے تو لازمی ہے کہ ذمیوں اور مسلمانوں کا مال تو بک جائے گا اور حربیوں کو یا تو ذمی اور مسلمان تاجر جس قیمت پر بیچ رہے ہیں اسی قیمت پر بیچنا پڑے گا یا ان کا مال نہ بکے گا کیونکہ مماثل اشیا کی کسی بازار میں بھی دو قیمتیں نہیں ایک ہی قیمت ہو سکتی ہے چونکہ حربی تاجروں کا نقصان ہوتا تھا اس لیے حضرت عمرؓ نے ذمی تاجروں اور مسلم تاجروں پر درآمد کا بھی محصول لگایا۔ خود اپنی ہی رعایا سے محصول درآمد لینے کا رواج قدیم زمانہ میں بھی تھا۔ "امام مالکؒ کہتے ہیں کہ میں نے ابن شہاب زہریؒ سے پوچھا کہ حضرت عمرؓ نے ذمیوں سے کیوں محصول درآمد وصول کیا؟ انھوں نے یہ جواب دیا کہ ان سے جاہلیت میں بھی یہ محصول لیا جاتا تھا اور حضرت عمرؓ نے بھی ان پر اسی محصول کو

---

[1] ابو یوسف: کتاب الخراج صفحہ ۷۰ فصل فی العشور۔

[2] مبسوط السرخسی ج ۲ صفحہ ۱۹۹ باب العشر۔

برقرار رکھا[1] اس محصول کی ادائی پر دارالحرب کے باشندوں کو دارالاسلام میں نہ صرف تجارت کا حق بلکہ سامان اور جان کی حفاظت کا حق بھی حاصل ہوجاتا تھا۔

ذمیوں پر محصول جزیہ کے علاوہ مزید محاصل کا لزوم

مسلم قانون دانوں نے محصول درآمد کے سلسلے میں اس بات پر بھی بحث کی ہے کہ آیا حکومت ذمیوں سے جزیہ کے علاوہ دوسرے محاصل وصول کر سکتی ہے یا نہیں؟ جبکہ یہ وعدہ کیا گیا ہے کہ حکومت محصول جزیہ کے علاوہ اور کوئی مزید رقم ان سے وصول نہ کرے گی۔ امام مالکؒ نے بتایا ہے کہ "جب تک ذمی اپنے ان شہروں میں رہیں جہاں ان سے صلح ہوئی تو ان پر جزیہ کے سوا ان کے مال میں سے اور کچھ نہیں لیا جائے گا لیکن اگر وہ تجارت کے لیے مسلمانوں کے شہروں میں چکر لگائیں تو اُن کے تجارتی سامان پر محصول درآمد (عشر) لیا جائے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ صلح اس بات پر ہوئی تھی کہ ذمی اپنے اپنے شہروں میں رہیں گے اور دشمنوں سے ان کی حفاظت کی جائے گی جب وہ اپنے شہر سے باہر جائیں تو صلح نامہ سے تجاوز ہوگا۔ اس طرح ذمی تجارت کے اغراض کے لیے اپنے شہر سے دوسرے شہر کو جائیں مثلاً اگر مصر والے شام جائیں یا شام والے عراق جائیں یا عراق والے مدینہ یا یمن کو جائیں تو ان سے عشر لیا جائے گا"

"اگر ان میں سے کوئی ایک ہی سال میں کئی بار (تجارتی مال لے کر) دارالاسلام آئے تو ہر بار اس سے عشر وصول کیا جائے گا۔ اس وجہ سے کہ اس بات پر نہ تو ان سے صلح ہوئی تھی اور نہ ان سے اس قسم کی کوئی شرط کی گئی تھی کہ (دوبارہ تجارتی مال لانے پر ان سے محصول نہ لیا جائے گا)"[2]

ذمیوں اور مسلمانوں کے محصول درآمد کی مقدار

حربیوں کی طرح ذمیوں پر بھی

---

[1] امام مالک: موطا، کتاب الزکات باب الجزیہ

[2] امام مالک: موطا، کتاب الزکات باب الجزیہ

محصول درآمد (عشر) لگایا گیا لیکن چونکہ ذمی پہلے ہی سے ایک ٹیکس جزیہ کا محصول دیتے تھے اس لیے ان پر نصف عشر $\frac{1}{20}$ عائد کیا گیا۔ اور چونکہ مسلمانوں پر محصول جزیہ کے مقابلے میں محصول زکات عائد تھا نیز ان کے مویشیوں کی بھی زکات لی جاتی تھی اس لیے ان پر ربع عشر $\frac{1}{40}$ عائد کیا گیا۔

حضرت عمرؓ نے ابو موسیٰ اشعریؓ بصرہ کے گورنر کو جو مراسلہ لکھا تھا اس میں مقدار محصول کی بھی یہ صراحت کر دی تھی کہ "اہل ذمہ سے نصف عشر اور مسلمانوں سے ہر چالیس درہم میں ایک درہم لیا جائے — اور اگر مال دو سو سے کم ہو تو اس میں کوئی محصول عائد نہ ہوگا اور جو مال اس سے زیادہ ہو تو اسی حساب سے[1]"

"زیاد بن حدیر کہتے ہیں کہ مجھے حضرت عمرؓ نے عشر وصول کرنے کے لیے مقرر کیا اور حکم دیا کہ حربی تاجروں سے عشر (دسواں حصہ) وصول کروں اور ذمی تاجروں سے نصف عشر (بیسواں حصہ) اور مسلمان تاجروں سے ربع عشر (چالیسواں حصہ) وصول کروں[2]"

اس نوبت پر ممکن ہے کہ یہ سوال پیدا ہو کہ یہ محصول مسلمان تاجروں سے کم اور حربیوں سے کیوں زیادہ لیا جاتا تھا؟ اس کی کچھ صراحت اوپر کی جا چکی ہے واضح ہو کہ عشر اس لحاظ سے مقرر کیے گئے تھے کہ آیا محصول ادا کرنے والے اس عشر کے علاوہ اور بھی کچھ محصول حکومت کو ادا کرتے ہیں یا نہیں۔ اگر حضرت عمرؓ حربیوں ہی کی طرح ذمیوں پر بھی عشر عائد کرتے تو یہ کہا جا سکتا کہ اس معاملہ میں مذہبی تعصب برتا گیا لیکن چونکہ ان پر جزیہ کے محصول کا بار پڑتا تھا اس لیے آپ نے اس کا خیال کر کے نصف عشر مقرر کیا اور اگر حضرت عمرؓ اپنی مملکت کے باشندوں کو ترجیح بھی دیتے تو یہ کوئی نئی بات نہ ہوتی ابھی حال تک برطانوی ہند میں

---

[1] ابو یوسف: کتاب الخراج صفحہ ۷۸۔

وینس میں بھی ملکیوں کے مقابلہ میں غیر ملکیوں سے دگنا محصول درآمد لیا جاتا تھا (جدید قانون بین الممالک مولفہ نیس صفحہ ۷۷۴ مترجمہ ڈاکٹر حمید اللہ پروفیسر قانون بین الممالک جامعہ عثمانیہ)

[2] کتاب الاموال صفحہ ۵۳۳ نمبر ۱۶۵۹ نیز کتاب الخراج صفحہ ۷۸۔

انگریزوں کا راج تھا جنگ سے پہلے انگلستان یا دوسری برطانوی نوآبادیات سے جو مال ہندوستان آتا تھا اس پر جاپان اور جرمنی وغیرہ کے مال کے مقابلہ میں کم محصول لگایا جاتا تھا تاکہ ہندوستان میں انگریزی تجارت کو اور ملکوں کی تجارت کے مقابلہ میں ترجیح رہے، لیکن حضرت عمرؓ کے پیش نظر یہ بات تھی کہ مسلمانوں کے مالوں پر چونکہ زکات ہی عاید ہو سکتی تھی اس لیے آپ نے ان پر اس قسم کے مال میں بھی زکات ہی عائد کر کے ۱/۴۰ چالیسواں حصہ وصول کرنا مقرر کیا" اس بارے میں حضرت عمرؓ کا طریقہ یہ تھا کہ وہ مسلمانوں سے زکات اور اہل حرب سے پورا عشر (دسواں حصہ) لیتے تھے کیونکہ وہ بھی مسلمان تاجروں سے جبکہ مسلمان ان کے شہروں میں آتے اسی کے مثل وصول کرتے تھے اور جو طریقہ اختیار کیا وہ صاف طور سے واضح ہے۔[1]

حضرت عمرؓ کے بعد کا عمل درآمد

حضرت عمرؓ کے بعد بھی محصول درآمد کا یہی عمل درآمد رہا چنانچہ زریق بن حیان الدمشقی بیان کرتے ہیں کہ ان کو ولید و سلیمان اور عمر بن عبدالعزیزؓ نے لکھا کہ تمھارے پاس سے جو کوئی مسلمان گذرے تو اس کے تجارتی مال میں جو ظاہر ہو اس میں سے ہر چالیس دینار میں سے ایک دینار وصول کرو اور جو چالیس دینار سے کم ہو تو اسی حساب سے بیس دینار تک اور اگر اس سے تہائی دینار بھی کم ہو تو اس مال کو چھوڑ کر مال والے سے کچھ نہ لو۔ اور تمھارے پاس سے جو کوئی ذمی گزرے تو اس کے تجارتی مال میں سے ہر بیس دینار پر ایک دینار وصول کرو اور جو کم ہو تو اسی حساب سے بیس دینار تک اور جو اس سے تہائی دینار بھی کم ہو تو اس مال کو چھوڑ دو اور اس سے کچھ وصول نہ کرو، اور سال تمام کے لیے ایک رسید لکھ دو۔[2]

---

[1] ۔ کتاب الاموال صفحہ ۵۳۱ نمبر ۱۶۵۱ ۔ [2] ۔ امام مالک: موطا باب زکوٰۃ العروض نیز کتاب الاموال صفحہ ۵۳۴ نمبر ۱۶۶۲ نیز امام شافعی کتاب الام ج ۲ کتاب زکوٰۃ التجارۃ۔

خاص حاشیئیں

محصول درآمد صرف تجارت کے سامان پر لیا جاتا تھا پھر سامان تجارت بھی اگر ایک خاص مقدار سے کم ہوتا تو وہ محصول کی ادائی سے مستثنیٰ قرار پاتا۔ اس کی کچھ تفصیل تو حضرت عمرؓ اور عمر بن عبدالعزیزؒ کے فرامین میں گذر چکی مزید تفصیل کے سلسلہ میں قاضی ابو یوسفؒ لکھتے ہیں کہ "اور اگر سامان تجارت کی قیمت دو سو درہم سے کم ہو تو اس میں سے کچھ نہ لیا جائے۔ اور اسی طرح اگر اس کی قیمت بیس مثقال ہو تو اس پر بھی کچھ نہ لیا جائے گا"[1]

میوے اور ایسی اشیا جو جلد خراب ہو جاتی ہوں وہ بھی محصول درآمد سے مستثنیٰ تھیں[2]

سال بھر میں صرف ایک ہی بار محصول درآمد وصول کیا جاتا تھا یعنی تاجر کو یہ حق حاصل تھا کہ جہاں چاہے اپنے مال تجارت کو لے جائے اس سے دوبارہ محصول نہیں لیا جاتا تھا[3]

اگر حربی تاجر بھی سال بھر تک دارالاسلام کے مختلف صوبوں میں گھومتا رہتا تو اس سے بھی محصول ایک ہی مرتبہ لیا جاتا اور سال بھر تک ادائی سے مستثنیٰ رہتا تھا۔ لیکن جب وہ دارالاسلام چھوڑ کر دارالحرب چلا جاتا اور پھر وہاں سے مال تجارت لیکر آتا خواہ مال وہی کیوں نہ ہو جو پہلے لایا تھا تو دوبارہ اس کو محصول درآمد ادا کرنا پڑتا[4]

شمس الائمہ سرخسی کہتے ہیں کہ حربی دارالحرب میں واپس جاکر پھر دوبارہ آئے تو پھر عشر لیا جائے گا چاہے اس کی واپسی اسی دن کیوں نہ ہو۔

أَلَا تَرَىٰ أَنَّهُ فِي الدُّخُولِ يَحْتَاجُ إِلَىٰ اسْتِئْمَانٍ جَدِيدٍ[5]

کیا تم نہیں دیکھتے کہ داخلے کے لیے اس کو جدید امان لینی پڑتی ہے۔

---

[1] ابو یوسف: کتاب الخراج صفحہ ۷۸ فصل فی العشور [2] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو کتاب الاموال صفحہ ۵۳۵
[3] تفصیل کتاب الخراج صفحہ ۷۸ فصل فی العشور۔
[4] تفصیل ابو یوسف: کتاب الخراج صفحہ ۷۷ فصل فی العشور۔
[5] مبسوط السرخسی ج ۲ صفحہ ۲۰۱ باب العشر۔

اسی طرح دارالاسلام میں اگر شراب وغیرہ بھی برآمد ہو تو اس پر محصول درآمد لیا جائے گا۔" اہل ذمہ میں سے کوئی عاشر کے پاس سے شراب یا سور لیکر گذرے تو اہل ذمہ اس کی قیمت کا تعین کریں گے اور ان سے نصف عشر لیا جائے گا۔ اسی طرح حربی تاجر سور یا شراب لیکر گزریں تو پہلے ان کی قیمت کا تعین کرا کے پھر ان سے عشر لیا جائے گا۔[1]"

"دارالاسلام میں ایک مقام سے دوسرے مقام پر منتقل ہونے والے مالوں پر (دوبارہ اسی مال میں) عشر لینا شرعاً حرام ہے۔ نہ اس میں اجتہاد کی گنجایش ہے اور نہ اسے عدل و انصاف سے کچھ تعلق، کہیں کہیں ظالم ایسا کیا کرتے ہیں۔ رسول کریمؐ سے مروی ہے کہ سب سے بڑے لوگ محصول جمع کرنے والے عشار ہیں۔[2]"

ایک رعایت یہ بھی کی جاتی ہے کہ صرف کھلی ہوئی اشیاء پر محصول درآمد لیا جاتا اور اسباب کی تلاش میں سختی نہ برتی جاتی تھی خود حضرت عمرؓ نے کروڑ گیری کے حکام کو اس کی تاکید کی تھی چنانچہ ابن حدیر کہتے ہیں کہ "پہلے پہل مجھ ہی کو حضرت عمرؓ نے عشور وصول کرنے کے لیے روانہ کیا اور مجھے حکم دیا کہ کسی کی تفتیش نہ کروں۔[3]"

اسلامی حکومت کی مشنری جس تیزی سے چلتی تھی اس کے ثبوت میں صرف یہ واقعہ بیان کر دینا کافی ہوگا" ایک عیسائی اپنا گھوڑا فروخت کرنے روم سے دارالاسلام آیا اور عاشر نے اس سے عشر وصول کیا پھر مول نہیں بنا تو وہ اس کو لیکر واپس ہوا تاکہ دارالحرب میں داخل ہوئے عاشر نے اس سے پھر عشر طلب کیا۔ اس لئے کہا کہ اگر تم جب بھی میں

---

[1] - ابو یوسف: کتاب الخراج صفحہ ۷۰ فصل فی العشور نیز کتاب الاموال صفحہ ۵۱ تا ۵۲ باب: اخذ الجزیۃ من الخمر والخنزیر – صفحہ ۲۳۰

[2] - ماوردی: الاحکام السلطانیہ باب ۱۵ صفحہ ۱۹۰ نیز ابو یعلی الاحکام السلطانیہ

[3] - ابو یوسف: کتاب الخراج صفحہ ۷۰ فصل فی العشور –

ادھر سے گزروں یونہی عشر لیا کرو گے تو پھر میرے لیے کیا بچے گا؟ یہ کہہ کے اس نے گھوڑے کو اس کے پاس چھوڑا اور خود مدینہ آیا، حضرت عمرؓ کو دیکھا کہ مسجد میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے ایک مراسلہ دیکھ رہے ہیں۔ وہ مسجد کے دروازہ پر ٹھیرا رہا یہاں تک کہ حضرت عمرؓ تشریف لائے، اس تاجر نے کہا کہ میں ایک نصرانی شیخ ہوں۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ میں بھی تو ایک حنیفی شیخ ہوں اچھا کہو تم کیا کہنا چاہتے ہو؟ اس نے پورا واقعہ بیان کیا۔ حضرت عمرؓ لوٹ آئے اور پہلے کی طرح مشغول ہو گئے۔ اس نے سمجھا کہ شاید آپ نے اس کی بات پر توجہ نہ فرمائی وہ دوبارہ عشر ادا کرنے کی غرض سے لوٹ آیا جب وہ عاشر کے پاس پہنچا تو کیا دیکھتا ہے کہ حضرت عمرؓ کا مراسلہ اس کے آنے سے پہلے ہی آچکا ہے لکھا تھا کہ جب تم ایک مرتبہ وصول کر چکے ہو تو اب دوبارہ وصول نہ کرو۔[1]

اسلامی محصول درآمد کی ایک اہم خصوصیت

لچک :۔ اسلامی محصول درآمد میں خاص لچک رکھی گئی ہے۔ گو عام طور پر حربیوں سے عشر (دسواں حصہ) بطور محصول درآمد لیا جاتا تھا۔

جیسا کہ سائب بن یزید کا بیان ہے کہ "میں عبداللہ بن عتبہ بن مسعود کے ساتھ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں مدینہ کے بازار کا عامل تھا اور ہم نبط والوں سے دسواں حصہ (عشر) لیتے تھے[2] لیکن اس کے باوجود خود حضرت عمرؓ نے گیہوں اور تیل کے محصول کی معینہ مقدار میں نصف کی حد تک اس لیے کمی کر دی کہ مدینہ میں اس کی درآمد بڑھے چنانچہ حضرت عمرؓ کے صاحبزادے عبداللہؓ کا بیان ہے کہ "حضرت عمرؓ نبط کے کافروں سے گیہوں اور تیل کا بیسواں حصہ لیتے تھے تاکہ مدینہ میں اس کی درآمد زیادہ ہو اور قطنیہ سے دسواں حصہ لیتے تھے"[3]

---

[1] ۔ مبسوط السرخسی ج ۲ صفحہ ۲۰۱ باب العشر نیز کتاب الاموال صفحہ ۵۳۸ نمبر ۱۶۸۳۔ نیز ابویوسف: کتاب الخراج صفحہ ۷۹۔ [2] امام مالک: موطا کتاب الزکوٰۃ عشور اھل الذمۃ نیز کتاب الاموال صفحہ ۵۳۳ نمبر ۱۶۵۹۔ [3] امام مالک موطا کتاب الزکوٰۃ عشور اھل الذمۃ نیز کتاب الاموال صفحہ ۵۳۳ نمبر ۱۶۶۰۔

آزاد تجارت

اس فصل کی ابتدا میں یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ اسلامی مصلحت عامہ کا اقتضا آزاد تجارت ہے لیکن اگر دوسری حکومتیں اس کی اجازت نہ دیں تو پھر وہ حکومتیں مسلمانوں اور اسلامی مملکت کے ساتھ جو پالیسی اختیار کریں گی ٹھیک وہی پالیسی اسلامی مملکت بھی اختیار کرے گی چنانچہ ذیل میں فقہاء اسلام کے مسلک کی صراحت مناسب معلوم ہوتی ہے سمجھنا چاہیے کہ اسلامی مملکت کی یہی پالیسی ہو گی۔ "اگر حربی دو سو درہم یا (زیادہ) کا مال لیے ہوئے گزرے اور یہ معلوم نہ ہو کہ وہ لوگ ہم سے کتنا لیتے ہیں تو عاشر کو اس سے عُشر یعنے دسواں حصہ وصول کرنا چاہیے حضرت عمرؓ کے اس قول کے مطابق کہ اگر تم یہ معلوم نہ کر سکو کہ حربی ہم سے کتنا وصول کرتے ہیں تو تم ان سے دسواں حصہ وصول کرو"

"اگر یہ بات عاشر کو معلوم ہو کہ حربی ہم سے چالیسواں حصہ لیتے ہیں تو ہمارا عاشر بھی اتنا ہی وصول کرے گا"

"اگر یہ معلوم ہو کہ وہ ہم سے کل مال لے لیتے ہیں تو ہمارا عاشر حربی سے کُل مال نہیں لے گا کیونکہ یہ تو بد عہدی ہے"

"اگر حربی ہم سے کچھ نہ لیتے ہوں تو ہمارا عاشر بھی ان سے کچھ نہ لے گا تاکہ وہ لوگ بھی ہمارے تاجروں سے لینا چھوڑ دیں اور نیز ہم تو اخلاق کریمہ برتنے کے زیادہ سزاوار ہیں"[1]

"اس تفصیل سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ کروڑ گیری کا تعلق اسلامی معاشیات سے نہیں بلکہ سیاسیات سے ہے حتیٰ کہ دنیا کی حکومتیں اسلامی حکومتوں کی رعایا سے کروڑ گیری کے نہ لینے کا معاہدہ کر لیں تو سب سے پہلے بین الاقوامی تجارت کو آزاد قرار دینے پر جو لوگ دستخط کریں گے وہ مسلمان ہوں گے۔ ٹھیک جو حال غلامی میں ہوا کہ دنیا کی قومیں مسلمانوں کو غلام بنا رہی تھیں ہم بھی بنا رہے تھے انھوں نے مل کر خواہش کی کہ آئندہ سے مسلمانوں کو غلام نہ بنایا جائے گا تو

---

[1] ہدایہ ج اکتاب الزکواۃ۔

خلیفہ وقت نے شیخ الاسلام کے مشورہ سے

نَحْنُ اَحَقُّ بِمَکَارِمِ الاَخْلَاقِ ہم اخلاق کریمہ برتنے کے زیادہ سزاوار ہیں

کہتے ہوئے ایک مقدس معاہدہ پر دستخط کر دیے اور آج بھی "غلام تجارت" کو آزاد کرنے پر غیر مسلم حکومتیں اگر رضامندی ظاہر کریں تو

اِنْ کَانُوْا لَایَاْخُذُوْنَ اَصْلاً لَانَاْخُذُ اگر وہ کچھ بھی نہ لیتے ہوں تو ہم بھی نہ لیں گے۔

پر عمل کرنے کے لیے ہمارے پاس پرانا دستور موجود ہے[1]

غرض حمل و نقل کے ذریعوں کی ترقی سے جس طرح بین الاقوامی سکہ کو رواج دینے کی کوششیں اور تحریکیں جاری ہیں اسی طرح درمیانی تجارت کی مزاحمتوں کو دور کرنے سے متعلق کئی کانفرنسیں اس صدی میں ہو چکی ہیں ظاہر ہے کہ یہ ایک نہایت ہی قابل تعریف مقصد ہے گو جنگ سے ایسی تحریکوں کی کامیابی میں عرصہ لگے گا تاہم پھر بھی "ان تمام تحریکوں سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ ایک زمانہ ضرور ایسا آنے والا ہے ــــ خواہ اب سے کتنے ہی سال بعد سہی ــــ جبکہ تجارتی اغراض کے لیے دنیا ایک معاشی خطہ بن جائے گی اور قومیں اشیاء درآمد پر محض معاشی اغراض کے لیے محصول عاید کریں گی اور مروجہ کروڑگیری کے طریقے سے جو اخراجات لاحق ہو رہے ہیں وہ موقوف کر دیں گی"[2]

(۹) آمدنی کی بعض غیر اہم مدیں

(الف) رائلٹی

حکومت کی آمدنی کا ایک اور ذریعہ رائلٹی بھی ہے جو معدن کے اجارہ دار حکومت کو

---

[1] پروفیسر مناظر احسن صاحب گیلانی: اسلامی معاشیات صفحہ ۳۵۵۔

[2] آرمیٹیج اسمتھ: پرنسپلز اینڈ میتھڈز آف ٹیکسیشن باب ۵ صفحہ ۸۶۔

ادا کرتے ہیں۔ رائلٹی کے متعلق تقسیم دولت کے باب میں وضاحت کی جا چکی ہے[1]
معدنوں سے حکومت کو کتنی رقم لینی چاہیے اس مسئلہ میں فقہاء کا اختلاف ہے
کسی نے پانچواں حصہ بتایا تو کسی فقیہہ نے چالیسویں حصے کے لینے کی رائے دی
دلیل میں یہ نظیر پیش کی گئی ہے کہ "عمر بن عبدالعزیزؒ نے معدنوں سے زکوٰۃ
میں چالیسواں حصہ لیا"[2] بخاری میں ہے کہ "عمر بن عبدالعزیزؒ معدنوں کی پیداوار
میں ہر دوسو درہم (کے مال) پر پانچ درہم لیا کرتے تھے"[3] لیکن حقیقت یہ ہے کہ
معدن سے کس قدر رائلٹی وصول کی جائے گویا بالکل ایک فنی مسئلہ ہے
مختلف معدنوں کے حالات مختلف ہوتے ہیں کانیں یکساں نہیں ہوتیں بعض
اچھی ہوتی ہیں اور بعض خراب، بعض معدن قیمتی دھاتوں کے ہوتے ہیں اور
بعض معمولی دھاتوں کے۔ "کن کانوں سے محصول لیا جائے اور کتنا لیا جائے
اس کے متعلق اگر کسی پہلے امام کا حکم موجود نہ ہو تو اور حاکم وقت اہل اجتہاد
سے ہو تو محصول لگانے یا نہ لگانے کے متعلق اور محصول کی مقدار کے بارے میں
اپنے اجتہاد اور رائے سے فیصلہ کرے۔ اگر کسی پہلے حاکم یا امام کا اپنے
اجتہاد سے نافذ کردہ حکم موجود ہو تو وہ محصول لگانے کی حد تک بعد میں بھی
معتبر ہوگا مگر محصول کی مقدار کے متعلق پہلا حکم معتبر نہیں ہوگا کیونکہ جنس کا
حکم موجودہ معدن کے لحاظ سے ہے اور مقدار محصول کا حکم معدن مفقودہ
کے لحاظ سے ہے"[4]

"امام مالک کہتے ہیں کہ کانیں (معدن) مثل زراعت کے ہیں
ان سے ایسا ہی محصول لیا جائے جیسا کہ زراعت سے لیا جاتا ہے اور
جس دن شئے معدن سے نکالی جائے اسی دن اس سے (رائلٹی) وصول
کی جائے اور اس میں سال تمام ہونے کا انتظار نہ کیا جائے اسی طرح

۱ـ تقسیم دولت باب ۴ ج ا صفحہ ۳۵۳ تا ۳۵۴ رائلٹی (حق سرکار)
۲ـ کتاب الاموال صفحہ ۳۳۹ نمبر ۸۶۷ـ ۳ـ بخاری باب کتاب الزکوٰۃ
۴ـ ماوردی: الاحکام السلطانیہ باب ۱۲ صفحہ ۱۹۸ نیز ابویعلیٰ: الاحکام السلطانیہ صفحہ ۲۲۹ـ

جس طرح کہ زراعت میں سال گزرنے کا انتظار نہیں کیا جاتا اور جس وقت کہ فصل کاٹی جاتی ہے عشر وصول کیا جاتا ہے[1] "انتظار تو نمو (بڑھنے) کے لیے کیا جاتا اور یہاں تو یہ موجود ہی ہے[2]" غرض حاکم کے اختیار تمیزی پر یہ امر موقوف ہے کہ حالات و اقعات کو دیکھ کر معدنی اشیا میں رائلٹی کا تعین کرے۔

معدن کی رائلٹی زر کی شکل میں بھی وصول کی جاسکتی ہے اور معدنی پیداوار کی شکل میں بھی۔ آج دنیا میں یہی عمل درآمد ہے امریکہ میں بطور رائلٹی کے تیل ہی لیا جاتا ہے۔ چنانچہ "سنہ ۱۹۲۰ء سے ممالک متحدہ میں پٹے پر لی ہوئی سرکاری زمینوں پر جن سے تیل نکلتا ہے فیڈرل حکومت کو رائلٹی تیل ہی میں ادا کی جاسکتی ہے[3]"

"امام مالک کہتے ہیں معدن سے جو شئے برآمد ہو اس میں کوئی رائلٹی اس وقت تک نہ لی جائے گی جب تک کہ برآمد کی ہوئی شئے کی قیمت بیس دینار یا دو سو درہم کو نہ پہنچ جائے اس وقت اس میں زکات عائد ہوگی اگر برآمد کی ہوئی شئے کی قیمت دو سو درہم سے زیادہ ہو تو زکات اسی حساب سے لی جائے۔ جب تک کان سے برآمد ایک ہی سلسلہ میں جاری رہے محصول کے شمار کا سلسلہ بھی قایم رہے گا اور جب برآمد بند ہو جائے پھر شروع ہو تو (محصول) زکات بھی از سر نو شروع ہوگا جیسے کہ پہلے برآمد کے وقت شروع ہوا تھا[4]" واضح ہو کہ یہ امام مالکؒ اور مدینہ والوں کی رائے ہے دوسرے فقہا معدن کو رکاز قرار دیتے ہیں اور اس میں مال غنیمت کے مثل خمس عائد کرتے ہیں[5]

یہاں یہ بات کہنی ہے کہ اسلامی مملکت کے بیت المال کو ابتدا ہی سے معدنوں سے خاصی رائلٹی وصول ہو رہی تھی چنانچہ مورخ ابن سعد کا بیان ہے کہ "بنو سلیم کی معدن حضرت ابو بکرؓ کے عہد میں فتح ہوئی اس کی آمدنی بیت المال میں رکھی گئی نیز حضرت ابو بکرؓ کے پاس قبلیہ کی اور جہینہ کی معدنوں سے بھی کثیر مال آیا تھا[6]"

---

[1] موطا، کتاب الزکواۃ فی المعادن نیز کتاب الاموال صفحہ ۳۳۹ نمبر ۸۶۹ [2] ھدایہ ج ا کتاب الزکواۃ، باب فی المعادن والرکاز [3] ٹیلر: پرنسپلز آف پبلک فینانس باب ۱ ص ۵ [4] امام مالکؒ: موطا کتاب الزکوٰۃ المعادن نیز کتاب الاموال ص ۳۳۹ نمبر ۸۶۹ [5] کتاب الاموال ص ۳۴۰ نمبر ۸۷۰ [6] طبقات ابن سعد ج ۳ ص ۱۵۱ ابو بکرؓ۔

(ب) رکاز (دفینہ)

حکومت کو کبھی کبھار رکاز (دفینہ) سے بھی آمدنی حاصل ہو جاتی ہے

رکاز کیا ہے؟

"رکاز وہ مال ہے جو زمانہ جاہلیت کا ہو اور کسی افتادہ زمین یا راستہ میں مدفون ہو، یہ مال پانے والے کی ملک ہے اور اس پر پانچواں حصہ (حکومت کو دینا) واجب ہے" اس آمدنی کو مصارف زکات میں صرف کیا جائے[1] امام مالک رح اور امام شافعی رح کی بھی یہی رائے ہے[2] چنانچہ بخاری وغیرہ کی روایت ہے کہ رسول کریم ؐ نے فرمایا ہے کہ جانور کا زخم معاف ہے کنواں معاف ہے معدن معاف ہے (یعنی کوئی شخص کنواں یا معدن کھدوائے اور کوئی اس میں گر جائے تو مالک پر تاوان نہیں) اور رکاز میں پانچواں حصہ (خمس) ہے[3]

امام مالک رح اور امام شافعی رح کے برخلاف "امام ابو حنیفہ رح فرماتے ہیں کہ پانے والے کو اس کے ظاہر کرنے اور پوشیدہ رکھنے کا اختیار ہے اسی طرح امام (صدر مملکت) کو معلوم ہونے کے بعد اختیار حاصل ہے کہ پانچواں حصہ چاہے لے یا نہ لے[4]

(ج) لگان اجارہ

حکومت کی آمدنی کا ایک اور ذریعہ لگان اجارہ ہے لگان اجارہ

---

[1] ماوردی الاحکام السلطانیہ باب ۱۱ صفحہ ۱۱۵ نیز ابو یعلی: الاحکام السلطانیہ ص ۱۱۱
[2] بخاری ج ۱ کتاب الزکواۃ - [3] بخاری ج ۱ کتاب الزکواۃ بخاری کے علاوہ مسلم، موطا، ابو داؤد، ترمذی وغیرہ کے ابواب الزکواۃ -
[4] ماوردی: الاحکام السلطانیہ باب ۱۱ صفحہ ۱۱۵ -

متعلق تقسیم دولت کے باب میں وضاحت ہو چکی[1]۔
رسول کریمؐ نے بعض وادیوں کو بعض خاص لوگوں کے لیے مختص کر دیا تھا جہاں یہ لوگ مگس پروری کیا کرتے اور پیداوار کا ایک حصہ بیت المال میں داخل کرتے تھے۔ ہم نے اس کو اس لیے اجارہ کہا ہے کہ کوئی دوسرا شخص تو وہاں سے شہد حاصل کر سکتا تھا اور نہ کسی اور کو اس پر حقِ تملیک حاصل تھا نیز حکومت کی جانب سے ان کے حقوق کی کافی دیکھ بھال بھی کی جاتی تھی۔ اس کے معاوضہ میں پیداوار کا ایک حصہ سرکاری خزانہ میں داخل کیا جاتا تھا۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ "بنو متعان کا ایک شخص ہلال نامی رسول کریمؐ کی خدمت میں اپنے شہد کا عشر لے کر حاضر ہوا اور استدعا کی کہ اس کے لیے ایک وادی خاص کر دی جائے جس کو سلبہ کہا جاتا تھا چنانچہ رسول کریمؐ نے اس وادی کو اس کے لیے مختص کر دیا۔"
"پھر جب حضرت عمرؓ خلیفہ ہوئے تو طائف کے گورنر سفیان بن وہبؓ نے حضرت عمرؓ کی خدمت میں لکھ کر اس کی بابت پوچھا۔ حضرت عمرؓ نے انھیں لکھ بھیجا کہ اگر وہ اپنی شہد کی مکھیوں کا عشر ادا کرے جس طرح کہ وہ رسول اللہؐ کو ادا کرتا تھا تو وادی سلبہ اس کے لیے محفوظ کر دو بصورت دیگر وہ اور جنگل کی مکھیوں کی طرح ہیں کہ جو چاہے ان کا شہد کھائے[2]۔"
مذکورہ روایت سے یہ واضح ہے کہ حکومت اس وادی کی حفاظت کرتی تھی اور دوسرے لوگ اس وادی کے استفادہ سے محروم رہتے تھے اس لیے وادی کو محفوظ کرانے والا اپنی پیداوار کا ایک حصہ بیت المال میں داخل کرتا تھا۔
اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حکومت کسی وادی یا جنگل کی حفاظت نہ کرے لیکن کسی شخص کو اتفاق سے کسی جنگل یا وادی سے

---

[1] تقسیم دولت باب ۴ ج ۱ ص ۳۶۱ ملاحظہ ہو [2] ابوداؤد کتاب الزکوٰۃ

بہت سا شہد ہاتھ آجائے تو کیا حکومت اس شخص سے اس کے شہد کا ایک حصہ لے گی یا نہیں؟ فقہاء نے اس مسئلہ میں بڑی دلچسپ بحث کی ہے اور بڑی باریک بینی سے کام لیا ہے چنانچہ صاحب ھدایہ لکھتے ہیں کہ

وَفِي الْعَسَلِ الْعُشْرُ إِذَا أُخِذَ مِنْ أَرْضِ الْعُشْرِ

اور شہد میں عشر ہے جبکہ وہ عشری زمین سے دستیاب ہو۔

وَقَالَ الشَّافِعِيُّ لَا يَجِبُ لِأَنَّهُ مُتَوَلِّدٌ مِنَ الْحَيَوَانِ فَأَشْبَهَ الْإِبْرِيسَمَ

اور امام شافعیؒ نے کہا ہے کہ کوئی محصول واجب نہیں کیونکہ شہد تو جانور (مکھی) سے پیدا ہوتا ہے اور وہ ابریشم کے مماثل ہے کہ وہ بھی ریشم کے کیڑوں سے پیدا ہوتا ہے اور بالاتفاق ابریشم یعنی ریشم میں کوئی محصول نہیں ہے۔

وَلَنَا قَوْلُهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ فِي الْعَسَلِ الْعُشْرُ

اور ہماری (حنفی مکتب کی) دلیل آنحضرتؐ کا وہ ارشاد ہے کہ شہد میں عشر ہے۔

وَلِأَنَّ النَّحْلَ يَتَنَاوَلُ مِنَ الْأَنْوَارِ وَالثِّمَارِ وَفِيهِمَا الْعُشْرُ فَكَذَا فِيمَا يَتَوَلَّدُ مِنْهُمَا بِخِلَافِ دُودِ الْقَزِّ لِأَنَّهُ يَتَنَاوَلُ الْأَوْرَاقَ وَلَا عُشْرَ فِيهَا[1]

اور اس لیے بھی کہ شہد کی مکھی جن غنچوں اور پھلوں سے رس چوستی ہے اُن غنچوں اور پھلوں میں عشر لیا جاتا ہے تو اس طرح جو چیز ان سے پیدا ہوگی اس میں بھی عشر لازم آئے گا برخلاف ریشم کے کیڑوں کے یہ (شہتوت وغیرہ کی) پتیاں کھاتے ہیں اور ان پتیوں میں عشر نہیں ہے (تو جو ان پتیوں سے پیدا ہو یعنی ریشم پر بھی عشر نہیں ہے)

(د) جنگلات کی آمدنی

اگر مملکت میں جنگلات ہوں تو حکومت کو ان سے بھی خاصی آمدنی ہوتی ہے اسلامی مملکت نے جنگلات کو سرکاری ملک قرار دیا تھا[2] جنگلات کی آمدنی سے متعلق بھی اسلامی ماخذوں میں مواد ملتا ہے چنانچہ حضرت علیؓ نے برس[3] کے صحرا داروں پر چار ہزار درہم مقرر کیا اور انھیں اس کے متعلق چمڑے کے ٹکڑے پر وثیقہ لکھ دیا[4]

[1] ۔ ھدایہ ج ا کتاب الزکوٰۃ ۔ [2] تفصیل کے ملاحظہ ہو تقسیم دولت باب ۲ ج ا صفحہ ۳۶۱ تا ۳۶۲ ۔
[3] ۔ برس کا جنگل بابل میں نمرود کی محل سرا کے قریب واقع تھا ۔ [4] بلاذری : فتوح البلدان صفحہ ۲۷۴ ۔

(ھ) سیب البحر

سمندر کی پیداوار کا حاصل

(۱)

سمندر کی پیداوار کا حاصل بھی اکثر حکومتوں کی آمدنی کا ایک ذریعہ ہوتا ہے ۔

رسول کریمؐ اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کے زمانہ میں ۔۔ جہاں تک تحقیق کی گئی ۔۔ اس محصول کا پتہ نہیں چلتا ، اس کی وجہ ظاہر ہے کہ مسلمانوں کو اس زمانہ میں ابھی پانیوں پر اقتدار حاصل نہ ہوا تھا لیکن رفتہ رفتہ جب جزیرہ نمائے عرب کے ساحلوں کے پانیوں پر مسلمانوں کو اقتدار حاصل ہوگیا تو اس محصول کا بھی سوال پیدا ہوا ۔

حضرت عمرؓ نے ایک نیا محصول سمندر کی بعض پیداواروں مثلاً عنبر اور موتیوں وغیرہ پر عاید کیا چنانچہ بیان کیا گیا ہے کہ " حضرت عمرؓ نے یعلی بن امیہ کو سمندر کا عامل مقرر کیا ، انھوں نے عنبر کی بابت پوچھا جس کو ایک شخص نے ساحل پر پایا تھا نیز یہ بھی دریافت کیا کہ اس میں کتنا محصول لیا جائے ؟ حضرت عمرؓ نے لکھا کہ اللہ کی بخششوں میں سے یہ بھی ایک بخشش ہے اس میں اور جو کچھ اللہ تعالیٰ سمندر سے برآمد کرے اس میں خمس لیا ہے ، عبداللہ بن عباسؓ کہتے ہیں کہ میری بھی یہی رائے ہے[1] "

عباسی خلیفہ ہارون الرشید نے امام ابو یوسفؒ سے اس محصول کے بارے میں مشورہ طلب کیا تھا اس کے جواب میں امام ابو یوسفؒ نے لکھا کہ " امیر المومنین ! آپ نے سمندر سے جو کچھ عنبر اور زیور نکلتے ہیں ان کی بابت

---

[1] ابو یوسف : کتاب الخراج صفحہ ۷۰ فصل فیما یخرج من البحر ۔

دریافت فرمایا ہے۔ زیور اور عنبر جو سمندر سے نکلتے ہیں ان میں خمس ہے اور ان دونوں کے علاوہ اور چیزوں میں کوئی محصول نہیں لیا جائے گا۔ ابو حنیفہؒ اور ابن ابی لیلیٰ کہا کرتے تھے کہ ان چیزوں پر کوئی محصول نہیں یہ چیزیں مچھلیوں کی طرح ہیں، اور میری رائے یہ ہے کہ اس میں محصول کی مقدار خمس ۱/۵ ہوگی اور نکالنے والے کو مابقی ۴/۵ حصے ملے گا چنانچہ اس بارے میں حضرت عمرؓ کی ایک روایت بیان کی جاتی ہے جس سے عبداللہ بن عباسؓ نے اتفاق کیا۔ ہم نے اثر کی پیروی کی اور اس کے خلاف کوئی عمل در آمد نہ کیا[1]

ہدایہ سے یہاں ایک اور حوالہ درج کرنا بے محل نہ ہوگا " امام ابو حنیفہؒ اور امام محمدؒ کی رائے میں موتی اور عنبر میں خمس نہیں ہے۔ ابو یوسفؒ کہتے ہیں کہ ان دونوں میں اور ہر ایسی شئے میں جو زیور کے مثل استعمال ہوتی اور سمندر سے برآمد ہوتی ہے اس میں خمس ہے کیونکہ حضرت عمرؓ نے عنبر سے خمس لیا تھا۔ ان دونوں کی رائے یہ ہے کہ سمندر کی گہرائیوں پر کسی کا قبضہ نہیں ہے جو کچھ اس سے نکالا جائے وہ غنیمت نہیں ہو سکتا، چاہے وہ سونا اور چاندی ہی کیوں نہ ہو اور حضرت عمرؓ سے جو اثر مروی ہے وہ اس چیز سے متعلق ہے جس کو سمندر کنارے پر پھینک دیا کرتا ہے اس طرح جو چیز پائی جائے وہ رکاز کے مماثل ہے اور اس میں خمس ہے"[2]

تالابوں، جھیلوں اور ساحلوں کی مچھلیوں کی فروخت سے حکومت کو جو آمدنی ہوتی ہے اس سے متعلق بھی آثار پائے جاتے ہیں، چنانچہ امام ابو یوسفؒ لکھتے ہیں کہ " ہمیں یہ بات پہنچی ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے برس کے جھیلوں پر چار ہزار درہم عائد کیے اور ایک فرمان اس سے متعلق چمڑے پر لکھ دیا"[3]

---

[1] ۔ ابو یوسف: کتاب الخراج صفحہ ۹۳ فصل فیما یخرج من البحر۔
[2] ۔ ھدایہ ج ۱ کتاب الزکوٰۃ باب فی المعادن والرکاز۔
[3] ۔ ابو یوسف: کتاب الخراج صفحہ ۴۰۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اپنے عمان کے عامل کو لکھا کہ مچھلیوں پر کچھ محصول نہ لگاؤ جب تک کہ وہ دو سو درہم کی قیمت کی مالیت کو نہ پہنچ جائیں۔ جب وہ دو سو درہم کو پہنچ جائیں تو اس میں سے زکات (۱/۴۰ حصہ) لو۔ ابو عبیدہ کہتے ہیں کہ جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے یہ رائے قایم کی کہ جو شئے سمندر سے نکلے وہ خشکی سے کسی معدن کے نکلنے کے مماثل ہے۔ اس لیے انھوں نے معدنوں میں زکات عائد کرنے کا حکم دیا تھا[1]۔

یہ امر صدر مملکت کے اختیار تمیزی پر موقوف ہوگا کہ سمندر کی پیداوار پر خمس یعنی پانچواں حصہ عائد کرے یا زکواۃ کے مثل چالیسواں حصہ۔ صدر مملکت کو تو یہ دیکھنا بھی پڑے گا کہ سمندر کی گہرائیوں سے موتی، مرجان، مونگا نکالنے میں کتنے اخراجات ہوتے ہیں اور اسی تناسب سے اپنے اختیار تمیزی سے کام لے کر محصول عائد کرے۔ حضرت عمرؓ کا قول ہے کہ

فیما اخرج اللہ من البحر الخمس۔ جو کچھ سمندر سے خدا نکالے اس میں خمس ہے۔

اس قول کے مطابق مونگا، موتیوں اور عنبر پر بھی محصول لگایا جا سکتا ہے تباہ شدہ یا غرق شدہ جہاز کے ٹکڑے اور وہ مال و اسباب جو بہتے بہتے ساحل پر آلگے (Flotsam)۔ اسی طرح وہ چیزیں جو جہاز کو ہلکا کرنے کے لیے۔ یا موجودہ عہد میں آب دوز کشتی کو ہلکا کرنے کے لیے۔ سمندر میں پھینک دی جائیں اور وہ بہہ کر ساحل پر آلگے (Jetsam) تو اس لاوارث مال کی مالک حکومت سمجھی جائے گی۔ یا کسی خاص شخص کی مملوکہ زمین پر آلگے تو حکومت کو پانچواں حصہ (خمس) اور پانے والے کو ۴/۵ حصہ ملے گا۔

(۹) لاوارث مال

حکومت کی آمدنی کا ایک اور ذریعہ لاوارث مال بھی ہوتا ہے۔

---

[1] کتاب الاموال صفحہ ۳۴۷ نمبر ۸۸۹۔

حکومت سارے ملک کے باشندوں کی نمائندہ سمجھی جاتی ہے اس لیے اس کو قانوناً یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ لاوارث لوگوں کے مال کو ان کے مرنے کے بعد قومی دولت کا جزو قرار دے اور اس حاصل شدہ دولت کو باغراض حکومت صرف کرے، اسلامی دستور و قانون نے بھی حکومت کا یہ حق تسلیم کیا ہے اور لاوارثوں کے مال و جائداد کو بیت المال کی ملک قرار دیا ہے۔

مصر کے گورنر جنرل "عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں لکھ کر مصر کے ایسے راہبوں سے متعلق دریافت فرمایا جو لاوارث مرتے ہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے لکھا کہ اگر ان کا کوئی وارث ہو تو وراثت کا مال اس کے حوالہ کر دیا جائے، اور جس کا کوئی وارث نہ ہو اس کا مال بیت المال میں داخل کر دیا جائے"[1]

اس کے علاوہ اسلامی فقہ کی رو سے اور چار صورتیں ایسی ہیں جبکہ وارث اپنے مورث کا ورثہ پانے سے محروم ہو جاتا ہے اور اگر اس مورث کا کوئی دوسرا وارث (چاہے وہ موصی لہٗ اور مولی الموالات کیوں نہ ہو) موجود نہ ہو تو لازمی طور پر متوفی کا مال اور اس کی جائداد حکومت کے قبضہ میں آ جائے گی، ان چار صورتوں کی وضاحت ذیل میں کی جاتی ہے سراجی کے مولف نے بیان کیا ہے کہ

"مانع وراثت چار ہیں۔ (۱) غلامی (۲) ایسا قتل جس میں قصاص لازم آتا ہے (جیسے قتل عمد میں) یا کفارہ لازم آئے (جیسے شبہ عمد میں) (۳) اختلاف مذہب (۴) اختلاف دارین[2] (متوفی دار الاسلام میں اور اس کا وارث دار الحرب میں رہتا ہو) مذکورہ امور سے متعلق تقسیم دولت کے باب میں کافی وضاحت کی جا چکی ہے۔ قتل عمد اور شبہ قتل عمد میں یہ مصلحت پوشیدہ ہے کہ وارث اپنے مورث کے قتل کا۔ خواہ کسی ذریعہ سے ہو

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو کنز العمال ج ۳ ص ۱۵۲ کتاب الخلافۃ مع الامارۃ بحوالہ ابن عبدالحکم۔

[2] سراجی صفحہ ۲ فصل مانع الارث مطبوعہ کانپور ۱۹۱۰ء۔

معادن یا مزنکب نہ بنتے اسی طرح مرتد کا مال بھی بیت المال کی ملکیت قرار پاتا تھا چنانچہ سراجی میں صراحت ہے کہ "اگر مرتد اپنے ارتداد کی حالت میں مرجائے یا قتل ہو جائے یا دار الحرب میں جا کر مل جائے اور حاکم عدالت نے اس کے مل جانے کا حکم لگا دیا ہو تو جو کچھ اسلام کی حالت میں اس نے کمایا ہو وہ مال اس کے مسلمان وارثوں کو ملے گا اور ارتداد کی حالت میں جو کچھ کمایا ہو وہ بیت المال میں داخل کیا جائے گا۔ یہ امام ابو حنیفہؒ کی رائے ہے[1]" کیونکہ "دار الحرب میں جا کر مل جانا بمنزلہ موت کے ہے اور دار الاسلام میں جو مال چھوڑ دے اس سے اس کی ملکیت زائل ہو جاتی ہے[2] پس ایسا مال مسلمانوں کے بیت المال میں مثل لقطہ کے رکھا جائے گا[3]"

امام ماوردی نے لکھا ہے کہ "اس کا مال بیت المال میں داخل کر دیا جائے تاکہ مستحقین فیئے کے خرچ میں آئے اس لیے کہ نہ مسلمان اس کا وارث ہو سکتا ہے اور نہ کافر"۔ "امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ ارتداد سے پہلے اور بعد دونوں مالوں میں میراث جاری ہو گی[4]"

کسی لاوارث کا نہ صرف مال منقولہ بیت المال کی ملک قرار پائے گا بلکہ غیر منقولہ جائداد بھی حکومت کی ملک قرار پائے گی۔ امام ماوردی نے ہی بیان کیا ہے کہ "ایسے لاوارث لوگوں کی زمینیں جن کے مالک مر گئے ہوں اور ذوی الفروض میں سے کوئی وارث موجود نہ ہو نہ عصبات موجود ہوں تو اس کو بیت المال میں داخل کر کے عام مسلمانوں کی میراث قرار دینا چاہیئے اور آمدنی کو ان کے مصالح میں صرف کرنا چاہیے۔ امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ جس شخص کا کوئی وارث نہ ہو اس کی میراث صرف فقیروں میں میت کی

---

[1] ـ سراجی صفحہ ۶۴ فصل فی المرتد
[2] ـ بدائع الصنائع کاسانی ج ۷ صفحہ ۱۳۷ کتاب السیر۔
[3] ـ بدائع الصنائع کاسانی ج ۷ صفحہ ۱۳۸ کتاب السیر۔
[4] ـ ماوردی: الاحکام السلطانیہ باب ۵ صفحہ ۳ نیز ابو یعلی صفحہ ۲۷۶ ـ

طرف سے بطور صدقہ کے خرچ کرنی چاہیئے۔ امام شافعیؒ کے نزدیک اس کا مصرف عامۃ المسلمین کے مصالح ہیں کیونکہ شئے پہلے املاک خاصہ میں سے تھی اور اب بیت المال میں منتقل ہو کر املاک عامہ میں سے ہو گئی ہے[1] لامحالہ اس کا مصرف بھی مصالح عامہ کے لیے ہی خاص ہو گا۔

لاوارث مقتول کا خون بہا بھی حکومت ہی کو ملے گا۔

ز) منافع سکہ سازی

حکومت کی آمدنی کا ایک اور ذریعہ منافع سکہ سازی بھی ہوتا ہے۔ اسلامی مملکت نے ابتداہی سے زر کی اجرائی کو اپنے ہاتھ میں رکھا تھا سکے سے متعلق "مبادلہ دولت" کے باب۶ میں اگرچہ کافی وضاحت کی جا چکی ہے لیکن موقع کی مناسبت سے یہاں بھی بعض امور بیان کیے جاتے ہیں۔

ابتدا میں بالکل سادہ درہم و دینار جاری کیے گئے تھے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ لوگ ادھر ادھر سے ان سکے کو کترنے لگے اسی بنا پر" ان کے کنارے کترنے کی ممانعت کی گئی کیونکہ اسلام کی ابتدا میں (جیسا کہ عصر جدید میں طریقہ ہے) ــــ لوگ ان کو گن کر معاملہ کرتے تھے اور اطراف کے کونے کترنے سے اس میں کمی آجاتی تھی[2] اسی بنا پر عبدالملک نے نقش زدہ درہم و دینار جاری کیے۔

خلیفہ عبدالملک نے اپنے عراق کے گورنر حجاج بن یوسف کو تسکیک کا حکم دیا" حجاج نے حکم دیا کہ تاجر وغیرہ اجرت دے کر درہم ڈھلوا سکتے ہیں اور اس اجرت کو سرکاری آمدنی قرار دیا وہ اسی میں سے

---

[1] ۔ ماوردی: الاحکام السلطانیہ باب۱۲ صفحہ ۱۸۲

[2] ۔ ماوردی: الاحکام السلطانیہ باب۱۳ صفحہ ۱۲۹ نیز ابویعلی صفحہ ۱۶۸۔

صناعوں اور طباعوں کو اجرتیں دیتا تھا اور فاضلات کو ابواب شاہی میں داخل کرتا تھا[1]

تاریخوں سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ لوگ حکومت کے دار الضرب میں سونا یا چاندی پیش کر کے سکے ڈھلوا سکتے تھے چنانچہ "سعید بن المسیب کہتے ہیں کہ میں نے دمشق سونا بھیجا اور میرے لیے جاہلیت کے مثقال کے ہم وزن اس کے سکے ڈھال دیے گئے"[2]

(۱۰) زکات یا صدقات

ابتدا میں ایسے محصولوں کو بیان کیا گیا جو ذمی رعایا پر لگائے گئے تھے پھر چند ایسے محصولوں کی صراحت کی گئی جس میں ذمی اور مسلمان کی تخصیص نہ تھی۔ اب ذیل میں ایسے محاصل کی وضاحت کی جاتی ہے جو اسلامی مملکت کے صرف مسلمان باشندوں پر عائد کیے گئے تھے اور ذمی مستثنیٰ تھے، ان محصولوں کو زکات یا صدقات سے موسوم کیا جاتا ہے[3] زکات ہی کی ذیل میں مسلمانوں کی زرعی پیداوار کا لگان یعنی عشر، مویشیوں کی زکات، اندوختہ زر کا محصول، مسلمانوں کی ملکیت میں جو معدن ہوں ان کی پیداوار کا محصول نیز تجارت کے سامان کو درآمد کرنے کا محصول اور اسی طرح محصورہ علاقہ کے شہد کا محصول (زکواۃ العسل) شمار کیا جاتا ہے۔

زکات ایک مالی عبادت ہے | اسلام کے بنیادی ۵ فرائض میں سے

---

[1] ۔ بلاذری: فتوح البلدان صفحہ ۴۶۹ نقود

[2] ۔ بلاذری: فتوح البلدان صفحہ ۴۷۰ نقود محمد بن سعد بروایت واقدی

[3] ۔ "صدقہ اور زکات دونوں کا مفہوم ایک ہے صرف لفظوں کا فرق ہے" (ماوردی: الاحکام السلطانیہ باب ۱۱ صفحہ ۱۰۸۔)

ایک فرض زکات بھی ہے، زکات ایک مالی عبادت ہے۔ زکات کے لفظی معنی اضافہ اور نشو ونما کے ہیں نیز طہارت اور پاکیزگی (تزکیہ) کے معنے ہیں بھی یہ لفظ قرآن مجید میں استعمال ہوا ہے مثلاً

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَکّٰی۔ بے شک وہ شخص کامیاب ہے جو پاکی حاصل کرے۔

پ الاعلیٰ، ۸، ع ۱

"پہلے معنے کے لحاظ سے اس محصول کو زکات اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہ اس دنیا میں بھی خوشحالی کو بڑھاتا ہے اور آخرت میں دہنی مرتبہ میں اضافہ کرتا ہے[1]"

فقہاء کی اصطلاح میں زکات سے مال کا وہ حصہ مراد ہے جو مالدار مسلمان نادار مسلمان کو خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے عطا کرتا ہے گویا زکات ایک منظم شکل کی خیرات ہے جس میں بیت المال کو مرکز مان کر اس کے توسط سے صحیح تقسیم دولت عمل میں آتی ہے۔

اصلی غرض و غایت زکات کے محصول کی اصلی غرض و غایت خود رسول مقبولؐ کے الفاظ میں یہ ہے کہ دولت مالداروں سے لے کر ناداروں میں تقسیم کی جائے کہ

تُؤْخَذُ مِنْ اَغْنِيَائِهِمْ مالداروں سے لی جائے گی

فَتُرَدُّ عَلٰى فُقَرَائِهِمْ[2] اور ناداروں میں بانٹی جائے گی

"زکات ہر اس مال میں واجب ہوتی ہے جو خود بڑھتا ہو یا کام کر کے بڑھایا جا سکتا ہو تاکہ صاحب مال پاک ہو جائے اور ضرورت مندوں کی حاجت روائی ہو جائے[3]"

نماز کی طرح قرآن مجید نے بار بار محصول زکات کا بھی تذکرہ کیا ہے

۱۔ مبسوط السرخسی ج ۲ کتاب الزکواۃ۔

۲۔ بخاری پ کتاب الزکواۃ نیز حدیث کی ہر ایک کتاب میں کتاب الزکواۃ ملاحظہ ہو

۳۔ ماوردی: الاحکام السلطانیہ باب ۱۱ ص ۱۰۸ نیز ابویعلی الاحکام السلطانیہ ص ۹۹

جس سے اسلامی معاشرہ میں اس کی اہمیت واضح ہوتی ہے، اکثر تو نماز اور زکات کا تذکرہ ساتھ ساتھ پایا جاتا ہے کہ

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ نماز قائم کرو اور زکات ادا کرو۔

پ ۱ البقرہ ۲ ع ۱۳

اور کہیں یہ تذکرہ علیحدہ بھی ہے

رسول کریمؐ کے مدینہ میں ہجرت فرمانے کے بعد مملکت اسلامیہ کی بنیاد پڑی، اسلامی حکومت کا تصور پیدا ہوا تو رسول کریمؐ کو اللہ نے بذریعہ وحی یہ حکم دیا کہ

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا۔ اے پیغمبر! ان کے مال کی زکات لیا کرو جس کے ذریعہ سے انھیں (گناہوں سے) پاک و صاف کر دو۔

پ ۱۱ التوبہ ۹ ع ۱۳

مورخ طبری کا بیان ہے کہ زکات سنہ ۲ ھ میں فرض ہوئی۔[1]

قابل زکات مال کی دو قسمیں ہیں۔

(الف) ظاہر۔ (ب) باطن

"ظاہر سے مراد وہ مال ہے جو کسی طرح نہ چھپ سکے جیسے کھیتی، گائے بیل اور دیگر مویشی۔"

"باطن سے وہ مال مراد ہے جس کا چھپانا ممکن ہو جیسے سونا چاندی اور سامان تجارت۔"[2]

ذیل میں ہر ایک کی وضاحت اور صراحت کی جاتی ہے۔

(الف) مال ظاہر کی زکات

(۱) عُشر | مسلم کاشت کاروں سے ان کی اپنی مملوکہ اراضی کی زرعی پیداوار کا

---

[1] - تاریخ طبری سنہ ۲ ھ کے واقعات۔

[2] - ماوردی: الاحکام السلطانیہ باب ۱۱ صفحہ ۱۱۳ نیز ابو یعلی: الاحکام السلطانیہ صفحہ ۹۹

جو محصول یا لگان حکومت وصول کرتی ہے وہ اصطلاح میں عُشر کہلاتا ہے۔

عُشر سے متعلق تقسیم دولت کے باب ۴ میں وضاحت کی جا چکی یہاں کچھ مزید صراحت کی جاتی ہے۔

حکومت کی جانب سے ذمی رعایا کو جو سرکاری زمینیں پٹے پر دی جاتی تھیں وہ خراجی زمینیں کہلاتی تھیں، ذمی کاشت کار ہر سال بیت المال کو ایک مقررہ لگان یعنے خراج ادا کرتے تھے یہ لگان گویا اراضی پر زراعت کرنے کا معاوضہ تھا لیکن جن زمینوں کے قانونی مالک خود مسلمان تھے ان کی زمینیں عُشری کہلاتی تھیں، اسلامی مملکت مسلم کاشت کاروں سے ان کی زرعی پیداوار کا ایک مقررہ حصہ وصول کرتی تھی۔

فقہاء نے اسلامی مملکت کی اراضی کی چار قسمیں قرار دی تھیں "پہلی قسم یہ ہے کہ اس کے باشندے مسلمان ہو جائیں یہ عُشری زمین ہے۔ دوسری قسم یہ ہے کہ اس کو مسلمان آباد کریں یہ بھی عُشری ہے۔ تیسری قسم یہ ہے کہ مسلمان بزورِ شمشیر اس پر قبضہ کر لیں یہ بھی عُشری ہے۔ چوتھی قسم یہ ہے کہ اس کے باشندوں سے مصالحت ہو جائے یہ فئے ہے اور اس پر خراج مقرر کیا جاتا ہے"[1] بہر طور عُشر ایک نوعی محصول ہے جو زمین کی پیداوار پر لگایا جاتا اور معاشی لگان پر عاید کیا جاتا ہے۔

قرآن مجید میں ذیل کی آیتیں زرعی پیداوار کا محصول لینے سے متعلق ہیں۔

وَآتُوا حَقَّهُ يَوْمَ حَصَادِهِ
پ ۸ الانعام ۶ ع ۱

اور اس میں جو حق واجب ہے فصل کاٹنے کے دن ادا کرو۔

نیز یہ کہ

أَنفِقُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّا أَخْرَجْنَا لَكُم مِّنَ الْأَرْضِ۔
پ ۳ البقرہ ۲ ع ۳

اپنی کمائی میں سے بہترین چیز کو (راہِ خدا میں) خرچ کرو، اور اس میں سے جو کہ ہم نے تمہارے لیے زمین سے نکالا۔

[1] ماوردی: الاحکام السلطانیہ باب ۱۳ صفحہ ۱۶۷، نیز باب ۱۳ صفحہ ۱۲۱ ابو یعلیٰ: الاحکام السلطانیہ صفحہ ۱۸۶

مفسرین نے "مِمَّا اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِنَ الْاَرْضِ" کے ذیل میں نہ صرف اناج اور میووں کو شمار کیا ہے بلکہ معدنی دولت کو بھی اس کی ذیل میں شمار کیا ہے۔[۱]

محصولِ عُشر کی شرح کا تعین خود رسالت مآب نے فرما دیا[۲] چنانچہ "معاذ بن جبلؓ جب یمن میں تھے تو رسول اللہؐ نے انھیں یہ تحریر فرمایا کہ جو زمین آبِ رواں یا آبِ باراں سے سیراب ہو اس پر عُشر ($\frac{1}{10}$) ہے اور جو چرخ یا ڈول سے سیراب کی جائے اس پر نصف عُشر ($\frac{1}{20}$) ہے"[۳]

اوپر بیان ہوا کہ ڈول یا چرخ سے سیراب کی جانے والی زمین پر صرف نصف عُشر لیا جاتا ہے فقہاء اس کی یہ وجہ بیان کرتے ہیں

لِاَنَّ الْمُؤْنَةَ تَكْثُرُ فِيهِ وَتَقِلُّ فِيمَا يُسْقَى بِالسَّمَاءِ اَوْ سَيْحًا[۴] — کیونکہ اس میں محنت زیادہ درکار ہوتی ہے بخلاف اس کے جو زمین بارش یا نہر کے پانی سے سیراب ہو اس میں محنت کم درکار ہوتی ہے۔

غرض عُشر مسلمانوں کی مملوکہ اراضی کی پیداوار کے حاصل کو کہتے ہیں زرعی پیداوار دو قسم کی ہوتی ہے (۱) ایک تو کاشتکاری اور (۲) دوسرے باغبانی۔

۱۔ کھیتوں کی پیداوار کا عُشر

مسلمانوں کے کھیتوں کی پیداوار پر محصول زکات (عُشر) واجب ہوتا ہے

امام ابوحنیفہؒ کہتے ہیں کہ ہر قسم کی کھیتی پر واجب ہے، امام شافعیؒ کے نزدیک صرف ان ہی اشیاء پر واجب ہے جن کو لوگ کھانے کا ذخیرہ بنا کر رکھیں اس لیے سبزی اور ترکاری پر زکات واجب نہیں ہے[۵] "اُن کے نزدیک ان

---

[۱] ملاحظہ ہو تفسیر بیضاوی ج ۱ صفحہ ۱۲۴ مطبوعہ نولکشور پریس۔

[۲] تقسیم دولت کے باب ج ۱ صفحہ ۳۲۷ تا ۳۳۹ پر پوری تفصیل گذر چکی۔

[۳] کتاب الاموال صفحہ ۴۷۶ نمبر ۱۴۱۱ نیز بلاذری: فتوح البلدان صفحہ ۱۷ الیمن۔

[۴] ھدایہ ج ۱ کتاب الزکاۃ باب الزکوٰۃ الزروع والثمار

[۵] ماوردی: الاحکام السلطانیہ باب ۱۱ صفحہ ۱۱۴۔

دس قسم کی اشیاء پر زکاۃ لی جائے گی گیہوں، جو، جوار، باجرا، چاول اور مکئی، بلّر (باقلا) لوبیا، چنا، مسور اور جلیان[1]

"امام مالکؒ اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک ترکاری اور اسی قسم کی چیزوں پر کوئی صدقہ نہیں ہے وہ کہتے ہیں کہ گیہوں، جو، جوار، باجرا، دال، خرما، منقی، چاول، تل، مٹر اور تمام ایسے غلے جو تولے جا سکتے ہیں اور بھر کر رکھے جائیں نیز مسور، چنے، لوبیے، ماش اور کودوں (موٹے مٹر، جو، جوار کا آمیزہ) پر پورے پانچ وسق ہونے کی صورت میں صدقہ ہے اور اس سے کم میں نہیں ہے[2]

قاضی ابو یوسفؒ نے لکھا ہے کہ "میری رائے میں عُشر صرف انھیں پیداواروں میں ہے جو لوگوں کے پاس ذخیرہ ہو کر رہتی ہیں نہ تو ساگ پات میں عُشر ہے اور نہ گھانس چارہ اور لکڑیوں میں، جو چیزیں ذخیرہ ہو کر نہیں رہ سکتیں جیسے تربوز، کھیرا، ککڑی، کدو، بیگن، گاجر، ساگ پات اور پھول اس قسم کی اشیاء میں عُشر نہیں ہے اور جو پیداواریں لوگوں کے پاس ذخیرہ ہو کر رہتی ہوں اور پیمانے سے ناپی جاتی یا رطل سے تولی جاتی ہوں مثلاً گیہوں، جو، جوار، مکئی، چاول، دالیں، تل شاہدانہ (شہدانج) بادام، پندوق (چلغوزہ) جوز، پستہ، کسم کا بیج، دھنیا، زیرہ، پیاز اور لہسن اور ان کے مماثل اشیاء جب زمین سے پانچ وسق کی مقدار میں یا اس سے زیادہ حاصل ہوں تو اس میں عُشر ہے۔ یہ اس وقت جب کہ آبِ رواں یا باران سے سیراب ہوں اور جب ڈول یا چرخ سے سیراب ہوں تو اس میں نصف عُشر ہے اور جب یہ پانچ وسق سے کم ہوں تو ان میں عُشر نہیں ہے[3]

امام ابو یوسفؒ نے مزید تفصیل یہ کی ہے کہ "وہ شئے جو وسق سے

---

[1] ماوردی: الاحکام السلطانیہ باب ۱۱ صفحہ ۱۱۴ نیز ابو یعلیٰ: الاحکام السلطانیہ صفحہ ۱۰۶

[2] بلاذری: فتوح البلدان صفحہ ۸۵ ۔ [3] ابو یوسف: کتاب الخراج صفحہ ۳۰ ۔

ناپی نہیں جاتی مثلاً زعفران اور روئی تو اس میں بھی عُشر واجب ہے بشرطیکہ اس کی قیمت وسق سے ناپی جانے والی ادنیٰ شئے کے پانچ وسق کے برابر ہو جیسے کہ ہمارے (صاحب ھدایہ کے) زمانہ میں جوار، مکئی ہے، پس ایسی چیزیں جن کا پیمانہ نہیں کیا جاتا شرع میں ان کی قیمت کا اندازہ لگایا جاتا ہے جیسا کہ سامان تجارت کی قیمت کا اندازہ کیا جاتا ہے[۱] صاحب ھدایہ نے اپنے زمانہ میں ایک وسق کی قیمت چالیس درہم قرار دی تھی[۲]۔

"امام ابوحنیفہؒ کہتے ہیں کہ عُشری زمین میں جو کچھ بھی پیدا ہو خواہ وہ ترکاریاں کا دستجہ ہی کیوں نہ ہو اس میں عُشر واجب ہے امام زفر کا بھی یہی قول ہے[۳]"

یہ امر امام (صدر مملکت) کے اختیار تمیزی پر موقوف ہوگا کہ وہ کھیتوں کی بعض پیداوار کو عُشر کے محصول سے مستثنیٰ قرار دے یا عُشری زمین میں جو کچھ پیدا ہو اس پر محصول لگائے۔

"کھیتوں کی زکات ان کے خشک ہونے اور پکنے کے بعد واجب ہوتی ہے لیکن کاٹنے اور صاف کرنے کے بعد جبکہ ایک صنف کی مقدار پانچ وسق تک پہنچ جائے زکات وصول کی جائے اس سے کم میں واجب نہیں، امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک قلیل اور کثیر سب میں زکات ہے[۴]" لیکن عمل درآمد یہ رہا ہے کہ پیداوار کی مقدار پانچ وسق ہونے پر ہی عُشر لیا جاتا تھا اور جو لوگ چھوٹے پیمانہ پر اپنے مکان کے صحن یا احاطہ میں ترکاریاں وغیرہ بوتے تھے ان کا عُشر نہیں لیا جاتا تھا۔ امام ابویوسفؒ اور امام شافعیؒ کی بھی یہی رائے ہے کہ پانچ وسق سے کم پیداوار پر زکات نہیں۔ بخاری کی ایک روایت سے اس کی تائید ہوتی ہے کہ "پانچ وسق سے کم (غلہ وغیرہ) میں زکات فرض نہیں ہے[۵]"

۱۔ ھدایہ ج اکتاب الزکاۃ۔
۲۔ ھدایہ ج اکتاب الزکاۃ "وقیمۃ الوسق اربعون درھما"۔
۳۔ بلاذری: فتوح البلدان صفحہ ۵۸۔
۴۔ ماوردی: الاحکام السلطانیہ باب ۱۱ صفحہ ۱۱۷۔
۵۔ بخاری ج ۱ کتاب الزکواۃ نیز موطا، کتاب الزکواۃ

۲ ـ باغوں کی پیداوار کا عشر

"دوسری قسم کے مال جس میں زکاۃ واجب ہوتی ہے کھجور اور دوسرے پھل ہیں ـ

امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک ہر قسم کے پھلوں میں زکات واجب ہے (جیسا کہ انھوں نے ہر قسم کے کھیتوں میں عشر کو واجب قرار دیا تھا لیکن) امام شافعیؒ صرف کھجوروں اور انگوروں میں زکات کو واجب سمجھتے ہیں[1]" دلیل یہ ہے کہ حضرت عمرؓ بھی صرف انگور اور کھجور کی پیداوار سے محصول عشر وصول کرتے تھے چنانچہ "طائف کے عامل سفیان بن عبداللہ الثقفی نے حضرت عمرؓ کو لکھا کہ: آج کل چند باغوں کا مسئلہ میرے سامنے پیش ہے جن میں انگور، شفتالو، اور انار پیدا ہوتے ہیں اور ان کے علاوہ اور چیزیں بھی پیدا ہوتی ہیں جن کی پیداوار انگور کی پیداوار سے کئی گنا زیادہ ہے ان سب پر عشر مقرر کرنے کی اجازت دی جائے، حضرت عمرؓ نے اس کا یہ جواب دیا کہ ان چیزوں میں عشر نہیں ہے[2]" انگور اور کھجور پر محصول عائد کرنے کی وجہ ظاہر ہے کہ ان کو خشک بنا کر بطور ذخیرہ رکھا جا سکتا ہے ـ

غرض "پھلوں میں زکات واجب ہونے کی دو شرطیں ہیں ـ

(۱) "ایک یہ کہ پھل کار آمد اور کھانے کے قابل ہو جائیں ـ اگر اس سے پہلے کوئی شخص توڑ لے تو زکات ساقط ہو جائے گی مگر زکات سے بچنے کے لیے توڑنا مکروہ ہے بہ ضرورت مکروہ نہیں"

(۲) "دوسری شرط یہ ہے کہ پانچ وسق تک مقدار ہو اس سے کم میں زکات واجب نہیں"

"(واضح ہو کہ ایک وسق ساٹھ صاع کا اور ایک صاع ۵ ۱/۳ عراقی رطل کا ہوتا ہے ـ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک کم و بیش سب میں زکات واجب ہے (جیسا کہ انھوں نے کھیتوں کی کم و بیش مقدار میں زکات کو واجب ٹھیرایا تھا) نیز امام موصوف پھلوں کی مقدار کا اندازہ کرنے سے منع کرتے ہیں ـ امام شافعیؒ کے

---

[1] ـ ماوردی: الاحکام السلطانیہ باب ۱۱ صفحہ ۱۱۲ ـ [2] بلاذری: فتوح البلدان ص ۶۵ الطائف ـ

نزدیک پھلوں کی مقدار کا اندازہ کرنا جائز ہے تاکہ زکات کا اندازہ اور مستحقین کا حق معلوم ہو جائے۔ رسول اللہؐ نے بھی اس کام کے لیے عمال مقرر کیے تھے[1] رسول اللہؐ نے مکے کے گورنر عتاب بن اسید کو یہ حکم دیا تھا کہ (طائف کے قبیلہ) ثقیف کے تاکستانوں کی جانچ کی جائے جس طرح کہ نخلستانوں کی جانچ کی جاتی ہے اور پھر ان سے انگوروں ہی کی صورت میں زکات وصول کی جائے جس طرح کھجوروں کی زکات وصول کی جاتی ہے[2]

بعد کے زمانہ میں موقع محل، حالات اور واقعات کا لحاظ کیا جاتا تھا[3] چنانچہ امام ماوردیؒ کی یہ رائے ہے کہ بصرہ کے پھلوں میں صرف انگور کا اندازہ کیا جائے جس طرح اور مقامات کے انگوروں کا کیا جاتا ہے اور کھجوریں چونکہ بکثرت ہوتی ہیں اور اندازہ کرنے میں دقت ہے اس لیے ان کا اندازہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے[3] بصرہ کی کھجوریں جب بکنے کے لیے بصرہ کے بازار میں آتیں تو ان سے عشر لیا جاتا تھا[4] جیسا کہ آج کل انڈین یونین اور مملکت حیدرآباد میں تمباکو کا محصول فروخت (سیل ٹیکس) لیا جاتا ہے۔

"مقدار زکات کی تفصیل یہ ہے کہ اگر سیرابی نالی یا نہر سے کی جائے تو دسواں حصہ (عشر) ہے اور چرس یا اونٹ پر پانی لاد کر سیراب کریں تو بیسواں حصہ (نصف عشر) ہے[5]

"انگوروں اور کھجوروں کا اندازہ اس وقت کیا جائے جب وہ

---

[1] ماوردی: الاحکام السلطانیہ باب ۱۱ صفحہ ۱۱۳، بخاری، مسلم وغیرہ میں ہے خیبر کی کھجوروں کا اندازہ کرنے کے لیے رسول اکرمؐ نے عبداللہ بن رواحہؓ کو بھیجا تھا۔ اسی طرح ترمذی، ابو داؤد میں ہے کہ "رسول اللہؐ پھلوں اور انگوروں کا اندازہ کرنے کے لیے لوگوں کو بھجوایا کرتے تھے"

[2] بلاذری: فتوح البلدان صفحہ ۶۵ الطائف تفصیل کے لیے کتاب الاموال باب خرص الثمار للصدقۃ صفحہ ۴۸۱ تا ۴۹۶ ملاحظہ ہو۔

[3] ماوردی: الاحکام السلطانیہ باب ۱۱ صفحہ ۱۱۳۔ [4] ماوردی: الاحکام السلطانیہ باب ۱۱ صفحہ ۱۱۳

[5] ماوردی: الاحکام السلطانیہ باب ۱۱ صفحہ ۱۱۳۔

کارآمد درجہ کو پہنچ جائیں یعنے جب بسر[I] اور عنب (پکے ہوئے انگور کا دانہ) ہو جائیں اندازہ کے بعد ان کو تمر (خشک کھجور) اور زبیب (منقہ) ہونے دیا جائے[1]

"کھجور اور انگور کے پھل خشک کھجور اور منقہ ہو جائیں تو زکات بالکل خشک ہونے کے بعد لی جائے اگر تازہ توڑے جائیں تو فروخت کے بعد قیمت کا دسواں حصہ لیا جائے[2]"

"کھجور کی تمام مختلف انواع ایک سمجھی جائیں، اسی طرح انگور کی مختلف انواع کا حکم بھی یہی ہے کیونکہ اجناس متحد ہیں مگر کھجور و انگور ایک حکم میں نہیں ہو سکتے دونوں کی جنسیں مختلف ہیں[3]"

"اگر اندازہ لگانے کے بعد ادائے زکات کے امکان سے پہلے کسی ارضی یا سماوی آفت سے ضائع ہو جائیں تو زکات معاف ہو جائے گی اور اگر زکات کے امکان کے بعد ضائع ہوں تو زکات وصول کی جائے گی[4]"

(۲) مویشیوں کی زکات

جس طرح مسلم کاشت کاروں سے ان کی مملوکہ اراضی کی پیداوار کا عشر لیا جاتا ہے اسی طرح جو مسلمان مویشی پالتے ہیں ان سے ان کے مویشیوں کی زکات لی جاتی ہے۔

مویشیوں پر زکات اسی حال میں عائد ہوگی جب چرائی زیادہ تر جنگلوں مرغزاروں میں ہوتی ہو۔ دراصل ان ہی مویشیوں پر زکات واجب ہے جو افزائش نسل کے لیے پالے جائیں ورنہ عام طور پر جو مویشی گھروں میں پالے جاتے ہیں ان پر زکات نہیں ہے۔

I جب کھجوریں کچھ بڑی ہو جاتی ہیں تو انھیں بسر کہتے ہیں جب پختگی انتہا کو پہنچ جاتی ہے تو ان کو رطب کہا جاتا ہے اس کے بعد وہ تمر بنتے ہیں۔ [1] ماوردی: الاحکام السلطانیہ باب ۱۱ صفحہ ۱۱۳۔

[2] ماوردی: الاحکام السلطانیہ باب ۱۱ صفحہ ۱۱۳۔

[3] ماوردی: الاحکام السلطانیہ باب ۱۱ صفحہ ۱۱۳۔

[4] ماوردی: الاحکام السلطانیہ باب ۱۱ صفحہ ۱۱۳ نیز ابو یعلی: صفحہ ۱۰۹۔

بن چرائی

اسلامی مملکت میں بن چرائی کا معاوضہ نہیں لیا جاتا تھا۔ "کسی حاکم کو حمیٰ (چراگاہ) یا افتادہ زمینوں میں چرانے پر لوگوں سے معاوضہ لینا جائز نہیں۔ رسول اللہؐ کا فرمان ہے کہ تین چیزوں میں سب لوگ شریک ہیں پانی، آگ، اور چارہ"[1]

گھاس چارہ کو اسلام میں مشترکہ ملک قرار دیا گیا ہے اور ہر شخص اپنے مویشیوں کو سرکاری اراضی پر یا مرغزاروں پر بے معاوضہ چرا سکتا ہے لیکن اگر کسی مسلمان کے جانور مقررہ تعداد سے زیادہ ہو جائیں تو اس کے مویشیوں پر زکات کا محصول لگایا جاتا ہے۔

مویشیوں کے متعلق اسلام سے پہلے عربوں کا نظام

زمانۂ جاہلیت میں مشرکین عرب کے یہاں جس طرح کھیتوں کی پیداوار کا ایک نظام تھا اسی طرح قرآن سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے مویشیوں کے متعلق بھی ایک بھونڈا سا نظام قائم کر رکھا تھا۔

وَجَعَلُوا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْاَنْعَامِ نَصِيْبًا۔	انھوں نے اللہ کی پیدا کی ہوئی کھیتی اور مویشیوں میں سے اللہ کا ایک حصہ مقرر کیا تھا۔
فَقَالُوْا هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ	اور اپنے خیال کے موافق کہتے کہ یہ (حصہ) خدا کا ہے
وَهٰذَا لِشُرَكَآئِنَا۔	اور یہ ہمارے شریکوں کا (حصہ) ہے۔
فَمَا كَانَ لِشُرَكَآئِهِمْ فَلَا يَصِلُ اِلَى اللّٰهِ۔	جو ان کے شریکوں کا حصہ تھا وہ تو اللہ کو نہیں پہنچتا تھا۔
وَمَا كَانَ لِلّٰهِ فَهُوَ يَصِلُ اِلٰى شُرَكَآئِهِمْ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ	اور جو اللہ کا حصہ تھا وہ ان کے شریکوں کو پہنچ جاتا ہے کیسا برا یہ فیصلہ کرتے ہیں۔

پ الانعام ۶ ع ۱۶

"بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ عربوں نے اس نظام میں کھیتوں اور مویشیوں کی

---

[1] ماوردی: الاحکام السلطانیہ باب ۱۱ ص ۱۷۸

پیداوار کا ایک حصہ خدا کے لیے مقرر کیا تھا اور وہ فقیروں اور مسکینوں پر صرف کیا جاتا تھا اور دوسرا حصہ بتوں کے لیے مقرر تھا جو بت خانہ کے متولیوں پر صرف کیا جاتا تھا، لیکن وہ لوگ بتوں کے مقررہ حصے کی نگرانی بڑے اہتمام سے کرتے تھے اس لیے اس کا کوئی جز دوسرے کو نہیں مل سکتا تھا لیکن خدا کے مقررہ حصے کی یہ حالت نہ تھی بلکہ اس کے بعض اجزا سے بت خانہ کے متولی بھی فائدہ اٹھاتے تھے[۱] "اس نظام میں ایسی چیزوں کی آمیزش ہوگئی تھی جن کی وجہ سے سارا نظام بدنما ہوگیا تھا، اس بنا پر قرآن مجید نے اس پورے نظام کو لغو قرار دے کر زکات کا مستقل نظام قائم کیا۔[۲]

مویشیوں میں زکات کے وجوب کی شرطیں

مویشیوں میں زکات واجب ہونے کی دو شرطیں ہیں۔

(۱) "پہلی شرط یہ ہے کہ مویشی چرنے والے ہوں۔ جنگل کی گھانس چرتے ہوں تاکہ محنت مشقت کم اور نفع و نسل زیادہ ہو۔ لدو کام کرنے والے یا قیمت سے خریدی ہوئی گھانس کھانے والے جانوروں میں امام ابوحنیفہ رح اور امام شافعیؒ کے نزدیک زکات واجب نہیں ہے۔ امام مالک رح چرنے والوں کی طرح ان میں بھی زکات کے وجوب کے قائل ہیں"

(۲) "دوسری شرط یہ ہے کہ ان پر ایک سال گذر جائے تاکہ اس دوران میں نسل پوری ہو جائے۔ رسول کریمؐ کا ارشاد ہے کہ سال گذرنے سے پہلے مال میں زکات نہیں ہے"[۳]

رسول اللہؐ کا طرز عمل

رسول مقبولؐ کا یہ طرز عمل رہا کہ جب آپ زکات کے محصول کے وصول کرنے والوں کو بھیجتے تو زکات کی مقدار وغیرہ سے متعلق بھی ہدایتیں دیتے تھے، نیز

۱۔ محمد الخضری: تاریخ التشریع الاسلامی صفحہ ۳۰

۲۔ محمد الخضری: تاریخ التشریع الاسلامی صفحہ ۴۰

۳۔ ماوردی: الاحکام السلطانیہ باب ۱۱ صفحہ ۱۱۱ نیز ابویعلی: الاحکام السلطانیہ ص ۱۰۲

مفتوحہ علاقوں میں زکات وصول کرنے والوں کو بھیجتے تو انھیں بھی زکات کی مقدار سے متعلق باقاعدہ تحریری احکام دیا کرتے تھے، پھر جب وہ واپس آتے تو ان سے حساب طلب کرتے ۔" رسول کریمؐ نے بنو سلیم کے صدقات وصول کرنے کے لیے ایک شخص کو مقرر کیا اس شخص کو ابن لیبہ کہتے تھے جب وہ صدقات وصول کر کے آیا تو آپ نے اس سے حساب لیا۔[1]

حضرت ابوبکرؓ کا طرزِ عمل

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے رسالت مآبؐ کے زمانہ میں زکات وصول کرنے کا جو طریقہ تھا اس کو برقرار رکھا اور اعلان فرمادیا کہ "خدا کی قسم! نبی کریمؐ کے صدقات کی جو حالت نبی کریمؐ کے زمانہ میں تھی اس میں تغیر نہ کروں گا اور میں اس میں وہی عمل درآمد کروں گا جو رسول اللہ کرتے تھے۔[2]

"حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ نے جب انھیں زکات وصول کرنے کے لیے بحرین بھیجا تو انھیں یہ تحریر لکھ دی تھی۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

"یہ صدقہ (زکات) کے فرائض ہیں جو رسول اللہؐ نے مسلمانوں پر فرض کیے اور جس کی بابت اللہ نے اپنے رسول کو حکم دیا، پس مسلمانوں میں سے جس کسی سے اس تحریر کے موافق زکات مانگی جائے اس کو چاہیے کہ وہ اسے دیدے اور اگر کسی سے اس سے زیادہ مانگی جائے تو وہ نہ دے"

"چوبیس اور اس سے کم اونٹوں میں ایک بکری دینی واجب ہے ہر پانچ اونٹ میں ایک بکری، پھر جب پچیس اونٹ ہو جائیں تو پینتیس تک ان میں ایک مادہ بنت مخاض (ایک سالہ اونٹنی)، پھر جب چھتیس سے پینتالیس تک اونٹ ہو جائیں تو ان میں ایک بنت لبون (دو سالہ اونٹنی)، پھر چھیالیس سے ساٹھ تک ہو جائیں تو ان میں

---

[1] بخاری پ۶ کتاب الزکواۃ۔ [2] بخاری پ۱۴ کتاب المناقب، رسول اللہ کی قرابت کے مناقب نیز بخاری پ۱۶ کتاب المغازی۔

ایک حِقہ (چار سالہ اونٹنی) جو نسل کشی کے قابل ہو۔ پھر جب اکسٹھ سے پچھتر تک ہو جائیں تو ان میں ایک جذعہ (پانچ سالہ اونٹنی) ہے۔ جب چھہتر سے نوّے تک ہو جائیں ان میں دو بنت لبون۔ پھر جب اکیانوے سے ایکسو بیس تک ہو جائیں تو ان میں دو حِقہ جو نسل کشی کے لائق ہوں۔ پھر جب ایکسو بیس سے زیادہ ہو جائیں تو ہر چالیس میں ایک بنت لبون اور ہر پچاس میں ایک حِقہ ہے۔

"اور جس کے پاس صرف چار اونٹ ہوں تو ان میں زکات فرض نہیں ہاں اگر ان کا مالک دینا چاہے تو دے سکتا ہے۔ پھر جب پانچ اونٹ ہو جائیں تو ان میں ایک بکری ہے۔

"جنگل میں چرنے والی بکریوں کی زکات یہ ہے کہ جب وہ چالیس سے ایکسو بیس تک ہوں تو ایک بکری فرض ہے۔ پھر جب ایکسو بیس سے زیادہ ہو جائیں تو دو سو تک دو بکریاں۔ پھر جب دو سو سے زیادہ ہو جائیں تین سو تک تو ان میں تین بکریاں۔ اور پھر جب تین سو سے زیادہ ہو جائیں تو ہر سو میں ایک بکری"۔

"اور اگر کسی کے جنگل میں چرنے والی بکریاں چالیس سے کم ہوں تو اس میں کچھ زکات نہیں، ہاں اگر ان کا مالک دینا چاہے تو دے سکتا ہے۔"

"چاندی میں سے چالیسواں حصہ زکات میں دینا فرض ہے بشرطیکہ دو سو درہم کے ہوں۔ اور اگر ایکسو نوّے درہم ہوں تو اس میں کچھ زکات نہیں ہاں اگر مالک دینا چاہے تو دیدے[1]۔"

---

[1] ۔ مذکورہ بالا حدیث تو بخاری کتاب الزکوٰۃ کی ہے، اسی طرح حضرت عمرؓ نے زکات سے متعلق جو تحریر لکھی تھی وہ موطا کتاب الزکات میں محفوظ ہے اور خود امام مالکؒ بیان کرتے ہیں کہ "میں نے حضرت عمرؓ کی کتاب صدقہ کو پڑھا"۔

ابو داؤد کتاب الزکواۃ اور ترمذی کتاب الزکواۃ میں عبداللہ بن عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ "رسول اللہؐ نے زکات کی کتاب لکھی مگر آپ اس کو اپنے عاملوں کو بھیجنے

گایوں کی زکات

گائے کا ابتدائی نصاب تیس ہے "رسول کریمؐ نے معاذ ابن جبلؓ کو یمن بھیجا اور حکم دیا کہ ہر تیس گایوں میں ایکسالہ مادہ یا نر بچھڑا (تبیع) لیا جائے اور ہر چالیس میں دوسالہ بچھڑا یا بچھڑی (مسنہ) لی جائے[1]۔ لیکن موطا میں ہے کہ "معاذ ابن جبل انصاریؓ نے تیس گایوں میں ایکسالہ بچھڑا لیا اور چالیس گایوں میں دوسالہ بچھڑا لیا اور اس سے کم میں کچھ نہ لیا اور کہا کہ میں نے اس بارے میں رسول اللہؐ سے کچھ نہیں سنا، میں رسول اللہؐ سے جب ملاقات کروں تو اس بارے میں پوچھ لوں گا، رسول اللہؐ نے معاذ بن جبلؓ کے آنے سے پہلے وفات پائی[2]۔" خواہ کچھ ہی ہو رسول اللہؐ کے بعد خلفاء راشدینؓ نے اسی عمل کو برقرار رکھا اور معاذ بن جبلؓ نے جس نصاب پر گایوں کی زکات وصول کی تھی اس کی توثیق کی۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ "ایسے اونٹ جن سے محنت مشقت لی جاتی ہے اور ایسے بیل جن سے محنت مشقت لی جاتی ہے ان میں زکات نہیں ہے چنانچہ معاذ بن جبلؓ نے بھی ان سے نہ لیا تھا اور یہی حضرت علیؓ کا بھی قول ہے[3]۔"

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) نہ پائے تھے کہ آپ کی وفات ہوگئی، آپ نے اس کو اپنی تلوار سے لگا رکھا تھا حضرت ابوبکرؓ نے اس پر عمل کیا یہاں تک کہ وفات پائی، پھر حضرت عمرؓ نے اس پر عمل کیا یہاں تک کہ وفات پائی، اس کتاب میں یہ لکھا تھا۔۔۔۔" اسی ابو داؤد میں "ابن شہاب زہریؒ کہتے ہیں کہ میں نے اس کتاب کو پڑھا اور وہ حضرت عمرؓ کی اولاد کے پاس تھی اور عمر بن عبدالعزیزؒ نے اس کتاب کی نقل کروائی۔

1۔ ترمذی ج ۳ ابواب الزکواۃ صفحہ ۱۱۵ نیز ابوداؤد و نسائی کے کتاب الزکواۃ ابو یوسف کتاب الخراج صفحہ ۴۴ نیز کتاب الاموال صفحہ ۳۷۰ نمبر ۹۹۲۔

2۔ امام مالک: موطا کتاب الزکواۃ باب صدقۃ الماشیہ۔

3۔ ابو یوسف: کتاب الخراج صفحہ ۴۴ نیز ھدایہ ج ۱ کتاب الزکات۔

بھینسوں کی زکات

گایوں کی طرح بعد میں بھینسوں پر بھی محصول زکات جاید کیا گیا۔ ابتدا میں بھینسیں عرب میں نہ تھیں لیکن ۹۲ھ / ۷۱۱ء میں جب محمد بن قاسم نے سندھ فتح کیا تو "محمد بن قاسم نے جو حجاج کی طرف سے سندھ پر عامل تھے اپنے علاقہ سے حجاج کے پاس کئی ہزار بھینس بھیجیں، جن میں سے حجاج نے چار ہزار بھینسیں خلیفہ ولید بن عبد الملک کے پاس بھیج دیں اور باقی کسکر کے جنگلوں میں چرنے کے لیے چھوڑ دیں[1]" اس طرح عراق اور شام میں ان کی نسل پھیل گئی اور عمر بن عبد العزیز (المتوفی ۱۰۱ھ / ۷۲۰ء) نے اپنے عاملوں کو لکھا کہ "بھینسوں کی زکات لی جائے جس طرح کہ گایوں کی زکات لی جاتی ہے[2]"

اس بارے میں فقہاء کا مسلک

اگر کسی گلہ بان کے پاس کچھ بکریاں اور چند بھیڑیں ہوں یا کسی شخص کے پاس چند گائیں اور چند بھینسیں ہوں یا چند بختی اونٹ اور چند عربی اونٹ ہوں اور نصاب پورا ہوتا ہو تو تمام فقہا کا مسلک یہ ہے کہ "بھیڑ بکری کے حکم میں اور بھینس گائے کے حکم میں، اور بختی اونٹ عربی اونٹ کے حکم میں ہے، کیونکہ جنس ایک سی متحد ہے[3]" مگر اونٹ کو گائے کے اور گائے کو بکری کے حکم میں شامل نہ کیا جائے گا۔ ان کی جنس ایک سی نہیں ہے[4]

گھوڑوں کی زکات

گھوڑوں پر زکات عائد کرنے یا نہ کرنے سے متعلق فقہا میں اختلاف رائے ہے، رسول کریم نے فرمایا تھا کہ میں غلام اور گھوڑے کا صدقہ تم کو معاف کرتا ہوں[5]

ا۔ مزید تفصیل کے لیے بلاذری: فتوح البلدان صفحہ ۱۷۸ ملاحظہ ہو۔ ۲۔ کتاب الاموال صفحہ ۳۸۵ نمبر ۱۰۲۷

۳۔ حیوانیات (زوالوجی) کے ماہرین نے تقسیم حیوانی کی درجہ بندی میں ان پستانی جانوروں کو ایک ہی نوع میں رکھا ہے

۴۔ ماوردی: الاحکام السلطانیہ باب ۱۱ صفحہ ۱۱۱ نیز ابویوسف کتاب الخراج صفحہ ۴۴ نیز کتاب الاموال صفحہ ۳۸۵ نمبر ۱۰۲۹ — ۵۔ کتاب الاموال صفحہ ۳۹۳ نمبر ۱۳۵۵ نیز ماوردی: الاحکام السلطانیہ باب ۱۱ صفحہ ۱۱۱ —

رسول کریمؐ کی رحلت کے بعد ایسے مرغزار فتح ہوئے جن میں لوگ باقاعدہ گھوڑوں کی پرورش اور ان کی نسل کشی کیا کرتے تھے" شام کے لوگوں نے ابو عبیدہ بن الجراحؓ سے کہا کہ ہمارے گھوڑوں اور غلاموں کی زکات لیا کرو، انھوں نے انکار کیا اور پھر حضرت عمرؓ کو لکھا آپ نے بھی انکار کیا، پھر لوگوں نے دوبارہ ابو عبیدہؓ سے کہا انھوں نے انکار کیا اور حضرت عمرؓ کو لکھا، حضرت عمرؓ نے انھیں لکھ بھیجا کہ اگر وہ دینا چاہیں تو ان سے لیکر ناداروں کو دے دینا اور لونڈی غلاموں کی خوراک پر صرف کرنا۔[1]

حضرت عمرؓ کا طرز عمل

"زکات کے متعلق تمام احکام خود رسول اللہؐ کے عہد میں مرتب ہو چکے تھے، حضرت عمرؓ کے عہد میں (سابقہ احکام کے سلسلہ میں) جو اضافہ ہوا یہ تھا کہ تجارت کے گھوڑوں پر زکات مقرر ہوئی حالانکہ آنحضرتؐ نے گھوڑوں کو زکات سے مستثنیٰ فرمایا تھا، لیکن اس سے عیاذاً باللہ یہ نہیں خیال کرنا چاہیے کہ حضرت عمرؓ نے جناب رسول اللہؐ کی مخالفت کی، آنحضرتؐ نے جو الفاظ فرمائے تھے اس سے بظاہر سواری کے گھوڑے مفہوم ہوتے ہیں اور حضرت عمرؓ نے اسی مفہوم کو قائم رکھا۔ آنحضرتؐ کے وقت میں تجارت (اور نسل کشی) کے گھوڑے وجود نہیں رکھتے تھے اس لیے ان کے زکات سے مستثنیٰ ہونے کی کوئی وجہ نہیں، بہرحال زکات کی مد میں یہ ایک نئی آمدنی تھی اور اول حضرت عمرؓ ہی کے عہد میں شروع ہوئی۔[2]

حضرت عمرؓ نے اس نئے محصول کو عائد کرنے کا تصفیہ صحابہ کرامؓ سے مشورہ کے بعد ہی کیا تھا جیسا کہ آپ نے محصول در آمد عائد کرنے اور

۱۔ امام مالک: موطا کتاب الزکواۃ۔ صدقۃ الماشیہ نیز کتاب الاموال ص ۴۶۵ نمبر ۱۳۶۵۔

۲۔ الفاروق ج ۲ صفحہ ۵۸ نامی پریس کانپور ۱۸۹۸ء۔

مفتوحہ اراضی کو تقسیم نہ کرنے سے متعلق صحابہ کرامؓ سے مشورہ کیا تھا۔

"شام والوں میں ایک شخص حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوا اور گھوڑوں اور غلاموں کی زکات کی نسبت دریافت کیا۔ آپ نے فرمایا کہ میرے دو ساتھیوں (آنحضرتؐ اور ابوبکرؓ) نے جو کچھ کیا ہے میں بھی وہی کروں گا۔ پھر آپ نے رسول کریمؐ کے صحابہ کرامؓ سے مشورہ لیا اور ان کے رائے کے بموجب گھوڑوں پر محصول عاید کیا۔ ان صحابہ میں حضرت علیؓ بھی شریک تھے اور آپ ہی کی رائے پر عمل ہوا"[۱]

یوں حضرت عمرؓ کو گھوڑوں کی پرورش اور پرداخت کا خاص خیال تھا کیونکہ وہ میدان جنگ میں کام آتے تھے۔ "بصرہ والوں میں ثقیف کا ایک شخص نافع نامی تھا اس کی کنیت ابوعبداللہ تھی۔ بصرہ میں گھوڑوں کی پرورش و پرداخت کا کام شروع کرنے میں یہ پہلا شخص تھا، مدینہ منورہ گیا اور حضرت عمرؓ سے درخواست کی کہ بصرہ میں ایک زمین ہے جو خراجی زمینوں میں سے نہیں ہے اگر وہ مجھے عطا کی جائے تو اس سے مسلمانوں کو کچھ نقصان نہ ہوگا، (بصرہ کے گورنر) ابوموسیٰ اشعریؓ نے بھی اس کی سفارش کی تھی۔ حضرت عمرؓ نے اس کی درخواست منظور کی اور ابوموسیٰ کو لکھا کہ وہ زمین اس کو جاگیر میں دے دی جائے[۲] ساتھ ہی گورنر کے نام ایک اور ہی مراسلہ لکھا کہ وہ تم اس کی زراعت اور گھوڑوں کی پرورش اور پرداخت میں اس کو مدد دو"[۳]

گھوڑوں کی زکات کے متعلق فقہاء کی رائے

فقہاء کی اکثریت کا رجحان اس طرف ہے کہ صرف ان ہی گھوڑے، گھوڑیوں پر زکات لی جائے گی

۱۔ کتاب الاموال صفحہ ۴۶۴ نمبر ۱۳۶۴

۲۔ کتاب الاموال صفحہ ۷۷ نمبر ۶۸۷ نیز فتوح البلدان صفحہ ۳۵۱۔

۳۔ فتوح البلدان صفحہ ۴۵۲، ۳۴۶

جو سال بھر جنگل میں چرتے ہوں چنانچہ "امام ابو حنیفہؒ جنگل میں چرنے والی گھوڑیوں میں ہر گھوڑی پر ایک دینار واجب کرتے ہیں"[1]

گھوڑے کی قیمت کا تخمینہ لگا کر بھی زکات ادا کی جا سکتی ہے چنانچہ صاحب ہدایہ لکھتے ہیں کہ "اگر کسی جنگل میں چرنے والے گھوڑے گھوڑیاں ہوں تو ان کے مالک کو اختیار ہے کہ فی اسپ ایک دینار ادا کرے اور اگر چاہے تو ان کی قیمت لگا کر دو سو درہم پر پانچ درہم دے اور قیمت لگانا حضرت عمرؓ کے قول سے منقول ہے"[2]

عیب دار جانور

بوڑھے اور عیب دار جانور زکات میں نہیں لیے جاتے چنانچہ "حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ ابو بکر صدیقؓ نے ان کو ایک تحریر لکھ دی تھی اس میں زکات کے وہ مسائل تھے جن کا اللہ اور رسول اللہؐ نے حکم دیا ہے اس میں یہ مضمون بھی تھا کہ زکات میں بوڑھی بکری نہ نکالی جائے اور نہ عیب دار بوڑھا بکرا ہاں اگر صدقہ وصول کرنے والا چاہے تو ہرج نہیں"[3] لیکن اس سے یہ منشا بھی نہیں کہ زکات میں بہترین بکریاں ہی لی جائیں "حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ حضرت عمرؓ کے پاس زکات کی بکریاں آئیں، آپ نے ایک بہت دودھ دینے والی بکری دیکھی، پوچھا کہ یہ کیسی بکری ہے؟ لوگوں نے کہا کہ زکات کی ہے، حضرت عمرؓ نے کہا کہ اس کے مالک نے اس کو کبھی خوشی سے نہ دیا ہوگا، لوگوں کو فتنہ میں نہ ڈالو، ان کے بہترین اموال نہ لو اور ان کے رزق چھیننے سے باز آ جاؤ"[4] عام اصول یہ ہے کہ "متوسط قسم کی بکری لی جائے"[5]

۱؎ ۔ ابو یوسف: کتاب الخراج صفحہ ۴۴ نیز ہدایہ ج ۱ کتاب الزکواۃ ۔

۲؎ ۔ ہدایہ ج ۱ کتاب الزکواۃ ۔

۳؎ ۔ بخاری پ ۶ کتاب الزکواۃ ۔

۴؎ ۔ امام مالک: موطا کتاب الزکواۃ باب صدقۃ الماشیہ نیز ابو یوسف: کتاب الخراج صفحہ ۴۷ ۔ ۵؎ ابو یوسف: کتاب الخراج صفحہ ۴۴ ۔

(ب) مال باطن کی زکات

"مال باطن یا پوشیدہ سے مراد وہ مال ہے جس کا چھپا دینا ممکن ہو جیسے سونا، چاندی، اور سامان تجارت"

(۱) سونے چاندی (زر) کی زکات

اسلامی معاشیات نے سرمایہ داروں کے سرمایہ پر بھی محصول زکات عائد کیا ہے

"زکات کی نسبت اجمالاً و اشارتاً یاد رکھنے کے قابل یہ بات ہے کہ یہ اسلامی ٹکس آمدنی یعنے انکم پر وصول نہیں کیا جاتا بلکہ سرمایہ (یعنی کیپیٹل) پر وصول کیا جاتا ہے اور ان سارے ٹکسوں سے بڑھ جاتا ہے جو آج ساڑھے تیرہ سو برس بعد انسانیت نے اپنی ترقی یافتہ ضرورتوں کے مدنظر قائم کیے ہیں"[1]

مسٹر جافری مارک نے اپنی کتاب "موجودہ بُت پرستی" میں تمام امانتوں پر یکساں محصول لگانے کی ایک اسکیم پیش کی ہے[2]۔ شاید اسے یہ معلوم نہیں کہ آج سے ۱۳۶۸ برس پہلے اسلام نے سود کی مخالفت کرتے ہوئے فاضل رقومات پر زکات کی شکل میں ۲½ فیصد کا محصول عائد کیا تھا۔

اسلامی نظم معیشت نے سونے اور چاندی کو پیدا آورانہ طور پر مال نامی تسلیم کیا ہے چاہے یہ زر کاروبار میں لگا ہوا ہو چاہے نہ ہو اسی طرح یہ معاشیات عدم مداخلت کی ایک ایسی کمزوری کو دور کر دیتی ہے جو کہ اس کے جزو و لاینفک ہے۔ اسلامی معاشیات مزدوروں کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ سرمایہ داروں سے مناسب اجرت اپنے کام کے تناسب سے طلب کریں

---

[1] تقریر نواب بہادر خاں مرحوم باجلاس مسلم لیگ ۱۶ ر ڈسمبر ۱۹۴۳ء ماخوذ از رہبر دکن جلد نمبر ۲۴ م ۱۲ ر محرم ۱۳۶۳ھ مطابق ۱۰ ر جنوری ۱۹۴۴ء۔

[2] اس کا کچھ تذکرہ تقسیم دولت کے باب میں نظریہ سود کے تحت ہو چکا۔

اور یوں یہ ادارۂ زکات سرمایہ داروں کی قوت مقابلہ کا خاتمہ کر دیتا ہے یہ ان کے لیے غیر منفعت بخش ہو گا کہ سرمایہ کو کاروبار میں نہ لگا کر یوں ہی ڈال رکھیں۔

زکات کا ادارہ ہر ایسی فاضل دولت کو پیدا آور قرار دیتا ہے اور ہر ایسی دولت پر محصول زکات عائد کرتا ہے جو خواہ کاروبار میں لگی ہوئی ہو خواہ بیکار پڑی ہو۔ اس طرح وہ سرمایہ داروں کو مجبور کرتا ہے کہ وہ اپنے سرمایہ کو کاروبار میں لگائیں آج امریکہ جیسے سرمایہ دار ملک میں بہت سے ایسے کروڑپتی موجود ہیں جو اپنی فاضل دولت کو یوں ہی ڈال رکھتے ہیں اور کسی کاروبار میں نہیں لگاتے۔ اسلامی معاشیات نے فاضل دولت کو کاروبار میں لگانے پر جو زور دیا ہے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ایک مرتبہ رسول مقبول ؐ نے ایک خطبہ کے دوران میں ارشاد فرمایا کہ " آگاہ ہو جاؤ کہ تم میں سے جو بھی کسی یتیم کا ولی بنے اور اس کے پاس مال و دولت ہو تو اس سے تجارت کرے اور اس دولت کو یونہی ڈال نہ رکھے، ایسا نہ ہو کہ زکات ہی اسے ختم کر ڈالے[1]"

۱۔ چاندی کی زکات

سونے اور چاندی میں زکات چالیسواں حصہ ہے۔ نبی کریم ؐ کا ارشاد ہے کہ چاندی میں چالیسواں حصہ واجب ہے۔ چاندی کا نصاب دو سو درہم ہے۔ ایک درہم اسلامی وزن سے چھ دانق کا ہوتا ہے دس درہم کا وزن سات مثقال ہے۔ دو سو درہم میں سے پانچ درہم یعنے چالیسواں حصہ نکالنا واجب ہے اس سے (یعنے دو سو درہم سے) کم میں واجب نہیں اور زاید میں اس کے حساب سے دیا جائے۔ امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ دو سو سے زاید میں چالیس تک کچھ نہیں اور چالیس میں ایک چھٹا درہم اور بڑھ جاتا ہے[2]

---

[1] ۔ ترمذی ج ۳ کتاب الزکواۃ صفحہ ۱۳۶ نیز کتاب الاموال ص ۴۵۴ ۔

[2] ۔ ماوردی: الاحکام السلطانیہ باب ۱۱ صفحہ ۱۱۵ نیز ابو یعلی صفحہ ۱۰۹

"دوسو درہم سے کم میں زکات نہیں ہے جیسا کہ رسول کریمؐ نے فرمایا ہے کہ پانچ اوقیہ سے کم چاندی میں زکات نہیں ہے، اور ایک اوقیہ چالیس درہم کا ہوتا ہے، پس جب پورے دوسو درہم ہوں اور ان پر ایک سال گزر جائے تو ان میں پانچ درہم واجب ہیں کیونکہ آپ نے معاذ ابن جبلؓ کو لکھا کہ دوسو درہم میں پانچ درہم لو اور ہر بیس مثقال سونے میں نصف مثقال۔ قدوری نے کہا کہ پھر دوسو سے زیادہ پر کچھ واجب نہیں یہاں تک کہ چالیس تک پہنچ جائیں تب اس میں ایک درہم واجب ہے۔۔ پھر ہر چالیس میں ایک درہم ہے اور یہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک ہے اور صاحبین یعنے امام ابویوسفؒ اور امام محمدؒ نے کہا کہ دوسو پر جو کچھ زیادہ ہو تو اس کے حساب سے ہے اور امام شافعیؒ کا بھی یہی قول ہے اس قول کی بنیاد انھوں نے رسول کریمؐ کی اس حدیث پر رکھی ہے جو حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ دوسو سے جو کچھ زیادہ ہو تو اس کے حساب سے ہے۔ ان ائمہ کی دوسری دلیل یہ ہے کہ زکات کا وجوب نعمت مال کا شکرانہ ہے اور ابتدا میں نصاب کی شرط دوسو درہم ہونا تو نگری کے ثبوت کے لیے ہے، جنگل میں چرنے والے مویشیوں (سوائم) میں نصاب کے بعد زیادتی کے حساب سے وجوب نہ ہونا مال کو ٹکڑے کرنے سے بچانے کے لیے ہے۔ امام ابوحنیفہؒ کی ایک دلیل یہ ہے کہ رسول کریمؐ نے معاذ ابن جبلؓ سے فرمایا کہ کسور میں کوئی چیز نہ لو اور نیز عمرو بن حزم کی حدیث ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ چالیس درہم سے کم میں زکات نہیں ہے، دوسرے یہ کہ زکات میں کسر واجب گردانے میں یہ حرج ہے کہ ان پر اطلاع پانا مشکل ہے اور شرع میں حرج نہیں ہے۔"[1]

"چاندی کے ڈلے اور مضروب سکے ایک حکم میں ہیں"[2]

---

[1] ہدایہ ج ا کتاب الزکواۃ باب زکواۃ المال۔

[2] ماوردی: الاحکام السلطانیہ باب ۱۱ صفحہ ۱۱۵۔

۲۔ سونے کی زکات

"اسلامی مثقال سے سونے کا نصاب بیس مثقال ہے اس نصاب کا چالیسواں حصہ یعنے نصف مثقال دینا واجب ہے اور زائد میں اس کے حساب سے دیا جائے۔ خالص سونا اور مضروب سونے کے سکے کا حکم ایک ہی ہے[1]"

"سونا بیس مثقال سے کم ہو تو اس پر زکات نصف مثقال ہے اور مثقال کا وزن یہ ہے کہ ہر سات مثقال وزن میں دس درہم کے مساوی ہوں اور یہی مشہور ہے۔ یہ نصاب مکمل ہو تو ہر چار مثقال میں دو قیراط واجب ہیں کیونکہ واجب تو چالیسواں حصہ ہے۔ واضح ہو کہ ہر مثقال بیس قیراط کا ہوتا ہے اور جو سونا چار مثقال سے کم ہو تو اس میں امام اعظم رح کے نزدیک زکات نہیں ہے اور صاحبین کے نزدیک بحساب مذکور واجب ہے اور یہ وہی کسور کا مسئلہ ہے، شرع میں ہر دینار دس درہم کے برابر ہوتا ہے اس طرح چار مثقال چالیس درہم کے برابر ہوں گے[2]"

۳۔ زیور کی زکات

"سونے چاندی کے مباح زیورات میں امام شافعی رح کا نہایت صحیح قول یہ ہے کہ زکات واجب نہیں امام مالک رح کا بھی یہی مذہب ہے اور ضعیف قول یہ ہے کہ زکات واجب ہے، امام اعظم رح کا یہی مسلک ہے۔ سونے چاندی کے ممنوع زیورات اور برتنوں میں زکات سب کے نزدیک واجب ہے[3]"

صاحب ھدایہ نے ہر ایک کے قول کی دلائل سے یوں توضیح کی ہے کہ "سونے چاندی کے پتر (غیر مضروب حالت میں) اور سونے چاندی کے زیوروں اور برتنوں میں زکات واجب ہے۔ امام شافعی رح نے کہا کہ عورتوں کے زیور اور مردوں کی چاندی کی مہر میں زکات واجب نہیں

---

[1]۔ ماوردی: الاحکام السلطانیہ باب ۱۱ صفحہ ۱۱۵ نیز ابو یعلی صـ ۱۰۹

[2]۔ ھدایہ ج ۱ کتاب الزکواۃ باب زکواۃ المال۔

[3]۔ ماوردی: الاحکام السلطانیہ باب ۱۱ صفحہ ۱۱۵۔

کیونکہ ان کا استعمال جائز ہے اور یہ پہننے کے کپڑوں کے مشابہ ہیں۔
حنفی مکتب خیال کی دلیل یہ ہے کہ زکات کا سبب مال میں نمو ہونا ہے اور اس مال میں نمو موجود ہے اور وہ پیدائشی طور پر تجارت کے واسطے مہیا ہوا ہے اور نمو کی دلیل اس میں موجود ہے اور زکات نمو میں معتبر ہے برخلاف کپڑوں کے[1] کہ اس میں نہ تو پیدائشی طور پر نمویت ہے اور نہ فعلی طور پر۔

اسلامی معاشیات نے سونے چاندی کے برتنوں کو مکروہ قرار دیکر اُن پر جو زکات عائد کی ہے اس سے علاوہ اور فائدوں کے ایک معاشی فائدہ یہ بھی ہے کہ زیادہ سے زیادہ سونا اور چاندی سکّوں کی شکل میں استعمال میں آنے لگتے ہیں۔

(۲) سامان تجارت کی زکات

مال باطن کی ایک قسم جس پر زکات لی جاتی ہے وہ سامان تجارت ہے۔
مسلمان تاجروں سے تجارتی سامان درآمد کرنے پر جو محصول لیا جاتا اس کو زکات ہی کہا جاتا تھا۔ اگر یہ بے بِکا تجارتی سامان اور ایک سال تک تاجر کے گودام میں پڑا رہتا تو دوسرے سال پھر اس سامان پر زکات لی جاتی تھی۔ "امام مالکؒ کہتے ہیں کہ ہمارے نزدیک یہ حکم ہے کہ اگر کسی شخص نے سونے یا چاندی کے بدلے گیہوں یا کھجوریں تجارت کے واسطے خریدیں اور مال یوں ہی پڑا رہا یہاں تک کہ پورا سال گزر گیا پھر جب مال بِکا اور نصاب کی مقدار ہو چکی تو اس پر زکات واجب ہوگی[2]"
"سامان تجارت پر زکات واجب ہے چاہے کسی قسم کا مال ہو شرط یہ ہے کہ اس سامان کی قیمت نصاب کے معیار پر پوری اُترے چاہے درہم (چاندی کے سکّے) سے یا دینار (سونے کے سکّے)[3]" اور مال میں

---

[1] ۔ ھدایہ ج ا کتاب الزکوٰۃ باب زکوٰۃ المال ۔ [2] ۔ امام مالک: موطا کتاب الزکوٰۃ ۔
[3] ۔ ھدایہ ج ا کتاب الزکوٰۃ فصل فی العروض ۔

تجارت کی نیت شرط ہے تاکہ نمو ثابت ہو۔[1]

اور سامان تجارت (عروض) کی قیمت ایسے زر سے لگائی جائے جو مسکینوں کے لیے سود مند ہو اور فقیروں کے حق میں احتیاط ہو۔ صاحب ھدایہ لکھتے ہیں کہ یہ امام ابو حنیفہؒ کی رائے ہے اور مبسوط میں ہے کہ مالک کو سونے یا چاندی کے سکوں میں اندازہ کرنے کا پورا اختیار ہے کیونکہ اشیاء کی قیمت کا اندازہ کرنے میں دونوں برابر ہیں۔ امام ابو یوسفؒ کی رائے یہ ہے کہ تجارتی سامان کی قیمت کا اندازہ اس زر سے کرے جس زر سے اس شئے کو خریدا گیا تھا بشرطیکہ اس کے دام زر (کی شکل میں) دیے ہوں کیونکہ اس طریقہ سے مالیت پہچاننے میں پوری سہولت ہے، اور اگر سامان تجارت کو زر کے سوا کسی اور چیز کے معاوضہ میں (یعنی بطور بارٹر) خریدا ہے تو ایسے زر سے اندازہ کیا جائے جس کا چلن زیادہ ہو۔ امام محمدؒ کی رائے میں تجارتی سامان کی قیمت کا اندازہ زیادہ چلن والے زر کے ساتھ کرنا لازمی ہے۔[2]

قیمت معین کرنے میں فقہاء نے اپنی اپنی جو رائے ظاہر کی ہے اور زر طلاء یا نقرہ میں قیمت کی تعیین کے متعلق جو بحث کی ہے وہ با آسانی سمجھ میں آ سکتی ہے اگر ہم موجودہ زمانہ کے سونے چاندی کی قیمتوں کے اُتار چڑھاؤ پر نظر رکھیں۔ قانون طلب و رسد کے تحت ان دونوں کی قیمتوں میں جو نسبت ہے وہ کبھی برقرار نہیں رہتی اور یہی اُتار چڑھاؤ اور قیمت کی نسبت کا فرق اُس زمانہ میں بھی ہوتا رہتا تھا چنانچہ محصول جزیہ کے بیان میں ہم دیکھ چکے کہ امام مالکؒ (المتوفی ۱۷۸ھ) نے جزیہ کی جو مقداریں بتائی ہیں وہاں سونے اور چاندی میں ۱ : ۱۰ کی نسبت ہے اور امام ابو یوسفؒ (المتوفی ۱۸۳ھ) نے ۱ : ۱۲ بتائی ہے۔

---

[1] ھدایہ ج ۱ کتاب الزکوٰۃ فصل فی العروض

[2] ھدایہ ج ۱ کتاب الزکوٰۃ فصل فی العروض

تجارتی مال پر محصول عائد کرنے سے ایک فائدہ یہ بھی ہو گا کہ تاجر نہ احتکار کریں گے اور نہ مال کو سال بھر تک روک کر مصنوعی طریقوں سے اشیاء کی قیمتیں بڑھانے کی کوشش کریں گے، لیکن ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ تاجر جو بھی محصول ادا کرتے ہیں وہ اپنی جیب سے نہیں بلکہ بالواسطہ خریداروں سے اس کی کسر نکال لیتے ہیں" امام داؤد کہتے ہیں کہ تجارتی مال میں زکات نہیں ہے وہ اس رائے میں تمام جماعت سے منفرد ہیں۔[1]

زکات کی ادائی کی تاریخ محصول زکات ہر سال ماہ رمضان میں وصول کیا جاتا ہے۔

حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عثمانؓ کے عہد میں یہ طریقہ رائج تھا کہ صاحب نصاب اشخاص اگر ملازمین سرکار ہوتے تو ان کی تنخواہوں سے محصول زکات وصول کر لیا جاتا تھا۔[2]

اگر کوئی شخص زکات ادا نہ کرے "اگر کوئی شخص اپنے مال کی زکات کو چھپائے اور عامل کو باوجود اس کے حق بجانب ہونے کے نہ دے تو عامل کو جب بھی اطلاع ملے وہ لے سکتا ہے۔ اگر چھپانے کی یہ وجہ معلوم ہو جائے کہ وہ ادا کرنا چاہتا تھا تو سزا نہ دے اور واجب سے زیادہ وصول نہ کرے۔ امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ اس کا آدھا مال لے لے۔ رسول اللہ کا ارشاد ہے کہ جو شخص زکات ہضم کرے گا میں اس سے زکات اور اس کا آدھا مال لے لوں گا یہ صرف اللہ کا حق ہے آل محمد کا اس میں کچھ نہیں، مگر حدیث "لیس فی المال حق سوی الزکوٰۃ" بظاہر اس حدیث کے معارض ہے اس لیے معلوم ہوا کہ پہلی حدیث ایجاب پر محمول نہیں اس کا مقصد صرف ڈرانا دھمکانا ہے"[3]

---

[1] ۔ ماوردی: الاحکام السلطانیہ باب ۱۱ صفحہ ۱۱۵۔

[2] ۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو موطا، کتاب الزکوٰۃ نیز اس کی مختلف شرحیں

[3] ۔ ماوردی: الاحکام السلطانیہ باب ۱۱ صفحہ ۱۱۶۔

"مال باطن کے متعلق زکات کے حاکم کو کچھ تعرض کرنے کا حق نہیں۔ مال والے خود ادا کرنے کا حق رکھتے ہیں اگر یہ خوشی حاکم کو دینا چاہیں تو قبول کرلے اور تقسیم کرنے میں ان کا معاون ہو۔ مال ظاہری کے ساتھ اس کے اختیارات مختص ہیں۔ مال والوں کو مال ظاہر کی زکات حاکم کو ادا کرنے کا حکم دیا جائے گا اس حکم کے متعلق کہ اگر حاکم عادل ہو تو دو قول ہیں ایک یہ کہ حکم ایجابی ہے خود ادا نہیں کرسکتے اور ادا کر بھی دیں تو ادا نہ ہوگا۔ دوسرا یہ کہ حکم استحبابی ہے تاکہ اطاعت کا اظہار ہو اگر خود ادا کریں تو زکات ادا ہوجائے گی۔ ان ہر دو قول کے ساتھ یہ امر لحاظ کے قابل ہے کہ زکات کے اگر ادا کرنے سے لوگ انکار کردیں تو ان سے جنگ کی جائے گی چنانچہ ابوبکر صدیقؓ نے زکات کے منکرین سے جنگ کی تھی۔ اس لیے کہ انکار کرنا حکام سے بغاوت کے مثل ہے ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ اگر لوگ خود زکات ادا کرنے لگیں تو جنگ نہ کی جائے گی[1]"

عامل کی خیانت اگر وصول کرنے والے یعنی "عامل" سے خیانت سرزد ہو تو امام اس پر مقدمہ چلائے گا اور مال والوں کو اس باب میں دخل دینے کی کوئی ضرورت نہیں خود ارباب اموال کچھ نہ کریں[2] کیونکہ امام کے عامل کو ادا کرتے ہی زکات ان پر سے ساقط ہوجاتی ہے البتہ امام کے پاس فریاد لے کر جاسکتے ہیں[3]

زکات کی شرح میں اضافہ سوال یہ ہے کہ آیا رفاہ عامہ کی خاطر زکات کی مقدار میں اضافہ کرنے کا حکومت کو اختیار ہے یا نہیں! اکثر فقہاء کا یہ فیصلہ ہے کہ زکات کے سوا بھی مال و دولت میں غریبوں کا حق ہے

"فاطمہ بنت قیس کہتی ہیں کہ رسول کریمؐ نے زکات کے بارے میں میرے پوچھنے پر ارشاد فرمایا کہ

اِنَّ فِی الْمَالِ حَقًّا سِوَی الزَّکٰوۃ . مال میں زکات کے سوا بھی حق ہے۔

پھر آپ نے سورۂ بقر کی یہ آیت پڑھی: لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْھَکُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ...[4]
پ ۲ بقرا ع

---

[1] ماوردی: الاحکام السلطانیہ باب ۱۱ صفحہ ۱۱۹ [2] ماوردی: الاحکام السلطانیہ باب ۱۱ صفحہ ۱۲۰
[3] ماوردی: الاحکام السلطانیہ باب ۱۱ صفحہ ۱۲۰ [4] ترمذی کتاب الزکاۃ۔

مذکورہ آیت میں بتایا گیا ہے کہ صرف مشرق کی سمت یا مغرب کی سمت رُخ کر کے نماز پڑھنا یا زکوٰۃ ادا کرنا ہی نیکی نہیں ہے بلکہ قرابت داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں، سوال کرنے والوں اور کسی کو غلامی سے آزاد کرانے پر رقم خرچ کرنا بھی نیکی ہے ناگہانی یا مفاجاتی حالات میں ضرورت سے زیادہ مال حاصل کیا جا سکتا ہے چنانچہ "ابوسعید الخدری رضی کا بیان ہے کہ رسول کریم نے فرمایا کہ جس کے پاس سواری کے لیے زائد اونٹ ہو تو جس کے پاس سواری نہیں ہے اُس کو دیدینا چاہیے، جس کسی کے پاس زائد توشہ ہو تو اُسے چاہیے کہ بے توشہ والے کو دے دے[1]"

"ابوسعید کہتے ہیں کہ اسی طرح رسول اللہ مختلف اموال کا تذکرہ فرماتے چلے گئے حتیٰ کہ ہم لوگوں کا یہ خیال ہو گیا کہ ضرورت سے زائد مال میں ہم میں سے کسی کا کوئی حق نہیں ہے[1]"

"حضرت عمر رض نے کہا کہ اگر مجھے پہلے ہی اس امر کا اندازہ ہوتا جو بعد کو ہوا تو میں مالداروں سے زاید مال و دولت کو لے کر نادار مہاجرین میں تقسیم کر دیتا[2]"

"اسی طرح حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے تھے کہ مالداروں کے مال میں حاجتمندوں کا اس قدر حق فرض کیا گیا ہے جو ان کی بنیادی ضرورتوں کو کافی ہو سکے اگر مالداروں کے مال کو روکنے سے لوگ بھوکے اور ننگے رہیں یا تنگی میں بسر کریں تو قیامت میں حق تعالیٰ کا محاسبہ اور عذاب ان پر حق ہے[2]"

دور اول و دور ثانی کے نامور فقہا کا یہ فیصلہ ہے کہ

فِي مَالِكَ حَقٌّ سِوَى الزَّكَاة[3] تمہارے مال میں زکات کے سوا بھی حق ہے۔

غرض اسلامی معاشیات کے نقطۂ نظر سے مالی مطالبات صرف زکات تک ہی محدود نہیں بلکہ زکات ادا کرنے والوں کو صدقہ فطر بھی ادا کرنا پڑتا ہے۔

---

[1] ۔ صحیح مسلم نیز مشکوٰۃ، کتاب الجہاد باب آداب السفر [2] کتاب الاموال صفحہ ۵۹۶ نمبر ۱۹۰۹۔

[3] ۔ کتاب الاموال صفحہ ۵۹۵ نمبر ۹۲۶ مذکورہ بالا فیصلہ ابن عمر، طاؤس اور مجاہد کا ہے نیز کتاب الاموال صفحہ ۵۹۵ نمبر ۹۲۶۔

اضحیہ کی قربانی بھی ان پر واجب ہے جو ظاہر ہے کہ مالی مطالبات ہی کی مختلف شکلیں ہیں۔ یہی نہیں بلکہ والدین، اقربا، اعزا وغیرہ کے متعلق قرآنی ہدایتیں موجود ہیں کہ اگر ضرورت پڑے تو ان کی مالی امداد بھی واجب ہے اس طرح امداد کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہو کر ملت کے نادار عوام اسی کے ذیل میں آجاتے ہیں۔

حکومت یا امام کو زکات یا دوسرے محصولوں کے وصول کرنے کا حق اس وجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ وہ ملک کی حفاظت کرتا ہے۔ اگر وہ ملک میں امن و امان قایم رکھنے میں ناکام ثابت ہو تو پھر محصول وصول کرنے کا حق بھی نہیں رکھتا، چنانچہ صاحب ھدایہ لکھتے ہیں "اگر خارجیوں (باغیوں) نے خراج اور جنگل میں چرنے والے مویشیوں کی زکات وصول کر لی تو لوگوں سے مکرر نہ لی جائے کیونکہ امام نے ان لوگوں کی حفاظت نہیں کی۔

وَالْجِبَايَةُ بِالْحِمَايَةِ۔[1] اور محصول تو حمایت کرنے ہی پر ہے۔

(۱۱) زکات الفطر

ماہِ رمضان کے ختم پر عید کے دن یعنے شوال کی پہلی کو ہر ایک مسلمان رضاکارانہ طور پر جو غلہ غریبوں میں تقسیم کرتا ہے اس کو بھی فقہاء اور محدثین نے زکات ہی کے نام سے موسوم کیا ہے۔

حدیثوں اور دوسری مستند تاریخوں سے واضح ہوتا ہے کہ رسول کریمؐ نے ۲ھ میں محصول زکات کی فرضیت سے بھی پہلے زکات الفطر کا حکم دیا تھا[2]۔ نیز آپ ہی نے فطرہ کی مقدار بھی معین فرمادی چنانچہ عبداللہ بن عمرؓ کا

---

[1] ھدایہ ج ا کتاب الزکواۃ۔ باب صدقۃ السوائم۔

[2] تاریخ طبری صفحہ ۱۲۸۱ سنہ ۲ھ کے واقعات

بیان ہے کہ" رسول اللہؐ نے صدقہ فطر ایک صاع کھجور یا ایک صاع جو مسلمانوں میں سے ہر آزاد اور غلام مرد اور عورت پر فرض فرمایا ہے[1] کھجور یا جو کے علاوہ کھانے کی اور اشیا بھی دی جا سکتی ہیں۔ عام اصول اور عمل درآمد یہ رہا ہے کہ ملک میں جو غلہ یا اور اشیاء میسر ہوں وہی زکاتِ فطر کے طور پر دی جائیں چنانچہ "ابو سعید الخدریؓ کہتے ہیں کہ ہم صدقہ فطر میں ایک صاع کھانا یا ایک صاع جَو یا ایک صاع کھجور یا ایک صاع پنیر یا ایک صاع زبیب (خشک انگور) دیا کرتے تھے"[2]

بروز فطر عید گاہ جانے سے پہلے صدقۃ الفطر نکالنا مستحب ہے کیونکہ آنحضرتؐ صدقہ فطر اپنے جانے سے پہلے نکال دیا کرتے تھے اور اس وجہ سے بھی کہ فقیر گھر گھر سوال کرتے پھرنے میں نماز سے غافل نہ ہو جائیں اور صدقہ فطر کو نماز سے پہلے دینے ہی سے یہ مقصد حاصل ہو سکتا ہے[3] اور وہ بھی خوش خوش عید گاہ جاتے ہیں۔

زکاتِ الفطر کے متعلق اس تھوڑی سی تفصیل کے بعد یہ اہم بات یاد رکھنے کی ہے کہ خیر القرون میں زکاتِ الفطر کو بھی صحابۂ کرامؓ نے ایک منظم خیرات کی شکل دے دی تھی اکثر صحابہ غلہ کو دو ایک دن پہلے ہی بیت المال میں بھجوا دیا کرتے تھے چنانچہ "عبد اللہ بن عمرؓ عید الفطر سے دو تین دن پہلے زکاتِ الفطر جس کے پاس جمع ہوتی تھی اپنی زکاتِ الفطر اس شخص کے پاس بھیج دیا کرتے تھے"[4] امام بخاریؒ لکھتے ہیں کہ "لوگ فقیروں کو نہ دیتے تھے بلکہ امام کے عاملوں کو دیتے تھے تاکہ سب مال یکجا کر لیا جائے (اور بعد میں امام کی طرف سے تقسیم ہو)"[5] غرض اسلامی حکومت ایک نمائندے

---

[1] بخاری پ۶ کتاب الزکواۃ صدقۃ الفطر۔
[2] بخاری پ۶ کتاب الزکواۃ صدقۃ الفطر۔
[3] ھدایہ ج ا کتاب الزکواۃ باب صدقۃ الفطر۔
[4] امام مالکؒ: موطا کتاب الزکواۃ باب صدقۃ الفطر نیز بخاری پ۶ کتاب الزکواۃ صدقۃ الفطر۔ [5] بخاری پ۶ کتاب الزکواۃ صدقۃ الفطر۔

طور پر واسطہ بن کر غلہ کی تقسیم میں بھی ان کی مدد کیا کرتی تھی خود رسالت مآبؐ نے حضرت ابو ہریرہؓ کو صدقۂ فطر کا غلہ اکھٹا کرنے پر عامل مقرر کیا تھا[1]

فطرہ کا مصرف

"زکات الفطر کے مصرف کی نسبت سب کا اتفاق ہے کہ وہ مسلمان فقیروں پر صرف کی جائے کیونکہ رسول کریمؐ نے فرمایا ہے کہ انھیں سوال کرنے سے اُس دن مستغنی کردو۔"

"فقہاء کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ ذمیوں کے فقیروں کو فطرہ دینا جائز ہے یا نہیں؟ جمہور کا مسلک یہ ہے کہ جائز نہیں ہے اور امام ابوحنیفہؒ کہتے ہیں کہ دینا جائز ہے۔ اختلافِ رائے کا سبب یہ ہے کہ فقیروں کو جو مال دیا جاتا ہے وہ ان کی غربت کی وجہ سے دیا جاتا ہے یا غربت اور اسلام کی وجہ سے، جن لوگوں نے غربت اور اسلام کو شرطِ عطا قرار دی تو انھوں نے ذمیوں کو دینا ناجائز ٹھیرایا اور جنھوں نے فقط غربت عطا کی شرط قرار دی ہے وہ ذمی فقیروں کو بھی دینے کی اجازت دیتے ہیں"[2]

بہرکیف صرف الفاظ کی تعبیر کی بناء پر یہ اختلاف رائے پیدا ہوا ہے۔

زکاتِ فطر کے ذریعہ غریبوں کو بہتر قسم کی غذا ملتی ہے ماسوا اس کے عشر کے نام سے مسلمان اپنی مملوکہ اراضی کا جو لگان اجناس کی شکل میں بیت المال کو ادا کرتے ہیں اس کا یہی مقصد ہے کہ غریبوں کو بہتر قسم کی پیداوار میسر ہو اور ان کی کارکردگی میں اضافہ ہو، اس بارے میں قرآن کے یہ حکم دیا ہے کہ

أَنفِقُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّا أَخْرَجْنَا لَكُم مِّنَ الْأَرْضِ۔

اپنی کمائی میں سے عمدہ چیز کو (اللہ کی راہ میں) خرچ کرو اور اس میں سے جو ہم نے زمین سے پیدا کیا۔

پ۳ بقرہ ع ۳۶

---

[1] تاریخ طبری صفحہ ۱۲۸۱

[2] بدایۃ المجتہد ج ۱ زکواۃ الفطر صفحہ ۲۵۶

(۱۲) مسئلہ زکات پر تبصرہ

عصری رجحانات لندن یونیورسٹی کے سابق پروفیسر معاشیات اور انگلستان کے سابق وزیر تجارت ڈاکٹر ڈالٹن نے ایک جرمن معاشیات کے ماہر واگنر (Wagner) کی تعریف میں یہ لکھا ہے کہ محصول کو آمدنیوں کی عدم مساوات کے گھٹانے میں استعمال کا خیال اسی نے ظاہر کیا" واگنر تعریف و تحسین کا اس لیے مستحق ہے اسی نے محصول اندازی کو آمدنیوں کی عدم مساوات کو کم کرنے کے لیے استعمال کرنے پر زور دیا گو کہ مالیات عامہ میں اس معاشرتی سیاسی خیال کو بعض دوسرے بلند پایہ مسلم الثبوت ماہروں نے ناپسند کیا تاہم جدید عملی طریقوں میں روز افزوں اس خیال کے استعمال سے اس کی معقولیت کا پورا ثبوت ملتا ہے[1] بہرطور عصر جدید کی دنیا اندھیرے میں ٹٹولتے ٹٹولتے آج جس نقطہ تک پہنچی ہے ٹھیک یہ وہی نقطۂ نظر ہے جو آج سے ساڑھے تیرہ سو سال پہلے محصول زکات سے متعلق اسلامی معاشیات نے پیش کیا تھا، ہم بھی واگنر کی اس وجہ سے تعریف کرتے ہیں کہ اس نے اسلامی محصول کے اس قدیم نظریہ کی پرانی شراب کو اپنی تحقیق کے نئے جام میں چھلکا دیا ہے، محصول زکات کا مقصد ہی یہ بتایا گیا ہے کہ "دولت مالداروں سے لے کر ناداروں میں تقسیم کی جائے"[2]

مذکورہ حدیث کی تفصیل یہ ہے کہ "سرور کائنات ؐ نے حضرت معاذ ابن جبل کو (مصدق بنا کر) یمن بھیجا اور فرمایا کہ (اے معاذ!) تم وہاں کے لوگوں کو اس اقرار پر مائل کرنا کہ اللہ کے سوا اور کوئی خدا نہیں ہے اور میں اللہ کا رسول ہوں پس اگر وہ اس بات کو مان لیں تو انھیں

---

[1] ـ ڈالٹن: پرنسپلز آف پبلک فینانس باب ۱۵ صفحہ ۱۳۰ـ

[2] ـ بخاری باب کتاب المزکواۃ

اطلاع دیناکہ اللہ نے رات دن میں ان پر پانچ نمازیں فرض کی ہیں۔ اگر وہ اس بات کو مان لیں تو انھیں اطلاع دیناکہ اللہ نے ان کے مالوں میں صدقہ فرض کیا ہے جو ان کے مالداروں سے لیا جائے گا اور ان کے ناداروں پر تقسیم کیا جائے گا[ا]

یورپ اور امریکہ کے سرمایہ دارانہ معاشرہ میں دولت مند اور مفلسوں میں دولت کی جو عدم مساوات ہے اس کو پاٹنے کے لیے معاشیئین نے انکم ٹکس (محصول آمدنی) کی حمایت کی ہے کہ اس ذریعے سے دولت، دولتمندوں سے لے کر غریبوں کی فلاح و بہبود پر صرف کی جاتی ہے اسی بنا پر انھوں نے انکم ٹکس کو دولت کی عدم مساوات کے پاٹنے کا ایک بہتر آلہ قرار دیا ہے۔ کاش! یہی ہوتا! لیکن عملی کیفیت یہ ہے کہ دولتمندوں سے جو محصول بطور انکم ٹکس کے لیا جاتا ہے پھر ان ہی کی جیبوں میں سود کی شکل میں چلا جاتا ہے گویا ایک ہاتھ سے دیا اور دوسر ہاتھ سے لیکر پھر اپنی جیب میں ڈال لیا، وہی ڈاکٹر ڈالٹن نے فبروری ۱۹۲۵ء میں کالوین کمیٹی کے روبرو شہادت دیتے ہوئے بیان کیا کہ موجودہ انکم ٹکس اور زائد ٹکس (سوپر ٹکس) کی آمدنی دو کروڑ ۶۰ لاکھ پونڈ سے کچھ بڑھی ہوئی ہے اور موجودہ سالانہ واجب الادا سود کی مقدار اور ذخیرہ ادائی (سنکنگ فنڈ) تین کروڑ پچاس لاکھ بلکہ اس سے کم ہوتی ہے ۱۹۱۳ء میں انکم ٹکس اور زائد ٹکس سے جو آمدنی چار کروڑ ۷۰ لاکھ پونڈ ہوئی وہ بھی قرضوں کی ادائی سے یعنے دو کروڑ پچاس لاکھ پونڈ پر حاوی تھی یعنے تقریباً اس سے دوگنا۔ ایسی صورت حال میں اجمالاً یوں کہا جا سکتا ہے کہ محصول ادا کرنے والے ہی اپنے قرضوں کا سود لیتے ہیں، بیرونی قرضوں کو خارج کھاتہ رکھ کر بھی انکم ٹکس

ا۔ بخاری پ۶ کتاب الزکواۃ نیز بخاری پ۱۷ کتاب المغازی بخاری کے علاوہ موطا مسلم، ابوداؤد، ترمذی وغیرہ کے ابواب الزکواۃ۔ بعض حدیث کی کتابیں مثلاً خود بخاری شریف نسائی شریف کی کتاب الزکواۃ تو اسی حدیث سے شروع ہوتی ہے۔

اور زاید ٹکس کو جمع کرنا اور سود ادا کرنا محض قوم کے چھوٹے سے گروہ میں دولت کی منتقلی ہے[1]

سرکاری مصارف کے تذکرہ میں ہم آگے بیان کریں گے کہ اسلامی بیت المال میں زکات کے نام سے وصول کیا ہوا محصول ایک علیحدہ مدمیں رکھا جاتا تھا اور اس کے مصارف بھی عام مدوں سے الگ تھلگ تھے

زکات کی اہمیت محصول زکات اسلام کا ایک اہم بنیادی ادارہ ہے یہ ایک معاشی اور معاشرتی مسئلہ کا بڑا حل ہے اور اسلامی معیشت کی روح رواں ہے۔ وجود باری تعالیٰ کے یقین اور نماز کے بعد اسلام کا سب سے اہم رکن زکات ہے قرآن مجید نے بار بار اس کا اعادہ کیا ہے کہ "نماز قائم کرو اور زکات ادا کرو" کوئی دولتمند نہ تو مسلمان ہوسکتا ہے اور نہ مسلمان ہی رہ سکتا ہے اگر وہ زکات ادا نہ کرے۔

سرمایہ داروں سے حضرت ابوبکرؓ کا جہاد حضرت ابوبکرؓ نے سرمایہ دار منکرین زکات سے جنگ کی تھی اس کی تفصیل یہ ہے کہ

"رسول اللہؐ کی وفات کے بعد اُسامہ کی مہم کو رسول اللہؐ کی ہدایت کے بموجب شام کے اس علاقہ کو جہاں اُسامہ کے باپ زید بن حارثہ شہید ہوئے تھے روانہ کرکے خود ابوبکر صدیقؓ مدینہ ہی میں رہے اس کے علاوہ اور کوئی کام انھوں نے نہیں کیا۔ اس کے بعد ہی عربوں کے وفد دین اسلام سے مرتد ہوکر حضرت ابوبکرؓ کے پاس آئے یہ وہ لوگ تھے جو نماز کے تو قائل تھے اور زکات کے منکر تھے[2] اور یوں "کوئی پورا قبیلہ مسلمان نہ رہا تھا ہر طرف نفاق پھوٹ پڑا تھا اور یہودیوں اور عیسائیوں کی للچائی ہوئی نظریں مسلمانوں پر پڑ رہی تھیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے خود مسلمانوں کی حالت اپنی قلت اور دشمن کی کثرت کی وجہ سے ان بھیڑ بکریوں کی سی ہوگئی تھی جو موسم سرما کی

---

[1] ڈالٹن: پرنسپلز آف پبلک فینانس باب ۱۱ صفحہ ۱۴۵

[2] تاریخ طبری ص ۱۸۷ سنہ ۱۱ ھ کے واقعات۔

برساتی رات میں تتر بتر ہو گئی ہوں[1] اور بھیڑیا ان کی تاک میں ہو،" اس نوبت پر وقت حضرت صدیق اکبرؓ نے اپنے بہترین تدبر، اولوالعزمی اور مستقل مزاجی سے کام لیا اور یوں اللہ نے حضرت صدیقؓ کو حق پر راسخ کر دیا۔ خلیفہ منتخب ہونے کے بعد ہی اپنی ابتدائی تقریروں میں اس حقیقت کا اظہار فرما دیا کہ "قلت تعداد سے آنحضرتؐ کے صحابہ کبھی خائف اور متاثر نہیں ہوئے"[2]

"حضرت ابوہریرہؓ کا بیان ہے کہ جب رسول اللہؐ کی وفات ہو گئی تو ابوبکرؓ خلیفہ ہوئے اور عرب میں جن کو کافر ہونا تھا کافر ہو گئے"

"حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ سے کہا کہ آپ لوگوں سے کیونکر لڑیں گے رسول اللہؐ نے فرمایا ہے کہ مجھے لوگوں سے لڑنے کا حکم دیا گیا ہے یہاں تک کہ وہ لا الہ الا اللہ کہیں تو انھوں نے اپنی جان اور اپنے مال کو بچا لیا۔ البتہ خدا کا کوئی اور حق اور مطالبہ ہو تو وہ دوسری بات ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا کہ بخدا! میں اس شخص سے ضرور جنگ کروں گا جو نماز اور زکات میں فرق کرے گا کیونکہ زکات مال کا حق ہے۔ خدا کی قسم! رسول اللہؐ کو وہ جتنا دیتے تھے اگر اس میں سے ایک اونٹ باندھنے کی رسی بھی نہ دیں گے تب بھی میں ان سے لڑوں گا۔ حضرت عمرؓ نے کہا خدا کی قسم میں نے دیکھا کہ اللہ جل شانہ نے ابوبکرؓ کا سینہ جنگ کے لیے کھول دیا اور میں نے یہ جانا کہ وہ حق پر ہیں"[3]

"اپنی تعلیم کی اولین تعمیل کے سلسلہ میں پیغمبر اسلام نے دولتمندوں کو سب سے پہلے دبوچا اور انھیں اس کا پابند کیا کہ اپنی زائد از ضرورت دولت کا ایک معین و معقول حصہ لازمی طور پر مرکز کو بطور ٹکس ادا کیا کریں اس کی ادائی میں اونٹ باندھنے کی ایک رسی کی کمی بھی بغاوت سمجھی گئی۔

---

[1] - تاریخ طبری ص ۱۸۴۸ اسلاھ کے واقعات - [2] ایضاً
[3] - بخاری پ ۷ کتاب الزکواۃ نیز مسلم، ابوداؤد، نسائی وغیرہ کے کتاب الزکواۃ ملاحظہ ہو۔ نیز تاریخ طبری ص ۱۸۴۳ سلسلھ کے واقعات

اور ایسوں کے خلاف پیغمبر اسلام کے سب سے پہلے جانشین صدیق اکبرؓ نے اعلان جنگ کردیا اور جنگ کی ہولناکیوں نے وہ بات سمجھادی جو ترغیب و تفہیم کے باوجود سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ مانع زکات دولتمندوں کے خلاف ان جنگوں کی جیسی چاہیے اہمیت ابھی تک مورخوں نے نہیں سمجھی ہے ورنہ تاریخ معاشرہ انسانی میں وہ ایک نقطۂ انقلاب ہیں جہاں اُس نے تقسیم و گردش دولت کی ضرورت کو محسوس کرایا وہیں رعایا کو اپنے رعایا ہونے کا احساس کردیا، ورنہ سابق میں کم از کم عرب کی حد تک قبیلے کے شیخ اور بزرگ خاندان کے سوا کسی اور انسان کی اطاعت نہ ضروری تھی اور نہ روا رکھی جاتی تھی۔[۱]

آخر میں ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ "خیرات سب مذہب والے دیا کرتے ہیں، مگر ذی استطاعت مسلمانوں کے لیے ایک نصاب مقرر کرنا اور ہر ذی استطاعت کے سرمایہ میں سے فقراء اور مساکین کے لیے نظام خیرات قایم رکھنے والوں کے لیے، ان کے لیے جن کا دل پرچانا منظور ہے، غلاموں کی گردن چھڑانے کے لیے، جن کو تاوان بھرنا پڑے یا قرض دار ہوں، اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے لیے اور مسلمانوں کے لیے $2\frac{1}{2}$ فی صدی مقررہ شرح سے زکات لینا اور اس طرح دنیا میں سب سے پہلے کیپٹل لیوی (Capital Levy) عمل میں لانا یا سرمایہ پر محصول لگانا جسے یورپ کے سوشلسٹ اب تک رائج نہ کرسکے یہ اسلام ہی کی خیرات کا طغرائے امتیاز ہے اور جس طرح اقامت الصلواۃ کا طریقہ خاص ایک مسلمان کی عبادت کو ایک جماعتی نظام کا لازمی فعل بنادیتا ہے اسی طرح زکات کے جمع و خرچ کرنے کا طریقہ ایک مسلمان کی خیرات کو بھی ایک جماعتی نظام کا لازمی فعل بنادیتا ہے"[۲] غرض یوں اسلام نے خیرات کو بھی ایک حکومتی محصول کی طرح

۱۔ ڈاکٹر حمید اللہ مضمون "عہد نبوی میں بین الاقوامی عصبیتوں کو دور کرنے کی بعض تدبیریں" ماخوذ از رسالہ سیاست حیدرآباد دکن بابت جون ۱۹۴۴ء ۔ ۲۔ مضامین مولانا محمد علی مرحوم صفحہ ۲۱۷ مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی ماخوذ از ہمدرد ۳۱ / مارچ ۱۹۲۷ء۔

منظم کر دیا۔

اسلام نے اگر ایک طرف گداگری کو ممنوع اور معیوب قرار دیا ہے تو ساتھ ہی ساتھ دوسری طرف بے روزگاروں، اپاہج معذوروں کے سماجی تحفظ کے لیے سرکاری موازنہ میں رقم کی گنجائش رکھی، لیکن معیشت کے وسیلوں میں خود زکات کے محصول کی ثانوی حیثیت ہے۔ یہ انسانی عزت و وقار کے منافی ہے کہ وہ حکومت سے مدد حاصل کرے۔ اس کے علاوہ اسلامی معاشیات نے پیدائش دولت پر جو زور دیا ہے اگر اس پر عمل ہو تو کوئی مسلمان بے کار یا بے روزگار نہیں رہ سکتا اور دولت اتنی بڑھے گی اور اس خوش اسلوبی سے اس کی تقسیم ہوگی کہ زکات حاصل کرنے والے مستحقین ڈھونڈے سے بھی نہ مل سکیں گے۔ سرکار دو عالم فرمایا کرتے تھے کہ "اے لوگو! صدقہ دو اس لیے کہ تمھارے اوپر ایک زمانہ ایسا آنے والا ہے کہ آدمی اپنا صدقہ لیے لیے پھرے گا اور اس کو قبول کرنیوالا کوئی نہ ملیگا"[1]

عہد رسالت کے آخری دنوں میں اور عہد خلافت راشدہ میں جو خوش حالی نصیب ہوئی تھی اس کا تذکرہ قبل ازیں ہو چکا۔ اجرت کے تذکرہ میں ہم نے بتایا ہے کہ اس زرین عہد میں بعض بوجھ اٹھانے والے مزدور تک لکھ پتی بن چکے تھے۔ مبارک عہد رسالت اور عہد خلافت راشدہ کا کیا تذکرہ! خود اموی خلیفہ حضرت عمر بن عبد العزیز کے عہد میں بھی اتنی آسودہ حالی تھی کہ وسیع اسلامی مملکت میں زکات لینے والے نہیں ملتے تھے اور غریب سے غریب بھی زکات ادا کرنے کے قابل ہو گئے تھے[2]

(۱۳) جدید یا ہنگامی محاصل

اگر بیت المال خالی ہو اور خزانہ میں روپیہ نہ ہو یا مصارف کے مقابلہ میں آمدنی کم ہوئی ہو اور ساتھ ہی ناگہانی حادثے پیش آجائیں تو امام مصلحت عامہ کی خاطر ملک والوں پر جدید یا ہنگامی محاصل عاید کر سکتا ہے۔

گذشتہ صفحات میں تفصیل گزر چکی کہ حضرت عمر نے صحابہ کرام کے مشورہ سے محصول درآمد اور جنگل میں چرنے والے گھوڑے گھوڑیوں پر

---

[1] بخاری باب کتاب الزکوٰۃ نیز مسلم، ابوداؤد وغیرہ کے ابواب الزکوٰۃ۔
[2] ابن جوزی، سیرۃ عمر بن عبد العزیز ص ۸۵۔

محصول زکات عائد کیا تھا، اسی طرح آپ نے سمندر کی پیداوار عنبر پر بھی خمس عائد کیا تھا۔ حضرت علیؓ نے جنگلات، کنٹوں اور تالابوں کی مچھلیوں پر محصول عائد کیا۔ اسی طرح حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے گایوں کے مثل بھینسوں پر بھی محصول زکات عائد کیا کیونکہ گھوڑیوں اور گایوں کے مثل ان میں بھی منفعت موجود تھی اور یہ محاصل اس وقت عائد کیے گئے جب کہ بیت المال کو حد سے زیادہ آمدنی ہو رہی تھی۔

اگر موازنہ میں خسارہ آئے یا ناگہانی ضروریات درپیش ہوں تو حکومت بدرجہ اولیٰ نئے محاصل عائد کرنے کا حق رکھتی ہے وہ حادثوں کے مصارف تمام مسلمانوں پر عائد ہوتے ہیں بوقت ضرورت روپیہ ان سے وصول کیا جا سکتا ہے[1]۔

جنگ تبوک کے زمانہ میں جب کہ رسول کریمؐ زکات عشر وغیرہ عائد کر چکے تھے ناگہانی طور سے جب رقم کی ضرورت پڑی تو آپ نے مسلمانوں سے مزید رقمی اعانت طلب فرمائی چنانچہ فاروق اعظمؓ نے اپنی نصف دولت پیش کی اور حضرت صدیق اکبرؓ نے اپنی تمام دولت حاضر کر دی، رسول اللہؐ نے دریافت فرمایا کہ تم نے اپنے لیے بھی کچھ رکھ چھوڑا ہے؟ کہنے لگے کہ میرے لیے اللہ اور اس کا رسول بس ہے۔

ان محاصل کو عربی میں نوائب سے موسوم کیا جاتا ہے نوائب جمع کا صیغہ ہے اس کا واحد نائبۃ ہے جس کے لفظی معنی "آن پڑنے" کے ہیں یعنی ایسے حادثے جو آدمی کو اتفاقاً پیش آئیں اور جن کا برداشت کرنا گراں گذرے۔

نوائب کی قسمیں فقہاء نے نوائب کی دو قسمیں قرار دی ہیں (۱) ایک تو ایسے محاصل ہیں جو مصلحت عامہ کی خاطر جائز طور پر عائد کیے جاتے ہیں (۲) دوسرے وہ محاصل ہیں جو ظالم بادشاہوں اور

[1] ماوردی: الاحکام السلطانیہ باب ۱۸ ص ۲۰۴ نیز ابو یعلیٰ: الاحکام السلطانیہ ص ۲۴۳

حکمرانوں نے صرف اپنے لیے زبردستی عائد کیے ہوں اور جس سے مفادِ عامہ وابستہ نہ ہو، پھر ان محاصل میں بعض تو وقتیہ ہنگامی طور پر عائد ہوتے ہیں اور بعض دوامی طور سے۔

غرض ایسے محاصل جو مصلحت عامہ کی خاطر جائز طور پر عائد کیے جائیں ان کے متعلق فقہاء لکھتے ہیں کہ ان کی ادائی ملک کے باشندوں کا فرض ہے۔

وہ ایسے جدید محاصل جو جائز طور پر عائد کیے گئے ہیں جیسے مشترکہ نہر کھودنے کے لیے، یا پہرہ دار کی اجرت تنخواہ کے لیے، یا لشکر آراستہ کرنے، یا جنگی قیدیوں کو چھڑانے کے لیے یا اس کے سوا اور امور کے لیے تو ایسے محاصل کی کفالت بالاتفاق جائز ہے[1] ایسے محاصل کی ادائی لازم قرار دینے کی وجہ ھدایہ کے شارح ابن ھمام یہ بیان کرتے ہیں کہ " ایسے جدید محصول کی ادائی ہر ایک مستطیع مسلمان پر واجب ہے کیونکہ اولوالامر کی اطاعت ہر ایسے امر میں واجب ہے جس میں مسلمانوں کی بھلائی ہو"[2]

لیکن ایسے نئے محاصل جن سے عام مفاد وابستہ نہ ہو ان کے ادا کرنے نہ کرنے میں فقہاء کا اختلاف ہے چنانچہ صاحب ھدایہ لکھتے ہیں کہ " اگر نوائب سے وہ نوائب مراد ہیں جو حق بجانب نہیں ہیں جیسے کہ ہمارے زمانہ کے محاصل ہیں تو اس میں فقہاء کا اختلاف ہے اور منجملہ ان فقہاء کے جو صحت کی طرف جھکے ہیں فخرالاسلام علی بزدوی ہیں"[3] امام علی بزدوی کی رائے یہ تھی کہ اگر سرکاری مطالبہ موجود ہو تو اس کی کفالت صحیح ہو جاتی ہے خواہ مطالبہ حق ہو یا باطل۔

ایسے محاصل جو مفاد عامہ سے وابستہ نہیں اور جن کے دینے نہ دینے میں فقہاء کا اختلاف ہے اس کی مثال ابن ھمام نے یہ بیان کی ہے کہ

---

[1] ھدایہ ج ۳ کتاب الکفالۃ ص ۴۳۲ [2] فتح القدیر شرح ھدایہ ج ۵ کتاب الکفالۃ۔
[3] ھدایہ ج ۳ کتاب الکفالۃ۔

مَا لَيْسَ بِحَقٍّ كَالْجِبَايَاتِ الْمُوَظَّفَةِ عَلَى النَّاسِ فِي زَمَانِنَا بِبِلَادِ فَارِسَ عَلَى الْخَيَّاطِ وَالصَّبَّاغِ وَغَيْرِهِمْ لِلسُّلْطَانِ فِي كُلِّ يَوْمٍ أَوْ شَهْرٍ أَوْ ثَلَاثَةِ أَشْهُرٍ فَإِنَّهَا ظُلْمٌ۔[1]

جو حق بجانب نہیں ہے مثلاً وہ محاصل جو ہمارے زمانہ میں ایرانی شہروں میں لوگوں پر عائد کیے گئے ہیں چنانچہ سلطان کے لیے درزیوں، رنگریزوں وغیرہ پر یومیہ ماہانہ یا سہ ماہی جو محصول لگائے گئے ہیں تو ظلم ہیں۔

اور اس سے بہت پہلے بنو امیہ کے عہد میں بھی نئے نئے محاصل عاید کیے گئے تھے لیکن جب اموی خلیفہ عمر بن عبدالعزیز نے ان محاصل کو اٹھا لیا کیونکہ ان سے رعایا پر بے جا بار پڑ رہا تھا۔ عمر بن عبدالعزیز رضؓ نے اپنے گورنروں کو حکم دیا کہ ٹکسال میں روپیہ ڈھالنے کا ٹیکس، چاندی پگھلانے کا ٹیکس، عرائض نویسی کا ٹیکس، شادی کا ٹیکس، گھروں کا ٹیکس، نکاح کا ٹیکس، نو روز اور مہرجان کے تحفے تحائف ختم کیے جائیں۔

ظالمانہ نوائب کے بارے میں علامہ سرخسی کا جہاد

نوائب کے سلسلہ میں شمس الائمہ سرخسیؒ کا تذکرہ ضروری ہے جو پانچویں صدی ہجری کے سب سے بڑے فقیہ گزرے ہیں۔ ماوراء النہر کے علاقہ میں بھاری بھاری نئے محاصل ـــــ جن کا عام مفاد سے کچھ تعلق نہ تھا ـــــ عائد کیے گئے تو انھوں نے اس کے خلاف آواز بلند کی چنانچہ انھوں نے کہا کہ "یہ حکم تو اس زمانہ میں تھا کیونکہ اس وقت مصیبت اور جہاد میں اعانت ہوا کرتی تھی، اور ہمارے زمانہ میں تو اکثر نوائب ظلم سے لیے جاتے ہیں، پس جس شخص سے ممکن ہو کہ اپنی ذات سے ظلم دور کرے تو وہ اس کے حق میں بہتر ہے"۔[2]

شمس الائمہ نے یہی نہیں کہا بلکہ اس کا فتویٰ بھی دیا کہ "اگر کوئی دینا ہی چاہتا ہو تو ایسے شخص کو دے جو ظلم کو اپنے نفس سے دور کرنے سے عاجز ہے یا ایسے نادار کو دے جو اپنی ناداری کی اعانت ظلم کے مقابلہ میں کرے اور دینے والا ثواب پائے"۔[3]

۱۔ ابن ہمام: فتح القدیر شرح ہدایہ ج ۵ کتاب الکفالۃ صفحہ ۴۳۳۔ ۲۔ ابو یوسف: کتاب الخراج صفحہ ۴۹

۲۔ ابن ہمام: فتح القدیر شرح ہدایہ ج ۵ کتاب الکفالۃ صفحہ ۴۳۳

۳۔ ابن ہمام: فتح القدیر شرح ہدایہ ج ۵ کتاب الکفالۃ صفحہ ۴۳۳

جس کا بظاہر مطلب یہ ہوا کہ شمس الائمہ سرخسی نے نہ صرف ان ظالمانہ محاصل کو ظلم قرار دیا بلکہ مسلمانوں کو ابھارا کہ وہ خود بھی محصولات ادا نہ کریں اور جو ظلم کا علانیہ مقابلہ نہ کر سکتے ہوں انھیں چاہیے کہ ان جانبازوں کی رقم سے مدد کریں جو ڈٹ کر ظالم حکمران کا مقابلہ کر رہے ہوں اور اس طرح اعانت کرنے والے اُخروی ثواب کے مستحق ہوں گے۔ اس قسم کے فتوی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ارباب اقتدار غصہ سے آگ بگولہ ہو گئے، خاقان نے اوزجند کے ایک کنویں میں انھیں قید کر دیا اور وہ دس سال سے زیادہ عرصہ تک اس میں قید رہے۔ وہ اس کنویں میں کسی کتاب کے مطالعہ کے بغیر طالب علموں کو املا کراتے تھے اور ان کے شاگرد کنویں کے اوپر بیٹھتے تھے[1] اسی قید کے دوران میں انھوں نے کتاب شرح السیر الکبیر اور مبسوط جیسی تیس جلدوں کی ضخیم کتاب نیز اصول فقہ کی ضخیم تالیفات یہ دونوں کتابیں زبانی لکھوا دیں۔

شمس الائمہ کا قید ہونا بیکار نہ ہوا، ظالم حکمران کے خلاف ملک میں بغاوت کے شعلے بھڑکنے لگے اور حکومت کا تختہ اُلٹ گیا، ملک شاہ سلجوقی ماوراء النہر بخارا اور تمام ترکی علاقہ کا حاکم ہوا۔

وَاَبْطَلَ المکُوسَ وَالخِفَارَاتِ فِی جَمِیعِ الْبُلْدَانِ[2] — اُس نے تمام شہروں میں راہ داری اور چنگی کے محصول کو موقوف کرا دیا۔

اور اس طرح شمس الائمہ سرخسی نے ظالم حکمران سے عامۃ الناس کو نجات دلائی۔ خیر یہ تو ناجائز محاصل کا تذکرہ تھا۔

جائز نوائب — اگر کسی شہر کی نہر وغیرہ بند ہو جائے یا شہر پناہ گر جائے یا آنے والے حاجتمند مسافروں کی اعانت نہ ہو تو ایسی صورت میں اگر بیت المال میں سرمایہ موجود ہو اور اس کے خرچ کرنے سے مسلمانوں کا کوئی نقصان نہ ہو تو بیت المال کے روپیہ سے محتسب نہر کی

---

[1] علامہ محمد الخضری: تاریخ تشریع الاسلامی ص حالات شمس الائمہ سرخی۔

[2] تاریخ ابن خلکان ج ۲ صفحہ ۱۳۲ حالات ملک شاہ سلجوق۔

اصلاح، شہر پناہ کی تعمیر اور مسافروں کی حاجت روائی کا حکم دے کیونکہ یہ حقوق بیت المال پر واجب ہیں ان لوگوں پر نہیں۔ یہی حکم مساجد اور جامع مساجد کے منہدم ہونے پر ہے، اور بیت المال میں سرمایہ نہ ہو تو ان تمام امور کا اہتمام عام مالداروں پر عائد ہوتا ہے کسی خاص شخص کے ذمہ نہیں اگر یہ لوگ اس کو انجام دینے لگیں تو محتسب سے یہ فرض ساقط ہو جاتا ہے[1]

"اگر سرحدی مقام نہ ہو جس سے دار الاسلام کو مضرت پہنچے تو اس کا حکم اتنا سخت نہیں لہذا محتسب کو یہ اختیار نہیں کہ باشندوں سے جبراً اصلاح کرائے کیونکہ یہ حق سلطان پر ہے۔ اگر سلطان کے پاس سرمایہ نہ ہو تو محتسب باشندوں کو اختیار دے کہ خواہ تم یہاں سے منتقل ہو جاؤ اور خواہ یہاں رہ کر اس کی درستی کا بار اٹھاؤ تاکہ دوامی وطن بنانا ممکن ہو، اگر وہ صورت ثانی پر آمادہ ہوں تو ان سب سے امدادی رقم جو کچھ خوشی سے دیں لے اور تھوڑا یا بہت کسی سے زبردستی نہ لے بلکہ اعلان کر دے کہ جس قدر تم خوشی سے دے سکتے ہو دو۔ جس کے پاس مال نہ ہو وہ کام سے مدد کرے۔ ان اقرار و مواعید کے بعد بلحاظ مصلحت ہر جماعت میں ایک ضامن مقرر کر دے تاکہ جو ذمہ داری اس جماعت نے لی ہے اس کو وقت پر پوری کرائے[2]

"اگر والی ملک احکام بلاد اور محاصل کی مقدار میں تبدیلی کرنا چاہے تو ان اجتہادی امور میں جن میں شرعاً کوئی ممانعت نہیں اسباب زیادتی یا کمی کے رونما ہونے پر تبدیلی جائز ہے۔ اور پہلے کی نسبت سے نئے احکام کا نفاذ ضروری ہوگا پس اگر عمل کے وقت صرف نئے احکام کو دیکھا جائے تو جائز ہے مگر احتیاط اس میں ہے کہ دونوں کو دیکھا جائے کیونکہ ممکن ہے کہ

1۔ ماوردی: الاحکام السلطانیہ باب ۲۰ صفحہ ۲۳۳ نیز ابو یعلی ص ۲۷۳

2۔ ماوردی: الاحکام السلطانیہ باب ۲۰ صفحہ ۲۳۳ نیز ابو یعلی ص ۲۷۴

اسباب حادثہ زائل ہو گئے ہوں اور پھر حکم سابق پر عمل درآمد ضروری ہو جاتا ہے۔ اور اگر شرعاً ان تبدیلیوں کی گنجائش نہ ہو اور نہ اجتہاد کو دخل ہو تو احکام سابقہ ہی واجب العمل ہوتے ہیں اور تمام تبدیلیاں مردود ہوں گی خواہ بصورت زیادتی ہوں یا کمی

لَانَّ الزِّيَادَةَ ظُلْمٌ فِى حُقُوقِ الرَّعِيَّةِ — کیونکہ زیادتی رعایا کے حقوق پر ظلم کرنا ہے
وَالنُّقْصَانَ ظُلْمٌ فِي حُقُوقِ بَيْتِ الْمَالِ[1] — اور کمی بیت المال پر ظلم ہے۔

(۱۴) جنگی چندہ

جب تک کہ سرکاری خزانہ میں رقم کی گنجائش ہو جنگی اغراض کے لیے چندہ لینا فقہاء نے مکروہ قرار دیا ہے بصورت دیگر اعلیٰ ضرر کو دور کرنے کے لیے ادنیٰ ضرر برداشت کرنا ضروری ہے ” اور امام کا (جہاد کے لیے) مال کا چندہ لینا مکروہ ہے جب تک کہ مسلمانوں کے بیت المال میں مال ہو کیونکہ یہ اجرت کے مشابہ ہے اور کوئی ضرورت درپیش نہیں ہے۔

لِاَنَّ مَالَ بَيْتِ الْمَالِ مُعَدٌّ لِنَوَائِبِ الْمُسْلِمِيْنَ۔ — کیونکہ بیت المال کا مال اسی واسطے ہے کہ مسلمانوں کے حوادث میں کام آئے۔

” پس اگر بیت المال میں کچھ نہ ہو تو کچھ مضائقہ نہیں کہ لوگ باہم ایک دوسرے کی مدد کریں کیونکہ ایسا کرنے میں تھوڑا ضرر اٹھا کر بڑا ضرر دور کرنا ہوتا ہے اور اس کی تائید اس واقعہ سے ہوتی ہے کہ رسول کریمؐ نے (جنگ حنین میں) صفوان سے چند زرہیں لی تھیں اور نیز حضرت عمرؓ زوجہ والے مرد کی طرف سے بے زوجہ والے مرد کو بھیجتے تھے اور جو شخص جہاد میں جانے کے قابل نہ ہوتا اس کا گھوڑا جہاد میں جانے والے کو دیتے تھے“[2]

---

[1] ۔ ماوردی: الاحکام السلطانیہ باب ۱۸ صفحہ ۱۹۸ نیز ابویعلیٰ ص ۲۴۲ ۔
[2] ۔ ھدایہ ج ۲ کتاب السیر۔ صفوان کی زرہوں کا تذکرہ ابوداؤد، نسائی وغیرہ میں موجود ہے۔ حضرت عمرؓ شادی شدہ کے مقابلہ میں غیر شادی شدہ (بیچلر) کو بھیجتے تھے (ملاحظہ ہو مصنف ابن ابی شیبہ۔

(۱۵) حکومتی قرضے

حکومت کے کاروبار چلانے کا عام طریقہ

عام حالات میں حکومت کو سالانہ جو آمدنی وصول ہوتی ہے اسی کے مطابق موازنہ مرتب ہوتا ہے اور موازنہ کی گنجائش کے لحاظ سے حکومت کے جملہ مصارف کی پابجائی ہوتی ہے لیکن اتفاقی ضرورتیں اور ناگہانی حادثے آن پڑیں تو حکومت نوائب سے کام چلاتی ہے لیکن اگر نوائب سے بھی کام نہ چلے تو حکومت اپنی مشنری چلانے کے لیے لامحالہ قرض لیتی ہے۔

اکثر و بیشتر اشخاص تو اپنی آمدنی کے لحاظ سے اپنی دولت صرف کرتے ہیں برخلاف اس کے حکومت کو اپنے اخراجات کے لحاظ سے رقم حاصل کرنی پڑتی ہے لیکن یاد رہے کہ ملک کے باشندوں پر نئے محاصل عائد کرنے کی بھی ایک حد ہوتی ہے اگر اس سے زیادہ محاصل طلب کیے جائیں تو ملک میں بددلی پیدا ہو کر بدامنی پھیلنے کے علاوہ ملک کے باشندوں کا معیار زندگی بھی پست ہونے کا اندیشہ لگا رہتا ہے۔ اگر معیار زندگی بلند ہونے کے بجائے پست ہو تو باشندگان ملک مفلوک الحال ہو جائیں گے اور مابعد کے سال میں پہلے سال کے مقابل کمتر آمدنی کی توقع کرنی پڑے گی اس سے بڑھ کر اور کیا حماقت ہوگی کہ سونے کا انڈا دینے والی مرغی کو ذبح ہی کر دیا جائے! غرض ان ہی وجوہات کی بناء پر بجائے مزید نئے محاصل عائد کرنے کے حکومتیں چار و ناچار قرض لیتی ہیں۔

اسلامی مملکت کو بھی قرض لینے کا حق حاصل ہے کہ اگر والی کو فساد اور خرابی کا اندیشہ ہو تو بیت المال کی کفالت پر قرض لے سکتا ہے[1] خود رسول کریم[2]

[1] ماوردی: الاحکام السلطانیہ باب ۱۵ صفحہ ۲۰۴ نیز ابویعلیٰ صفحہ ۲۳۷ -

ایک مرتبہ چالیس ہزار کی رقم قرض لی تھی۔[1]

قرضہ، پیدا آور اغراض کے لیے حکومتیں یا تو پیدا آور اغراض کے لیے قرض لیتی ہیں یا غیر پیدا آور اغراض کے لیے، اسلامی مملکت کے بیت المال سے لوگ پیدا آور اور غیر پیدا آور دونوں اغراض کے لیے قرض لیا کرتے تھے۔[2] جب ملک کے باشندے بیت المال سے قرض لینے کا حق رکھتے ہوں تو پھر بیت المال بھی ضرورت پڑنے پر لوگوں سے قرض لینے کا حق رکھتا ہے۔ قرض لینے میں بیت المال وہی اصول اور شرطیں برتے گا جو وہ خود دوسروں کو قرض دینے میں برتے۔

موجودہ زمانہ کی حکومتیں مفاد عامہ و ترقیات عامہ مثلاً نہروں، تالابوں، بندوں، گھاٹوں اور پشتوں کی تیاری، ریلوں کی تیاری، بندرگاہوں، ہوائی اڈوں کی تعمیر، ریلوے لائن، ٹرام لائن اور برقی قوت کی سربراہی وغیرہ جیسے پیدا آور اغراض کے لیے قرض لیتی ہیں چنانچہ جب ضرورت لاحق ہوتی ہے تو قرضہ کے تمسکات جاری کرتی ہیں اور حاملین تمسکات کو سال بہ سال ایک مقررہ سود ادا کرتی ہیں۔ اسلامی مملکت بھی اگر پیدا آور اغراض کے لیے قرض لے تو بطور قراض یا مضاربت کے لے سکتی ہے، اس شراکتی کاروبار میں خالص منافع میں سے جو کچھ بھی طے پا جائے مثلاً آدھا، پاؤ، ثلث وغیرہ اسی حساب سے حکومت اپنی تنظیمی محنت کا معاوضہ لے گی اور اصلدار اپنے اصل کا منافع لے گا۔ رہی سود اور منافع کی بحث وہ اس سے قبل بیان ہو چکی ہے، اگر حکومت قرضہ عامہ پر سود دینے کے بجائے مضاربت یا شراکت کے اصول پر حسب حال لمبی بیشی کے ساتھ نفع و نقصان میں شرکت رہے تو عام لوگوں کو قرضہ دینے کے لیے مزید ترغیب ہوگی۔

---

[1] مبادلہ دولت باب ۶ میں بیت المال کے تحت تفصیل گذر چکی۔
[2] مبادلہ دولت کے باب ۶ میں بیت المال کے تحت تفصیل گذر چکی۔

ایک عملی مثال:۔ ایک مثال کے ذریعہ اس کی وضاحت کی جاتی ہے۔ فرض کیجئے کہ حکومت برقی قوت کی فراہمی کا ایک اسٹیشن قایم کرنا چاہتی ہے اور اس پیداآور مقصد کے لیے قرض لیتی ہے۔ برقی اسٹیشن کی تعمیر میں کچھ عرصہ لگے گا تعمیر کے بعد بھی ابتدائی سالوں میں منافع کم ہوگا جیسے جیسے برقی قوت کے استعمال کرنے والوں میں اضافہ ہوگا ویسے ویسے منافع میں بھی آنے والے برسوں میں زیادہ اضافہ ہوگا۔ موجودہ حکومتیں قرض لیتے وقت ہی شرح سود معین کر دیتی ہیں مثلاً یہ کہ ہر سال وہ اصلداروں کو ۳½ فیصدی سالانہ سود ادا کرے گی اب فرض کیجئے کہ ابتدائی برسوں میں حکومت کو برقی اسٹیشن سے صرف ۲½ فیصدی سالانہ منافع ہو لیکن حکومت پہلے ہی سے وعدہ کر چکی ہے کہ قرضہ کا تمسک رکھنے والوں کو ۳½ فیصدی ادا کرے گی اس طرح لامحالہ حکومت کو اپنی جیب یعنی حکومتی خزانہ سے مزید ایک فی صد ادا کرنا پڑتا ہے جیسا کہ شروع شروع میں ریل کی پٹریاں جب ہندوستان میں ڈالی گئیں تو حکومت نے سود اپنی جیب سے ادا کیا تھا لیکن یہ صورت حال بہت کم واقع ہوتی ہے۔ محنت اور تنظیم کے ساتھ جب اصل کام کرتا ہے تو ہمیشہ وہ بارآور ہی ہوتا ہے۔ اب یہ فرض کیجئے کہ اسی برقی قوت کے اسٹیشن سے بعد کے سالوں میں ۶½ فیصدی یا اس سے بھی زائد نفع ہوتا ہے اور عموماً ہوتا ہی رہتا ہے پھر بھی حکومت ۳½ فیصد سالانہ ہی ادا کرے گی اور اصلدار مزید منافع طلب ہی نہیں کر سکتے کیونکہ انہیں معاہدہ کا پابند ہونا پڑتا ہے۔ پہلی صورت میں حکومت کا نقصان تھا اور دوسری صورت میں اصلداروں کا نقصان ہے۔ ہونا تو یہی چاہیے کہ حسب حال کمی بیشی کے ساتھ نفع و نقصان میں شرکت رہے، نہ تو اصلدار کا نقصان ہو، نہ منتظم کاروبار کا، اگر ایک اپنے اصل کی وجہ سے نفع پائے تو دوسرا اپنی تنظیم کی وجہ سے نفع کا مستحق ہو۔ اس بارے میں اسلامی تعلیم کا ماحصل یہ ہے کہ لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ ۔ نہ تم کسی پر ظلم کرو اور نہ کوئی تم پر ظلم کرے۔

حسبِ حال کمی بیشی کے ساتھ نفع نقصان میں شریک ہونے کا ایک اہم فائدہ یہ ہے کہ شراکتی کاروبار پر حصہ داروں کی توجہ رہتی ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کاروبار نا اہل ہاتھوں میں پڑ کر خراب ہونے نہیں پاتا، برخلاف اس کے اگر اصلداروں کو صرف سود ہی ملتا رہے تو انھیں بس اپنے سود کی فکر رہتی ہے اور کاروبار سے دلچسپی ہی نہیں ہوتی، اطمینان ہوتا ہے کہ ہمارا سود تو گھر بیٹھے ہاتھ آہی جائے گا کیونکہ حکومت نے ادائی کی ذمہ داری قبول ہی کرلی ہے چاہے حکومت کو اپنے کاروبار میں نفع ہو، چاہے کارکنوں کی بدانتظامی سے حکومت کو نقصان اٹھانا پڑے۔

قرضہ غیر پیدآور اغراض کے لیے حکومت غیر پیدآور اغراض مثلاً جنگ، قحط، زلزلہ اور سیلاب وغیرہ کے ناگہانی حادثوں کے دفعیہ کے لیے بھی رقم قرض لیتی ہے۔ گذشتہ صدی میں انگلستان نے نپولین سے جنگ کرنے کے لیے روپیہ قرض لیا تھا نیز پہلی جنگ عظیم میں بھی ان گنت روپیہ قرض لیا۔ اکثر لوگوں نے حکومت کو مشورہ دیا کہ قرض اور اس کا سود دونوں ساقط کر دیے جائیں، ابھی پرانا قرضہ ادا بھی نہ ہوا تھا کہ دوسری جنگ نے آدبوچا" برطانیہ کو قومی قرضہ ساقط کر دینے کا جو مشورہ دیا جاتا تھا وہ کچھ نیا نہ تھا کیونکہ خود گذشتہ صدی میں بھی اس قسم کے قرض کو ساقط کر دینے کے واقعات پیش آچکے تھے۔ جنوبی امریکہ کی بہت سی ریاستوں نے سود اور قرض کی ادائی سے انکار کر دیا اور اسی طرح ممالک متحدہ امریکہ کی چند ایک ریاستوں نے بھی اپنے قرضوں کی ادائی سے انکار کر دیا۔[1]

قرض کو ساقط کر دینے کا مشورہ دینے والے اس حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ قرضہ دینے والوں میں دولتمند ہی نہیں بلکہ غریب طبقہ بھی ہوتا ہے قرضہ کی ادائی سے انکار کرنے کے معنے یہ ہوں گے کہ غریبوں نے خون پسینہ ایک کرکے جو آنہ آنہ، پائی پائی جمع کی تھی اس سے ان کو محروم کر دیا جائے۔

---

[1] تھامس: المنٹس آف اکنامکس ص ۶۳۵

نتیجہ یہ ہوگا کہ نادار قلاش بن کر حکومت ہی کے سامنے ہاتھ پھیلائے مدد کے طالب ہوں گے۔ حکومت اگر اپنے ہی ملک والوں سے لیے ہوئے قرض کی ادائی سے انکار کر دے تو ایک نتیجہ یہ بھی ممکن ہے کہ آگے چل کر لوگ قرض دینے سے ہی انکار کر دیں اور بیرون ملک کسی سود مند کاروبار میں رقم لگائیں۔

اسلامی تعلیم

اس بارے میں اس سے پہلے کئی مقامات پر اسلامی تعلیم کی وضاحت کر چکے ہیں اور بلحاظ موقع اور اہمیت یہاں پھر دہراتے ہیں کہ غیر پیداآور قرضوں کی ادائی میں "نہ تو مقروض کا نقصان ہو کہ خواہ مخواہ سود ادا کرے اور نہ قرضدار کو نقصان اٹھانا پڑے کہ اصلی رقم کا ساقط کر دی جائے"[1]

اگر مقروض میں قرض کی ادائی کی سکت نہ ہو تو مہلت دینے کا حکم ہے

وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ — اگر مقروض تنگ دست ہے تو فراخی تک مہلت دو۔

پ ۳ بقرہ ع ۳۸

غیر پیداآور اغراض کے لیے حکومت جو قرض لیتی ہے اس کے متعلق فقہاء کی یہ رائے ہے کہ اگر بیت المال میں رقم موجود نہ ہو تو "بیت المال میں روپیہ جمع ہونے پر قرض ادا کیا جائے۔ اگر روپیہ آئندہ حاکم کے عہد میں جمع ہو تو اس پر ادا کرنا واجب ہے"[2]

اگر کوئی سلطنت اپنے لیے ہوئے قرض کو ساقط کرنے کی فکر میں ہو تو اشخاص ہی کی طرح حکومت کی ساکھ کو بھی سخت نقصان پہنچتا ہے اور بغیر رہن رکھوائے بڑی سے بڑی طاقتور سلطنت کو بھی کوئی قرض نہیں دیتا۔ گذشتہ جنگ میں انگریزوں کو کئی ایک جزیرے امریکہ کے ہاں رہن رکھوانے پڑے۔

---

[1] امام رازی: تفسیر کبیر صفحہ ۶۷ آیت: فَلَكُمْ رُءُوسُ اَمْوَالِكُمْ۔

[2] الماوردی: الاحکام السلطانیہ باب ۱۵ صفحہ ۲۰۴ نیز ابویعلیٰ صفحہ ۲۲۴

ممکن ہے کہ یہاں یہ سوال پیدا ہو کہ غیر پیداآور اغراض خاص کر جنگ کے لیے حکومتیں جو کروڑوں اربوں پونڈ قرض لیتی ہیں اگر وہ اس کا سود ادا نہ کریں تو پھر اس طول طویل جنگ کے لیے کون قرض دے گا؟ اور سودی لالچ کے بغیر رقم کہاں سے آئے گی؟ ہم کہیں گے کہ سود کے لالچ ہی نے جنگ کو اس قدر مہلک، خوں خوار اور طولانی بنا دیا ہے اگر سودی قرضے نہ ہوتے تو کیا جانبین اتنی لمبی بھیانک مہلک اور خرچیلی جنگ جاری رکھ سکتے تھے! کیا انسانی خون کی ایسی ہولی کھیلی جا سکتی تھی۔

ابن آدم اپنے ہاتھوں مورد آلام ہے

سودی کاروبار جنگ کا پیش خیمہ ہوتا ہے اگر جنگ کی ہولناکی روکنی ہے تو سودی کاروبار کو پوری طرح دنیا سے مٹا دیا جائے۔ صدیوں پہلے امام رازی نے جس نظریہ کا اظہار فرمایا تھا وہ آج ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ سرمایہ دار ممالک سود لے کر ایک دوسرے کا گلا کاٹ رہے ہیں۔

اِنَّ الْمُشْرِكِيْنَ اِنَّمَا اَنْفَقُوْا عَلٰى تِلْكَ الْعَسَاكِرِ اَمْوَالًا جَمَعُوْهَا بِسَبَبِ الرِّبَا۔ فَلَعَلَّ ذَالِكَ يَصِيْرُ دَاعِيًا لِلْمُسْلِمِيْنَ اِلَى الْاِقْدَامِ عَلَى الرِّبَا حَتّٰى يَجْمَعُوا الْمَالَ وَيُنْفِقُوْهُ عَلَى الْعَسْكَرِ فَيَتَمَكَّنُوْنَ مِنَ الْاِنْتِقَامِ مِنْهُمْ فَنَهَاهُمُ اللّٰهُ عَنْ ذَالِكَ[1]

مشرکین سود سے جمع کیے ہوئے مال کو لشکروں پر خرچ کرتے تھے پس اسی طرح شاید مسلمان بھی سود کی طرف اقدام کر بیٹھیں اور مال جمع کریں تو اس کو لشکر پر خرچ کریں گے اور انتقام کے درپے ہو جائیں گے۔ اسی لیے اللہ نے سود کو ناجائز قرار دیا۔

سود کا لالچ دے کر ان گنت روپیہ قرض لینا اور بعد میں اصل اور سود کی ادائی کا انکار کر بیٹھنے سے تو یہ بہتر ہے کہ جو اصل لیا ہے صرف اسی کو واپس دے دیں۔

---

[1] ۔ تفسیر رازی ج ۲ صفحہ ۲۶۰

عصری جنگی قرضوں کا مسئلہ

جنگی قرضوں کا مسئلہ عصر جدید کا ایک اہم ترین مسئلہ ہے۔ دنیا کی اکثر سلطنتیں قرضوں کے بار سے دبی ہوئی ہیں چنانچہ "تخمینہ کیا گیا کہ ۱۹۱۴ء میں دنیا کے قومی قرضوں کی مقدار تقریباً اٹھتر ارب پونڈ تھی[1] اور" ۱۹۳۹ء میں صرف برطانیہ کا قومی قرضہ ۸۱ ارب ۶۳ کروڑ پونڈ تھا گویا ۱۹۱۴ء میں تمام دنیا کا جو مجموعہ قرضہ تھا اس سے زیادہ ہی تھا[2] یہ تو ۱۹۳۹ء کے قرضے کے اعداد ہیں۔ دوسری جنگ کے دوران میں برطانیہ اور اس کے حلیفوں نے لامتناہی قرضہ لیا صرف حکومت برطانیہ کی حد تک جنگ کا یومیہ صرفہ کئی کروڑ روپیہ تھا۔ ان اعداد سے اس بات کا سرسری سا اندازہ ہو سکتا ہے کہ آج کل قومی قرضوں کے مسئلہ کو اس قدر اہمیت کیوں دی جا رہی ہے۔ موجودہ نسل کے بہترین دماغوں کو ایسا مشکل مسئلہ اور پھر اس سے پیدا ہونے والے مسئلوں کی گتھیوں کو سلجھانا ہے۔

ڈاکٹر تھامس کی یہ رائے قابل توجہ ہے کہ "بجز استثنائی صورتوں کے قرض کے ایک بھاری بوجھ کی تخلیق کو حق بجانب نہیں قرار دیا جا سکتا۔ دوامی قرض کے فائدے چاہے کچھ بھی ہوں خود قرضہ کا وجود اور سالانہ سود یعنی ایک غیر معمولی رقم کی ادائی سے ـــــ جیسا کہ انگلستان میں ہو رہی ہے ـــــ تجارت، صنعت و حرفت ماند پڑ جاتی ہے، ترقی کے دیگر کار ہائے عظیم اور نیز مستقبل کی معاشی ترقی رک جاتی ہے"[3] امام رازی نے بھی یہی بیان کیا ہے کہ سودی کاروبار کی ترقی سے ملک کی صنعت و حرفت تجارت اور دوسرے پیداآور کاروبار کا بازار سرد پڑ جاتا ہے اور ملک کی معاشی ترقی رک جاتی ہے[4]۔

---

[1] تھامس: ایلیمنٹس آف اکنامکس ص ۴۲۱ [2] تھامس: ایلیمنٹس آف اکنامکس ص ۴۳۱

[3] تھامس: ایلیمنٹس آف اکنامکس ص ۴۲۳۔

[4] تقسیم دولت کے باب ربا یا سود کے تحت ج ۲ ص ۲۱۲ پر تفصیل گذر چکی۔

مقروض اگر یہ گراں بار سودی قرض ادا نہ کر پائیں تو پھر قرضدار اور مقروض ملکوں میں آج نہیں تو کل جنگ لازمی ہے، اس طرح ایک جنگ مزید جنگوں کے بیج بوتی چلی جائے گی اور نوع انسانی کو امن سکون اور آسودگی کا ملنا محال ہو جائے گا۔ اسلامی معاشیات کی غیر پیدا آور قرضوں کی ادائی سے متعلق رہنمائی اس قابل ہے کہ تمام اقوام عالم چاہے قرضخواہ ہوں یا مقروض اس پر ٹھنڈے دل سے غور کریں۔

(۱۶) اسلامی محاصل آدم اسمتھ کے قوانین کی روشنی میں

اسلامی مملکت کی سرکاری آمدنی کا بیان ختم کر کے اب آدم اسمتھ کے پیش کیے ہوئے چار قوانین کی روشنی میں اسلامی محاصل پر ہم نظر ڈالنا چاہتے ہیں۔

آدم اسمتھ نے اپنی کتاب "دولت اقوام" (ویلتھ آف نیشنز) میں محصول کے متعلق ذیل کے چار قوانین (کیانن) بیان کیے ہیں۔

(۱) قانون تیقن: - آدم اسمتھ کے چار قوانین میں سے ایک قانون تیقن ہے جس کا منشا یہ ہے کہ لوگوں پر جو محصول عائد کیا جائے وہ باقاعدہ ہو اور محصول کی مقدار یقینی ہو، ادائی کا وقت، ادائی کا طریقہ اور مقدار یہ باتیں ایسی صاف اور واضح ہوں کہ ادا کرنے والا اور دوسرے لوگوں کو پورا اطمینان حاصل ہو سکے۔

آدم اسمتھ کا قانون تیقن ہو یا دوسرے قوانین، ان کی روشنی میں جانچنے کے لیے گذشتہ صفحوں کا ایک سرسری سا مطالعہ کافی ہو سکتا لیکن یہاں تسلسل کے لیے اتنی بات کا دہرانا ضروری ہے کہ اسلام سے پہلے رعایا محصولوں کے بوجھ سے دبی ہوئی تھی اسلام ہی نے اس بوجھ کو ہلکا کیا۔ جو بھی محاصل لگائے گئے اس کی مقدار، ادائی کا وقت، اور ادائی کا طریقہ، ادا کرنے والے پر بھی واضح کر دیا گیا۔ خود رسول کریمؐ زکات کی مقدار کے متعلق روانگی کے وقت عاملوں کو فرامین اور ہدایتیں دیا کرتے تھے۔ یہی طریقہ حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ

حضرت عثمانؓ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے زمانہ میں بھی جاری رہا محصول زکات کے تذکرہ میں مختلف مویشیوں کی مختلف زکات اور مختلف تعداد کی مختلف زکات کی وضاحت بھی کر دی گئی، اسی طرح زر کی زکات اور اس کا نصاب بھی بتا دیا گیا۔ زراعت سے متعلق آنحضرتؐ نے بتا دیا کہ عشر کس صورت میں ہے اور نصف عشر کب ادا کرنا چاہیے، خراجی زمینوں پر خراج (لگان) عائد کیا گیا اس کا مختلف طریقوں سے جانچ پڑتال کی گئی، قدیم زمانہ کی عائد کی ہوئی مقداروں کو بھی سامنے رکھا گیا، حضرت عمرؓ باقاعدہ ہر ہر علاقہ سے نمائندے طلب کرکے ان سے بھی دریافت کرتے تھے اس کے سوا، مختلف زراعتی پیداوار میں مختلف محاصل لگائے گئے۔ گیہوں پر الگ، جو پر الگ، دھان پر الگ، اور نیشکر پر الگ، پھر محصول درآمد کے متعلق حضرت عمرؓ نے واضح احکام اور ہدایتیں جاری کیں۔ زیادہ سے زیادہ دس فیصد محصول مقرر کیا پھر اس میں لچک رکھی، جلد خراب ہونے والی اشیا کو محصول سے مستثنیٰ قرار دیا اور غیر ممالک سے آنے والے تاجروں کے لیے بین الاقوامی اصول کو بھی جاری کیا کہ وہ لوگ ہم سے جتنا محصول لیتے ہیں ہم بھی اتنا ہی لیا کریں گے۔

(۳) قانونِ سہولت:۔ قانونِ سہولت کا منشا یہ ہے کہ محصول ایسے وقت اور اس طریقہ پر عائد کیا جائے جو ادا کرنے والے کے حق میں زیادہ سے زیادہ سہولت کا باعث ہو چنانچہ اسلامی مملکت میں زراعت کا محصول ایسے وقت وصول کیا جاتا تھا جبکہ فصل کٹ جاتی تھی۔ اسی طرح کان سے معدنی دولت نکلتے وقت رائلٹی وصول کی جاتی تھی، زکات اور جزیہ ادا کرنے کی تاریخیں بھی مقرر تھیں جس طرح کاشتکار پیداوار یا اس کی قیمت ادا کرنے کا حق رکھتے تھے اسی طرح معدنوں کے مالک معدنی پیداوار یا زر کی شکل میں رائلٹی ادا کرنے کا اختیار رکھتے تھے۔ جن ممالک میں معیار طلاء رائج تھا وہاں کے ذمیوں سے محصول جزیہ بشکل طلاء یعنی دینار اور جن ممالک میں زر نقرہ کا چلن تھا وہاں زر نقرہ یعنی درہم کی شکل میں جزیہ لیا جاتا تھا۔ محصول جزیہ میں صناع، کاریگر بجائے زر کے اپنی مصنوعات بھی پیش کرنے کا حق رکھتے تھے،

رسول کریمؐ نجران والوں سے ان کی مصنوعات یعنی پارچہ کی شکل میں جزیہ کا محصول وصول کرتے تھے حتیٰ کہ حضرت علیؓ نے سوئیاں بنانے والوں سے سوئیوں کی ہی شکل میں ان کا جزیہ وصول کیا۔ مویشی پالنے والوں سے مویشی ہی زکات میں لیے جاتے تھے، صرف انہی مویشیوں کی بابت زکات وصول کی جاتی تھی جو سال تمام جنگلوں مرغزاروں میں چرتے تھے، ان کا بھی ایک نصاب مقرر تھا نصاب سے کم تعداد پر زکات نہیں لی جاتی تھی، جنگل میں چرنے والے گھوڑے، گھوڑیوں کی زکات ایک دینار مقرر تھی لیکن ہر گھوڑے کی قیمت کے تعین کے لحاظ سے بھی زکات ادا کی جا سکتی تھی۔ سونے چاندی کا بھی ایک نصاب مقرر تھا نصاب سے کم پر زکات نہ تھی غرض باشندوں کو محصول کی ادائی میں ہر قسم کی سہولتیں حاصل تھیں، پیداوار تباہ ہو جانے پر محصول معاف تھا، غنیم سے حفاظت نہ ہو سکنے پر جزیہ اور خراج بھی نہیں لیا جاتا تھا۔

(۳) **قانون کفایت:۔** قانون کفایت کا منشا یہ ہے کہ ہر ایک محصول اس طور پہ تجویز کیا جائے کہ اس کی بدولت جو بھی رقم سرکاری خزانہ میں داخل ہو اس کے علاوہ جہاں تک ہو سکے کم سے کم مزید رقم رعایا کی جیبوں سے نکلے، محصول کی وصولی اس قدر خرچ طلب نہ ہونی چاہیے کہ کل کی کل رقم وصول کرنے والوں ہی پر خرچ ہو جائے۔ سرکاری مصارف کے تذکرہ میں اس پر مزید روشنی ڈالی گئی ہے، یہاں صرف اتنا بتا دینا کافی ہے کہ محصول زکات کے وصول کرنے کے سلسلہ میں وصول کرنے والوں پر جتنا خرچ ہو اس کی مقدار خود قرآن مجید میں بتا دی گئی ہے۔ محصول زکات کے پانچ حصوں میں سے ایک حصہ یعنی زیادہ سے زیادہ بیس فیصد وصول کرنے والوں پر صرف ہو سکتا تھا۔

(۴) **قانون معدلت:۔** آدم اسمتھ کے قانون معدلت کا منشا یہ ہے کہ ہر مملکت کی رعایا جہاں تک ممکن ہو اپنی اپنی قابلیت کے تناسب یعنی اپنی اپنی آمدنی کے تناسب سے جو انھیں مملکت کے زیر حفاظت اپنے اپنے

طور پر حاصل ہوتی ہے حکومت کے اخراجات میں شریک ہوں، گوکہ آدم اسمتھ نے اپنی کتاب میں اس اصول کو سب سے پہلے بیان کیا ہے لیکن ہم نے اس کو سب سے آخر میں اس لیے جگہ دی کہ اس کے الفاظ کچھ مبہم سے ہیں "اپنی اپنی قابلیت کے تناسب سے" کیا معنے رکھتا ہے! خیر اس کے کچھ بھی معنے ہوں اسلامی مملکت میں جو بھی افراد رہتے سہتے تھے چاہے وہ مسلم ہوں یا ذمی ان پر محاصل عائد کیے گئے تھے، البتہ جو مفلس نادار تھے ان سے کسی قسم کا محصول نہیں لیا جاتا تھا بلکہ خود حکومت ان کی مدد کرتی تھی، زکات کا ایک نصاب مقرر تھا اس سے کم "دولت" رکھنے والوں سے زکات نہیں لی جاتی تھی۔ محصول جزیہ کے بیان میں یہ تفصیل کی جاچکی ہے کہ یہ ایک محصول متزاید تھا، دولت کے لحاظ سے ادا کرنے والوں کے تین گروہ قرار دیے گئے تھے اور اسی لحاظ سے محصول جزیہ لگایا جاتا تھا۔ نوائب (جدید محاصل) میں خاص توجہ برتی جاتی تھی، پھر آن واحد میں دو قسم کے محصول یعنے بالواسطہ اور بلاواسطہ لگائے گئے تاکہ ہر ایک کی خوبیاں ان سے پیدا ہونے والی خامیوں کو دور کردیں حضرت عمرؓ نے مرتے وقت اپنے بعد کے خلیفہ کو وصیت کردی کہ

..... وَأَنْ لَا يُؤْخَذَ مِنْهُمْ ان کی رضامندی سے ان سے اتنا ہی مال

إِلَّا فَضْلُهُمْ عَنْ رِضَاهُمْ[1] لیا جائے جو ان کی ضرورت سے زائد ہو۔

حضرت عمرؓ کی اس آخری وصیت کا کولبیر کے اس مقولہ سے تقابل کیا جاسکتا ہے "ورھنس کے پر اس طرح نوچو کہ وہ چیخنے چلانے نہ پائے"[2]

آخر میں یہی کہنا ہے کہ چاہے کسی قسم کے محاصل ہوں عام اصول یہ قرار دیا گیا تھا کہ

اَلْجِبَايَةُ بِالْحِمَايَةِ محصول حفاظت کرنے پر ہی ہے۔

آدم اسمتھ کے مختلف محصول اندازی کے قوانین کو سامنے رکھ کر اسلامی محاصل کو کسی زاویہ نگاہ سے بھی جانچا جاسکتا ہے۔

---

[1] بخاری ج۱ فضائل عثمانؓ۔ [2] حوالے اس سے پہلے اسی باب میں ص۳۵ پر گذر چکے۔

اس کے سواء اسلامی محاصل میں ایک اور خوبی بھی ہے جس کو خود آدم اسمتھ نے نظر انداز کر دیا لیکن بعد کے معاشیین مثلاً جرمن معاشیات دان واگنر نے اس کو مانا اور تسلیم کیا ہے۔ عصر جدید کے معاشیین اس کو سوشیل پرنسپل آف ٹیکسیشن (محصول کے معاشرتی اصول) کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اکثر لوگ سرمایہ دار ملکوں میں تقسیم دولت کے طریقوں سے غیر مطمئن بلکہ بیزار نظر آئیں گے ان کی رائے یہ ہے کہ محصول کو معاشرتی اور مالیاتی دونوں غرضوں کے لیے ایک کرشمہ دو کار کے طور پر استعمال کرنا چاہیے دوسرے لفظوں میں محاصل اس طور پر عائد کرنے چاہئیں کہ ایک طرف حکومت کو آمدنی حاصل ہو تو دوسری طرف چند معاشرتی مقصدوں کی بھی تکمیل ہو جائے، اور مالداروں اور ناداروں میں دولت کا یہ بڑا تفاوت جو نظر آتا ہے وہ بھی ساتھ ہی ساتھ دور ہو جائے، قرآن میں گردش دولت کا یہ اصول قرار دیا گیا ہے کہ

كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً بَيْنَ الْاَغْنِيَاءِ مِنْكُمْ۔ — تاکہ (دولت) تمھارے مالداروں ہی میں گردش کرتی نہ رہے۔

پ ۲۸ الحشر ۹ ع ۱

زکات کے تحصول کا مقصد خود حضور اکرمؐ نے یہ بیان فرمایا کہ

تُؤْخَذُ مِنْ اَغْنِيَائِهِمْ — (زکات) مالداروں سے لی جائے گی

فَتُرَدُّ عَلٰى فُقَرَائِهِمْ — اور ناداروں میں بانٹی جائے گی۔

غرض اسلامی معاشیات نے محصول کا ایک مقصد یہ بھی قرار دیا ہے کہ محصول سے چند معاشرتی فائدے بھی حاصل ہوں اور ملک کے ہر طبقہ میں دولت کی اس طرح تقسیم کی جائے کہ وہ ہمیشہ گردش کرتی رہے اور کبھی چند چوٹی کے سرمایہ داروں کے پاس اندوختہ بن کر نہ رہ جائے۔

اسلامی مالیات کی خوبیوں کو مزید سائنٹیفک طریقوں سے جانچنے کی ضرورت ہے تاکہ اس کی خوبیاں ہاتھوں کی لکیروں کی طرح واضح اور نمایاں ہو سکیں۔

دوسرا حصہ حکومت کے مصارف

(۱) اسلامی حکومت کے مصارف

یہاں تک مالیات عامہ کے ایک شعبہ یعنے سرکاری آمدنی کی وضاحت کی گئی۔ اب مالیات عامہ کے دوسرے شعبہ یعنے سرکاری مصارف کی صراحت کی جائے گی۔

حکومت کو رقم کی کیوں ضرورت پڑتی ہے؟ اور سرکاری مصارف کیا ہیں؟ اس کی تفصیل اس باب کی ابتدا میں کی جا چکی۔

جس طرح عام لوگوں کے لیے اپنی کمائی ہوئی دولت کو بڑی احتیاط سے صرف کرنا ضروری ہے اسی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ سرکاری مصارف میں احتیاط کی ضرورت ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ سرکاری مصارف سے تمام ملک وملت کا مفاد وابستہ ہوتا ہے اس کا مصرف جتنا بہتر ہوگا اتنا ہی ملک والوں کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچے گا۔ مصارف میں احتیاط کی یہ وجہ بھی ہے کہ عام طور پر چونکہ قوت بازو اور محنت سے خون جگر پی کر دولت کمائی جاتی ہے اس لیے دولت کے صرف میں بھی لازمی طور پر احتیاط کا لحاظ ہوتا ہی ہے لیکن مملکت کو رقم کما کر دینے والے تو ملک کے تمام باشندے ہوتے ہیں مگر سرکاری مصارف کا موازنہ اقتدار اعلیٰ اور اس کا وزیر مالیہ ترتیب دیتا ہے۔ اسی احتیاط کی بنا پر قرآن مجید کو حکومت کی مختلف آمدنیوں کے مصارف بھی بیان کر دینے پڑے۔

اسلامی مملکت کے بیت المال کی آمدنیاں ان کے مصارف کے لحاظ سے دو حصوں میں تقسیم کی جا سکتی ہیں۔

(۱) وہ آمدنیاں جن کے مصارف کی وضاحت قرآن مجید نے کر دی ہے مثلاً مال غنیمت کا مصرف، مال فئ کا مصرف اور محصول زکات کا مصرف وغیرہ۔ ان آمدنیوں کے صرف کرنے میں امام کی حیثیت محض ایک امین اور واسطہ کی ہے، اس کے اختیار تمیزی کو ان کے مصرف میں دخل نہیں اور اگر ہے بھی تو بہت ہی کم۔

(۲) وہ آمدنیاں جن کا مصرف صدر مملکت کے اختیار تمیزی ہی پر چھوڑ دیا گیا مثلاً محصول خراج، محصول جزیہ اور محصول درآمد کا تین چوتھائی حصہ اور بعض دیگر محاصل، ان محصولوں کے مصرف میں بھی مثل اور دوسرے ملکی امور کے وہ مشورہ کا پابند ہے۔

فقہاء اسلام نے بیت المال کی آمدنیوں کو مصارف کے لحاظ سے چار مختلف شعبوں میں تقسیم کیا ہے[1]

---

[1] ایک زندہ دل فقیہ محمد ابن شحنہ نے ان کو نظم کے سانچے میں ڈھال دیا ہے ؎

بُيُوتُ الْمَالِ أَرْبَعَةٌ — مَصَارِفُ بَيَّنَتْهَا الْعَالِمُوْنَ
بیت المال چار قسم کے ہیں — ان کے مصارف کو علماء نے بیان کیا ہے

فَأَوَّلُهَا الْغَنَائِمُ وَالْكُنُوزُ — رِكَازٌ بَعْدَهَا الْمُتَصَدِّقُوْنَ
ان میں سے پہلا غنائم اور کنوز ہے — اس کے بعد رکاز اور صدقہ کا بیت المال ہے

وَثَالِثُهَا خَرَاجٌ مَعْ عُشُوْرٍ — وَجَالِيَةٌ يَلِيْهَا الْعَامِلُوْنَ
اور تیسرا خراج اور عشور ہے — اور جزیہ ہے جس کے کارپرداز مستقل ہوتے ہیں

وَرَابِعُهَا الضَّوَائِعُ مِثْلُ مَالٍ — يَكُوْنُ لَهُ أُنَاسٌ وَارِثُوْنَ
اور چوتھا بیت المال ضوائع (یعنی لقطوں کا) — مانند ان اشیاء کے جن کا کوئی وارث نہ ہو

فَمَصْرِفُ الْأَوَّلَيْنِ أَتَى بِنَصٍّ — وَثَالِثُهَا حَوَاهُ مُقَاتِلُوْنَ
پہلے دونوں کا مصرف قرآنی نص ہے — اور تیسرے کا مقاتل (فوجی) لیتے ہیں

(۱) مال غنیمت، معدنی دولت کا حاصل، اور رکاز (دفینہ) کا خمس۔
(۲) محصول زکات، اراضی عشر اور مسلمان تاجروں سے حاصل شدہ عشور۔
(۳) محصول خراج، محصول جزیہ، ذمی اور مستامن تاجروں کا محصول درآمد نیز بنو تغلب وغیرہ کا دُگنا صدقہ۔
(۴) لاوارث مال۔

فقہاء نے صدر مملکت (امام) کے لیے یہ بھی ضروری قرار دیا ہے کہ وہ ہر نوع کی آمدنی کے لیے ایک الگ شعبہ قائم کرے، اگر کبھی ایک شعبہ کے مصارف بڑھ جائیں اور دوسرے شعبہ میں رقمی بچت ہو تو اس بچت کو وہ پہلے شعبے کی ضرورت کے لیے قرض لے سکتا ہے چنانچہ درمختار میں ہے کہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

وَرَابِعُهَا فَمَصْرَفُهُ جِهَاتٌ تُسَاوِي النَّفْعِ فِيهَا الْمُسْلِمُوْنَ

اور چوتھی قسم کا مصرف وہ صورتیں ہیں جن سے سب مسلمانوں کو برابر فائدہ پہنچتا ہے

ملک العلماء الکاسانی لکھتے ہیں کہ "بیت المال میں جو آمدنیاں رکھی جاتی ہیں ان کی چار قسمیں ہیں:

اُن میں سے ایک تو مویشیوں کی زکات ہے اور عشور (مسلم مالکان اراضی کا لگان ہے) اور جو کچھ عاشر (وصول کرنے والا) مسلمان تاجروں سے جبکہ وہ اس پر سے گزریں وصول کرے۔ دوسرے مال غنیمت، معدنوں اور رکاز کا خمس ہے۔

"تیسرے زمینوں کا خراج، فی کس جزیہ اور وہ جلے ہیں جن پر بنو نجران سے مصالحت کی گئی تھی نیز بنو تغلب کا دوچند صدقہ اور اسی طرح جو کچھ کہ وصول کرنے والے ذمی اور حربی مستامن تاجروں سے وصول کریں۔ اور چوتھے میت کے ترکے سے جو حاصل کیا گیا ہو یعنی ایسے متوفی کا ترکہ جس نے اپنا کوئی وارث ہی نہ چھوڑا ہو یا فقط بیوی یا شوہر کو وارث چھوڑا ہو۔[1]"

[1] بدائع الصنائع الکاسانی ج ۲ کتاب الزکوٰۃ صفحہ ۶۸ باب مَا یوضع فی بیت المال۔

وَعَلَى الْاِمَامِ اَنْ یَّجْعَلَ لِکُلِّ نَوْعٍ بَیْتًا یَخُصُّهٗ۔ وَلَهٗ اَنْ یَّسْتَقْرِضَ مِنْ اَحَدِهَا لِیَصْرِفَهٗ لِلْاٰخَرِ[1]

اور امام پر یہ لازم ہے کہ ہر نوع کے لیے خاص ایک شعبہ بنائے۔ اور اس کو ایک شعبہ سے قرض لے کر دوسرے شعبے کے مصارف پر صرف کرنے کا پورا اختیار ہے۔

قاضی ابو یوسفؒ نے بھی خلیفہ ہارون الرشید کو بار بار ہدایت کی تھی کہ "خراج کی آمدنی کو صدقات اور عشور کی آمدنی کے ساتھ ملایا نہ جائے کیونکہ خراج تو سب مسلمانوں کی مشترکہ آمدنی ہے اور صدقات صرف ان ہی کے لیے ہیں جن کا حق تعالیٰ نے اپنی کتاب میں تذکرہ فرمایا ہے"[2]

چوتھی صدی ہجری میں خراسان کے ایک محصول خانہ میں کھاتہ نویسی کا جو طریقہ تھا خوارزمی نے اسے یوں بیان کیا ہے کہ

"پورے محاصل (خانوں) کی مقدار، ہر ایک محصول ادا کرنے والے جس قدر محصول ادا کیا، روزانہ کا آمد و خرچ بھی کھاتہ میں جمع کیا جاتا تھا مہینے کے ختم پر کل مقدار کی میزان ہوتی تھی۔"

"سالانہ واری کھاتہ بھی ہوتا تھا۔ اس کتاب میں جو رقمیں جمع کی گئی ہیں باقاعدہ طریقے سے ان کا اندراج ہوتا تھا تاکہ تنقیح میں آسانی ہو۔ گوشوارہ (تختہ جمع و خرچ) کو تین خانوں میں واضح کیا جاتا تھا۔ پہلے خانہ میں عائد کیے ہوئے محصول کی مقدار، دوسرے خانہ میں وصول کی ہوئی حقیقی رقم کا اندراج اور تیسرے خانہ میں ان دونوں کے فرق کو واضح کر دیا جاتا تھا اکثر رقم کی جو مقدار وصول ہوتی تھی وہ عائد کی ہوئی رقم سے کم ہی ہوتی تھی۔ محصول کی رسید ادائی۔ آخری تصفیہ۔ رسید۔"

$\frac{۳۰۶}{۹۱۸۰}$ کا شاہی موازنہ اب بھی موجود ہے اور یہ $\frac{۳۰۲}{۹۱۵}$ کے حسابات پر مبنی ہے۔"[3]

---

[1] ۔ در مختار ج ۳ کتاب الجہاد۔

[2] ۔ ابو یوسف: کتاب الخراج صفحہ ۱۴۴۔

[3] ۔ مفاتیح العلوم صفحہ ۲۰ بحوالہ رسیفیا لنسی آف اسلام از آدم متز

(۲) قرآن مجید کے مقرر کیے ہوئے مصارف

ذیل میں ان سرکاری مصارف کا بیان کیا جائے گا جن کے مصارف کی قرآن مجید میں وضاحت کی گئی ہے۔

(۱) مال غنیمت کا مصرف

اس سے پہلے سرکاری آمدنی میں غنیمت کی وضاحت کی جا چکی یہاں صرف اس کے مصارف کی صراحت کی جائے گی۔

جاہلیت میں عربوں کو جنگ میں جو مال غنیمت ملتا تھا اس کا بہت بڑا حصہ قبیلے کا سردار لے لیتا اور باقی حصہ وہ جنگ کے شرکا پر تقسیم کر دیتا تھا۔ سردار بڑا حصہ تو اپنی کمان کرنے کے معاوضہ میں لے لیتا اور جنگ کے شرکا کو جنگ میں شریک ہو کر جو بڑی محنت کرنی پڑتی اس کا معمولی سا معاوضہ انھیں دے دیا جاتا تھا۔[۱]

اسلام آیا تو مسلمانوں کو سب سے پہلے جنگ بدر میں غنیمت ہاتھ آئی، اس مشترک مال غنیمت کی تقسیم کا طریقہ انھوں نے رسول کریمؐ سے دریافت کرنا چاہا جیسا کہ اس سے پہلے انھوں نے شخصی دولت کے صرف کرنے کے متعلق دریافت کیا تھا۔ رسول کریمؐ نے قرآن مجید کی زبانی یہ حکم سنایا کہ

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ ۔ — اے پیغمبر یہ لوگ غنیمتوں کے متعلق آپ سے پوچھتے ہیں۔

قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ ۔ — کہہ دیجیے کہ غنیمتیں اللہ اور رسول کے لیے ہیں۔

پ ۹ الانفال ع ۱

"رسول اللہ نے اسے تمام مسلمانوں میں مساوی طریقہ پر تقسیم کر دیا"[۲]

---

[۱] ۔ پہلے باب میں صفحہ پر تفصیل گذر چکی۔

[۲] ۔ تفسیر طبری ج ۹ صفحہ ۱۰۹ آیت: يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ نیز تاریخ طبری واقعات جنگ بدر نیز کتاب الاموال صفحہ تقسیم دولت کے باب میں ج ۲ صفحہ ۳۱ پر تفصیل گذر چکی ہے۔

بیت المال کی خاص اغراض کے لیے اس وقت تک مال غنیمت کا پانچواں حصہ (خمس) نہیں لیا جاتا تھا۔ رسول کریمؐ اپنے اختیار تمیزی سے تقسیم فرماتے تھے[۱]۔ بدر کے بعد اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان صادر ہوا کہ

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ

پ۱۰ الانفال ع ۵

اور جان لو کہ جو شے بھی مال غنیمت میں ملے اس کا پانچواں حصہ اللہ کے لیے اور رسول کے لیے ہے اور قرابت والوں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافر کے لیے ہے۔

اللہ نے صدقات ہی کی طرح ـــــ جس کا ذکر آگے آئے گا ـــــ مال غنیمت کی تقسیم بھی خود ہی تجویز فرما دی۔ اس لیے بدر کے بعد سب سے پہلی غنیمت جس کو رسول اللہؐ نے پانچ حصوں میں تقسیم فرمایا بنو قینقاع کی غنیمت تھی[۲] جو ۳ھ میں حاصل ہوئی۔

قرآنی احکام کے بموجب رسول کریمؐ نے مال غنیمت کا بڑا حصہ یعنی ۴/۵ حصہ جنگی شمرکا پر تقسیم کر دیا اور مال غنیمت کا پانچواں حصہ یعنے صرف ۱/۵ مذکورہ مصارف کے لیے بیت المال میں جمع کیا۔

اس نوبت پر معاشی نقطۂ نظر سے دو باتیں ذکر کے قابل ہیں۔

(۱) جب بیت المال قائم ہوا تو ابتدائی آمدنیوں کے وقت سے ہی ناداروں کو نظر انداز نہیں کیا گیا۔ انگلستان کا مالیہ ترقی کرتے کرتے آج اس ارتقائی درجے تک پہنچا ہے کہ اب وہاں موازنہ کی ترتیب کے وقت امدادِ غربا کی مختلف اسکیموں کو پیش نظر رکھا جاتا ہے۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد سے بے روزگاروں کو ڈول (Dole) کے نام سے امداد ملتی رہی اور دوسری جنگ کے بعد بیورج اسکیم پر ایک حد تک عمل ہو رہا ہے اور غریبوں کو فقر و فاقہ سے نجات دلانے کی کوشش جاری ہے۔ قرآن مجید نے شروع ہی سے ناداروں کی امداد اور سماجی تحفظ کے لیے بھی موازنہ میں گنجائش رکھنے کا حکم دیا اور

۱؎ کتاب الاموال صفحہ ۳۰۵ نمبر ۷۶۲ ۔ ۲؎ ماوردی: الاحکام السلطانیہ باب ۱۲ صفحہ ۱۳۳

غنیمت کا پانچواں حصہ جو بیت المال میں داخل ہوتا ہے اس کے مصارف ہیں ناداروں، یتیموں اور مسافروں کی دستگیری کے لیے بھی مدیں رکھی گئیں، لیکن مال غنیمت کی آمدنی تو ایک اتفاقی آمدنی ہوتی ہے، اس لیے مستقل آمدنی یعنی فئی اور صدقات کے مصارف میں بھی ناداروں، مزدوروں بے روزگاروں کی امداد کے لیے موازنہ میں گنجایش رکھی گئی۔ صدقات کے محاصل تو خاص کر ان ہی کے لیے ہیں اس کا تذکرہ آئندہ صدقات کے مصارف میں تفصیل سے کیا جائے گا۔

(۲) "عرب کے قدیم معاشی نظام" کے تحت جو بیان ہوا، اس کے برخلاف رسول کریمؐ نے زیادہ سے زیادہ یعنی ۴/۵ حصہ جنگ کے شرکاء پر تقسیم فرمادیا اور بیت المال کے دوسرے مصارف کے لیے صرف ۱/۵ حصہ رکھا اور پھر اس ۱/۵ حصے کے متعلق خود آپ ہی نے فرمایا کہ

لَیْسَ لِیْ مِنْ مَغْنَمِکُمْ اِلَّا الْخُمُسُ وَالْخُمُسُ مَرْدُوْدٌ عَلَیْکُمْ[۱]

تمھارے مال غنیمت میں سے میرے لیے صرف پانچواں حصہ ہے اور یہ حصہ بھی تمھیں لوگوں کو واپس دے دیا جاتا ہے۔

اس طرح بیت المال کے خمس کی آمدنی کا ایک بڑا حصہ ملت ہی کے مصالح عامہ ناداروں، یتیموں اور مسافروں کی امداد پر صرف ہوتا تھا اور کل مال غنیمت کے ۱/۵ کا ۱/۵ حصہ یعنی صرف پچیسواں حصہ رسول کریمؐ کے ذاتی صرف میں آتا تھا۔[۲]

"عبداللہ بن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہؐ کے عہد میں خمس کے پانچ حصے کیے جاتے تھے اللہ اور رسول کے نام کا ایک حصہ نکالا جاتا تھا، ذوی القربیٰ (رشتہ داروں) کا ایک حصہ اور یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لیے تین حصے نکالے جاتے تھے۔"

۱۔ بخاری پ کتاب الجہاد نیز مسلم وغیرہ

۲۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو کتاب الاموال صفحہ ۳۲۵ نمبر ۸۳۱ نیز ص ۱۴ نمبر ۳۴

"حضرت ابوبکرؓ، عمرؓ، اور عثمانؓ نے خمس کے تین حصے کیے رسول اللہؐ کا حصہ اور ذوی القربیٰ کا حصہ یہ دونوں حصے ساقط کر دیے"[1]

"پھر حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے بھی حضرت ابوبکرؓ، عمرؓ اور عثمانؓ ہی کی تقسیم کو برقرار رکھا۔"[2]

اور حسن بن محمد بن الحنفیہ کہتے ہیں کہ رسول کریمؐ کی وفات کے بعد آپ کے حصے اور ذوی القربیٰ کے حصوں کے بارے میں اختلاف ہوا۔ بعض لوگ یہ کہتے تھے رسول کریمؐ کا حصہ آپ کے بعد آپ کے خلیفہ کو ملنا چاہیے، دوسرے لوگ یہ کہتے کہ ذوی القربیٰ کا حصہ رسول علیہ السلام کے رشتہ داروں کو ملنا چاہیے اور کچھ لوگ یہ کہتے تھے کہ ذوی القربیٰ کا حصہ آپ کے بعد آپ کے خلیفہ کے رشتہ داروں کو ملنا چاہیے۔ پھر اس بات پر اتفاق ہوا کہ یہ دونوں حصے ہتھیاروں اور زرہوں (جنگی سامان) پر خرچ کیے جائیں[3] بعد کے زمانہ میں اسی پر عمل ہوتا رہا۔

(۳) مال فئی کا مصرف

ایک اور سرکاری آمدنی جس کا مصرف قرآن مجید میں بیان کر دیا گیا ہے وہ مال فئی ہے جو مال غیر مسلموں سے بغیر جنگ اور چڑھائی کے حاصل ہو اُسے فئی کہا جاتا ہے۔ مال غنیمت کے حصول میں جنگ کے شرکاء کی محنت مشقت کا عمل دخل ہوتا ہے لیکن مال فئی اس سے الگ ہے یہ بغیر جنگ اور محنت مشقت کے حاصل ہوتا ہے۔

رسول اللہؐ نے ۴ھ میں بنو نضیر کو جلاوطن کیا۔ اور ان لوگوں کے باغات اور کھیتیاں رسول کریمؐ کے قبضہ میں آگئیں، اسی طرح بعد میں بنو قریظہ کا علاقہ اور ان کا مال اسباب اور یونہی خیبر کے کئی علاقے بھی بغیر کسی جنگ کے رسول کریمؐ کے قبضہ میں آ گئے چونکہ یہ

---

[1] ۔ ابو یوسف: کتاب الخراج صفحہ ۱۱ نیز کتاب الاموال صفحہ ۳۲۵ نمبر ۸۳۴ ۔

[2] ۔ ابو یوسف: کتاب الخراج صفحہ ۱۲ نیز کتاب الاموال صفحہ ۳۲۶ نمبر ۸۳۶ ۔

[3] ۔ اسی باب میں ... پر پوری تفصیل گذر چکی ۔

مال فیٔ، مال غنیمت سے بالکل الگ نوعیت کا تھا اس لیے رسول کریمؐ نے قرآنی آیت کی روشنی میں اس کو سرکاری ملک قرار دیا

وَمَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ فَمَآ	اور جو مال (کہ) اللہ نے اپنے رسول پر فائز کیا ہے
اَوْجَفْتُمْ عَلَیْهِ مِنْ خَیْلٍ وَّلَا رِكَابٍ	اس کے لیے نہ تو تم نے (اپنے) گھوڑے دوڑائے اور نہ اونٹ
وَلٰكِنَّ اللّٰهَ یُسَلِّطُ رُسُلَهٗ	لیکن اللہ اپنے پیغمبروں کو جس پر چاہتا ہے
عَلٰى مَنْ یَّشَآءُ	غلبہ دلا دیتا ہے۔

پ۲۸۔ الحشر ۵۹ ع۱

رسول کریمؐ نے مال فیٔ کو سرکاری ملک قرار دے کر خاص اپنے انتظام میں رکھا اور بعد میں اپنے اختیار سے بنو نضیر کا کچھ علاقہ مہاجرین اور نادار انصار میں تقسیم کیا جائے۔[۱]

"مال فیٔ کے مصرف کے سلسلہ میں حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ بنو نضیر کے اموال اس قسم میں تھے جو اللہ نے اپنے رسول کو بغیر جنگ کے دلائے تھے مسلمانوں کو اس کے لیے گھوڑے اور سوار دوڑانا نہیں پڑے (یعنے لڑائی کی نوبت نہ آئی تھی) پس وہ مال نبی کریمؐ نے خود لے لیا اور آپ اس میں سے سال بھر کا خرچ نکال کے اپنے گھر والوں کو دے دیتے تھے اور جو کچھ بچتا تھا اس کو ہتھیاروں، گھوڑوں اور اللہ کی راہ میں جہاد کرنے کے لیے خرچ کرتے تھے"[۲]

مال غنیمت کا صرف ۱/۵ حصہ یعنے خمس حکومت کے بیت المال میں آتا تھا اور پھر اس کے واسطہ سے اس کا جو مصرف تھا ان پر صرف ہو جاتا تھا لیکن مال فیٔ کل کا کل بیت المال کی ملک قرار دیا گیا تھا۔ جائداد فیٔ کی آمدنی بھی بیت المال ہی میں آتی تھی۔

مال فیٔ کے خمس کے مصرف کی قرآن مجید میں صراحت کی گئی ہے اور باقی ۴/۵ کو صدر مملکت کے اختیار تمیزی پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ مال غنیمت اور

۱۔ تقسیم دولت باب ۴ صفحہ ۳۰ پر تفصیل گذر چکی۔

۲۔ بخاری پ۱۱ کتاب الجہاد بروایت زھریؒ۔

مال فئی میں" دونوں کے خمس کا ایک ہی مصرف ہے[۱] اور قرآن مجید میں بیان ہوا ہے۔ البتہ" مال فئی کے چار خمس ۴/۵ کا مصرف مال غنیمت کے چار خمس کے مصرف سے جدا ہے۔ ہم اس کو انشاءاللہ آگے بیان کریں گے"

"امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ فئی میں خمس نہیں ہے" مگر ان کا یہ قول قرآنی نص سے مختلف معلوم ہوتا ہے[۳]۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ

مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ	جو کچھ کہ اللہ نے بستیوں والوں (کے مال) سے اپنے
اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ۔	رسول پر فائز کیا وہ اللہ کے لیے ہے اور رسول کے لیے۔
وَلِذِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى	اور قرابت والوں کے لیے اور یتیموں کے لیے اور مسکینوں
وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ۔	کے لیے اور مسافروں کے لیے ہے۔
كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةًۢ بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ	تاکہ (دولت) تمہارے مالداروں ہی میں گردش
مِنْكُمْ۔ پ۲۸۔ الحشر ۵۹ ع ۱	کرتی نہ رہے۔

[۱] ماوردی الاحکام السلطانیہ باب ۱۲ صفحہ ۱۲۶ نیز ابویعلیٰ: الاحکام السلطانیہ صفحہ ۱۲۰

[۲] گو کہ مال فئی کے خمس کے مصرف کا قرآن مجید میں ذکر ہے مگر فقہائے اس بارے میں اختلاف رکھتے ہیں۔ جمہور فقہاء کی رائے یہ ہے کہ" مال فئی تمام مسلمانوں کے لیے ہے اس میں مالدار اور نادار دونوں برابر ہیں۔ امام کو چاہیے کہ اس میں سے مالدار اور نادار دونوں کو دے اور نیز امام کو چاہیے کہ اس میں سے فوجیوں حاکموں اور والیوں کو تنخواہیں دیا کرے، اور اسی سے مسلمانوں کو پیش آنے والی ضرورتوں پر صرف کرے مثلاً پلوں کی تعمیر، مسجدوں کی درستی وغیرہ اس میں جمہور کی رائے کے موافق خمس نہیں ہے اور حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے طرز عمل سے بھی یہی ثابت ہے لیکن امام شافعیؒ کے نزدیک خمس اس میں بھی ہے اور یہ خمس (مال) ان لوگوں پر تقسیم ہوگا جن کا (قرآن کی) غنیمت کی آیت (پ۲۸ الحشر ۵۹ ع ۱) میں ذکر کیا گیا ہے۔ اور یہ وہی لوگ ہیں جن کا خمس غنیمت کی تقسیم میں تذکرہ ہے۔ اور باقی کا مصرف امام کے اجتہاد پر ہے"

(بدایۃ المجتہد کتاب الجہاد صفحہ ۳۲۵ الفصل السادس قسمۃ الفئی)

"لہٰذا خمس ۱/۵ کے پانچ مساوی حصے کیے جائیں، ایک حصہ رسول اللہؐ کا آپ کی حیات میں تھا جس سے آپ خود اپنی ذات اور اپنی ازواج پر نیز اپنے اور مسلمانوں کے مصالح میں صرف فرماتے تھے آپ کی رحلت کے بعد علماء میں اختلاف ہے، جو لوگ انبیاء کی میراث کے قائل ہیں وہ کہتے ہیں کہ آپ کے وارثوں کو میراث دی جائے۔ ابو ثور کی رائے میں امام کو ملنا چاہیے کیونکہ رسول اللہؐ کے بعد وہی آپ کا قایم مقام ہے، امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک آپ کی وفات کے بعد ہی میراث ساقط ہوگئی، امام شافعیؒ کی رائے میں مسلمانوں کے مصالح میں صرف کی جائے جیسے فوج کی تنخواہیں، سواریوں اور ہتھیاروں کی خریداری، قلعوں اور پلوں کی تعمیر، قاضیوں اور اماموں کی تنخواہیں وغیرہ جن سے مسلمانوں کو آسائش اور آرام ہو۔"

"دوسرا حصہ ذوی القربیٰ کا ہے امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ اب ان کا حصہ بھی ساقط ہوگیا، امام شافعیؒ کے نزدیک باقی ہے۔ ذوی القربیٰ سے مراد صرف عبد مناف، بنو ہاشم اور بنو عبد المطلب کی اولاد مراد ہے اس میں اور دوسرے قریشی داخل نہیں۔ اس حصہ کی تقسیم میں چھوٹے اور بڑے مالدار اور نادار سب برابر ہیں کیونکہ قرابت کے نام سے دیا گیا ہے مگر مرد کا حصہ عورت سے دوچند ہے۔"[۱]

"تیسرا حصہ ضرورتمند یتیموں کا ہے، یتیم کے معنے ہیں باپ کا مرجانا۔ اس میں لڑکا اور لڑکی برابر ہیں۔ بالغ ہونے کے بعد یتیم نہیں کہلاتے رسول اللہؐ کا ارشاد ہے کہ لَا يُتْمَ بَعْدَ الْحُلُمِ (بلوغ کے بعد یتیم نہیں)"

"چوتھا حصہ مسکینوں کا ہے یہ وہ اہل فئی ہیں جن کو بقدر کفایت میسر نہ ہو، مساکین فئی، مساکین صدقات کے علاوہ ہیں کیونکہ دونوں کے مصرف میں اختلاف ہے۔"[۲] صدقات تو صرف نادار مسلمانوں کو دینے کے لیے مالدار مسلمانوں سے

۱۔ ماوردی: الاحکام السلطانیہ باب ۱۲ صفحہ ۱۲۲۔

۲۔ ماوردی: الاحکام السلطانیہ باب ۱۲ صفحہ ۱۲۲ نیز ابو یعلی: الاحکام السلطانیہ صفحہ ۱۲۲۔

لیے جاتے تھے لیکن مال فیٔ میں سے ـــــ جیسا کہ ہم آئندہ بیان کریں گے ـــــ مسلم مساکین کے علاوہ غیر مسلم مساکین کی بھی امداد کی جاتی تھی۔

"پانچواں حصہ ابن السبیل کا ہے یہ وہ اہل فیٔ مسافرین ہیں جن کے پاس زاد راہ نہ ہو۔ سفر کا آغاز کرنے والے اور دوران سفر والے برابر ہیں، خمس $\frac{1}{5}$ کی تقسیم کا حکم ختم ہوا۔"

"باقی چار خمس مال کی تقسیم میں دو قول ہیں (۱) ایک یہ کہ وہ صرف لشکر کے لیے ہے۔ اس مال سے فوج کی تنخواہیں دی جائیں، کوئی دوسرا ان کا شریک نہیں۔"

(۲) "دوسرا یہ کہ مسلمانوں کے مصالح عامہ، فوج کی تنخواہیں اور جو کام مسلمانوں کے لیے ضروری ہوں ان میں صرف کیا جائے۔ مال فیٔ کو اہل صدقات میں اور صدقات کو ـــــ جس کا بیان آگے آئے گا ـــــ اہل فیٔ میں خرچ کرنا جائز نہیں، ہر ایک کو اسی کے مستحقوں میں صرف کیا جائے۔"[1]

امام ماوردیؒ کا خیال ہے کہ "غالباً حضرت عثمانؓ سے لوگوں کے بھڑکنے کی وجہ یہ بھی تھی کہ انھوں نے ہر قسم کے عطیے مال فیٔ میں سے دیے اور دونوں میں کوئی امتیاز نہ رکھا۔"[2]

"اگر امام کے نزدیک مسلمانوں کی مصلحت مد نظر رکھ کر کسی قوم کی ہمدردی حاصل کرنے کی ضرورت ہو (جیسے سفیر، قاصد اور مولفۃ القلوب) تو ان کو مال فیٔ میں سے کچھ دیا جا سکتا ہے۔ رسول کریمؐ نے حنین کے دن بعض مولفۃ القلوب کو عطیے عنایت کیے چنانچہ عینہ بن حصن کو سو اونٹ اور اقرع بن حابس کو بھی سو اونٹ عطا فرمائے۔"[3]

قرآن مجید میں مال فیٔ کے خمس حصہ کے مصارف بتا دیے گئے ہیں

---

[1] ماوردی: الاحکام السلطانیہ باب ۱۲ صفحہ ۱۲۲ نیز ابو یعلی صفحہ ۱۲۲ ۔
[2] ماوردی: الاحکام السلطانیہ باب ۱۲ صفحہ ۱۲۴ نیز ابو یعلی صفحہ ۱۲۲ ۔
[3] ماوردی: الاحکام السلطانیہ باب ۱۲ صفحہ ۱۲۳ نیز ابو یعلی صفحہ ۱۲۲ ۔

بقیہ بڑے حصے یعنے ۴/۵ حصہ کے مصارف صدر مملکت (امام) کے اجتہاد اور اختیار تمیزی پر موقوف ہیں، نیز مال غنیمت کے خمس اور مال فیئ کے خمس کے مصارف ہیں جب کبھی فقہا کی رایوں میں اختلاف ہو تو اس کا تصفیہ بھی صدر مملکت کی رائے پر موقوف ہوتا ہے۔

مال فیئ میں محصول خراج، محصول جزیہ اور محصول درآمد یہ سب شامل ہیں اور اسلامی مملکت کی آمدنی کا بڑا ذریعہ یہی تھا اس لیے ان کے مصارف کی کچھ اور تفصیل آئندہ کی جائے گی۔

(۳) محصول زکات کا مصرف

قرآن مجید نے فیئ اور مال غنیمت کے خمس کے مصرف کی طرح محصول زکات کے مصارف بھی بتا دیے ہیں۔

صدقات دو امر پر مشتمل ہیں وصول اور تقسیم، دونوں کے احکام مختلف ہیں[1] حق تعالیٰ نے زکات کے مستحقوں کا اس آیت میں تذکرہ فرمایا ہے۔

إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِينِ وَالْعَامِلِينَ عَلَيْهَا۔	صدقات تو صرف فقیروں اور مسکینوں کے لیے ہے۔
وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَارِمِينَ۔	اور نیز ان لوگوں کے لیے جو وصول کرنے کا کام کرتے ہوں۔ اور ان لوگوں کے لیے جنکی تالیف قلب کی جائے اور غلاموں (کو آزاد کرانے) اور قرضداروں (کو سبکدوش کرنے کے لیے)
وَفِي سَبِيلِ اللَّهِ وَابْنِ السَّبِيلِ، فَرِيضَةً مِنَ اللَّهِ۔ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ۔	اور اللہ کی راہ میں اور مسافروں (کی کفالت) میں صرف کرنے کے لیے ہیں، (یہ) اللہ کا حکم ہے اور اللہ جاننے والا اور حکمت والا ہے۔

پ۱۰ التوبۃ ۹ ع۸

"اس سے پہلے رسول کریمؐ اپنی رائے سے خود تقسیم فرماتے تھے (جیسا کہ آپ نے

---

[1] ماوردی: الاحکام السلطانیہ باب ۱۱ ص ۱۰۹

پہلے پہل مال غنیمت کو اپنی رائے سے تقسیم فرمایا تھا)۔ ایک منافق نے گستاخانہ جسارت کی اور یہ کہا "محمد عدل کرو" آپ نے فرمایا تیری ماں تجھے روئے، میں عدل نہیں کروں گا تو پھر اور کون عدل کرے گا! اس کے بعد مذکورہ آیت نازل ہوئی ہے[1]

آیت بالا میں محصول زکات کے جو مستحقین بتائے گئے ہیں ان کی کچھ تشریح ذیل میں کی جاتی ہے۔

بے روزگار مزدوروں اور معذوروں کا سماجی تحفظ

فقہاء اور مفسرین نے "فقراء" اور "مساکین" کے الفاظ پر بحث کی ہے اور مختلف طریقوں مثلاً صحابہ کے اقوال، احادیث اور عرب کے قدیم کلام سے ثابت کیا ہے کہ ان الفاظ کا اطلاق کن کن لوگوں پر ہوسکتا ہے ان مباحث کی نہ یہاں گنجائش ہے اور نہ ضرورت، آئندہ جب کبھی "اسلامی مالیات" پر کوئی خاص کتاب لکھی جائے تو ان باتوں کی تفصیل کی جاسکتی ہے۔

سب سے بہتر طریقہ یہ ہوسکتا ہے کہ ان الفاظ کے معنے قرآن مجید ہی میں تلاش کیے جائیں تاکہ معلوم ہو جائے کہ ان الفاظ سے کہنے والے کی کیا مراد ہے۔

لفظ "فقراء" کا واحد "فقیر" ہے چنانچہ قرآن مجید میں ایک مقام پر لفظ "فقیر" ایسے مزدور کے لیے استعمال ہوا ہے جو جسمانی حیثیت سے تو تندرست و توانا ہے اور امانت دار بھی ہے لیکن زمانہ نے اسے بے روزگار بنا رکھا ہے، چنانچہ حضرت موسیٰ کے قصہ میں ہے کہ

فَسَقٰى لَهُمَا ثُمَّ تَوَلّٰٓى اِلَى الظِّلِّ۔	پس (موسیٰ نے) ان دونوں کی بکریوں کو پانی پلایا اور پھر چھاؤں کی طرف لوٹ آئے۔

---

[1] ماوردی: الاحکام السلطانیہ باب ۱۱ ص ۱۱۷ نیز تفصیل کے لیے تفسیر طبری ج ۱۰ صفحہ ۹۲ تا ۹۵ آیت منهم من یلمزک فی الصدقات کی تشریح ملاحظہ ہو۔

فَقَالَ: رَبِّ إِنِّي لِمَا أَنْزَلْتَ إِلَيَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيرٌ۔

اور کہا کہ اے میرے پروردگار! بے شک میں اس نعمت کا جو تو میری طرف نازل کرے محتاج ہوں۔

فَجَاءَتْهُ إِحْدَاهُمَا تَمْشِي عَلَى اسْتِحْيَاءٍ۔

پس ان دونوں لڑکیوں میں سے ایک ان کے پاس شرماتی ہوئی آئی۔

قَالَتْ: إِنَّ أَبِي يَدْعُوكَ لِيَجْزِيَكَ أَجْرَ مَا سَقَيْتَ لَنَا۔

کہنے لگی کہ میرے ابا نے تمھیں بلایا ہے تاکہ تمھیں اس کی اجرت دے جو تم نے پانی پلایا۔

فَلَمَّا جَاءَهُ وَقَصَّ عَلَيْهِ الْقَصَصَ۔

پس جب وہ (موسیٰ) ان کے باپ کے پاس (آئے) اور ان سے سارے واقعات بیان کئے۔

قَالَ: لَا تَخَفْ نَجَوْتَ مِنَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ۔

تو انھوں نے کہا کہ (اب) نہ ڈرو تم ظالموں کی قوم سے نجات پا گئے۔

قَالَتْ إِحْدَاهُمَا: يَا أَبَتِ اسْتَأْجِرْهُ إِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَأْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْأَمِينُ۔

ان دونوں لڑکیوں میں سے ایک نے کہا کہ اباجان! تم اسے اجرت پر رکھ لو جنھیں تم مزدور بناؤ بے شک ان میں وہی بہتر ہے جو طاقتور اور امانت دار ہے۔

پ ۲۰ القصص ۲۸ ع ۳

اس آیت میں "فقیر" کا لفظ نہ صرف ایسے مزدور کے لیے استعمال ہوا ہے جو تنومند اور امانت دار ہونے کے باوجود بے روزگار ہے بلکہ "فقیر" کا لفظ ایسے بے روزگار مزدور طبقہ کے لیے بھی استعمال کیا گیا ہے جو ظلم سے بچنے کے لیے وطن سے بے وطن ہوا ہے۔ "فقراء" کا لفظ ایسے مزدوروں پر بھی صادق آئے گا جو جنگ کی وجہ سے مارے مارے پھرتے ہوں چنانچہ برما سے جو سینکڑوں ہزاروں مزدور ہندوستان چلے آرہے تھے یا مفتوحہ یورپ سے جو بے روزگار فاقوں کے مارے پناہ گزیں انگلستان چلے آئے یا جو انڈیا یونین سے پاکستان آرہے ہیں ان پر بھی "فقراء" کے لفظ کا اطلاق ہوگا، خود قرآن ہی میں ایک اور جگہ "فقراء" کا لفظ ان مہاجرین کے لیے بھی استعمال ہوا ہے جنھوں نے قریش کے ظلم و ستم سے بچنے کے لیے مدینہ میں پناہ لی تھی اور روزگار کے متلاشی تھے۔

لِلْفُقَرَاۤءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ۔

(وہ مال) ان مہاجر فقیروں کے لیے ہے جو اپنے مال اور اپنے گھروں سے نکال دیے گئے ہیں اور اللہ کے فضل اور اس کی رضامندی کی تلاش میں ہیں ۔

پ ۲۸ الحشر ۵۹ ع ۱

الف ۔ مزدوروں کا سماجی تحفظ

جیسا کہ اوپر بیان ہوا قرآن مجید نے بے روزگار محنت کرنیوالے مزدور طبقہ کے سماجی تحفظ کے لیے محصول زکات میں ایک مد رکھی ہے ۔ غریبوں کی نجات اور امداد اس ادارہ کا اصلی مقصد ہے تاکہ مدافعت اور مسابقت کی قوت بخش کر ان کی خوشحالی بڑھائی جائے۔ مزدور طبقہ کی خوشحالی سارے ملک و ملت کی خوشحالی کا باعث بنے گی۔ مزدور طبقہ کے لیے یہ ایک قسم کی حفاظت ہے اور زکات کے ادارہ کی وجہ سے آجر، مزدور کا استحصال نہیں کر سکتے ۔ اگر وہ کارخانے بند کر دیں تو آخر آجروں کو ہار ماننی پڑے گی کیونکہ حکومت نے تو بے روزگار مزدور کی امداد کی ذمہ داری قبول کر لی ہے اور بجائے کسی ٹریڈ یونین کی امداد کے خود حکومت ان کی امداد پر آمادہ ہوگی ۔ اس طرح محصول زکات سرمایہ داروں کی قوت مقابلہ ختم کر دے گا ۔ اگر سرمایہ دار اپنے سرمایہ کو کاروبار میں نہ لگائیں تب بھی ان کے سرمایہ پر زکات عائد ہوگی اس طرح وہ عملاً مزدوروں کو اتنی اجرت دیں گے جتنی کہ انھوں نے پیدائش دولت میں مدد دی ہے ۔ آج بیورج اسکیم کا یہی مقصد بتایا جا رہا ہے کہ جنگ کے بعد جو مزدور بے روزگار ہو جائیں تو حکومت ان کی امداد کرے ۔

ب ۔ معذوروں کا سماجی تحفظ

"فقراء" کی طرح "مساکین" کو بھی زکات کا مستحق قرار دیا گیا ہے ۔ "مساکین" کا واحد "مسکین" ہے جو سکون سے ماخوذ ہے اور مسکین مبالغہ کا صیغہ ہے یعنی جو انتہائی سکون کی حالت میں ہو ۔ امام بیضاوی ؒ لکھتے ہیں کہ مسکین کا لفظ "سکون" سے ماخوذ ہے جس کو کہ عجز نے ساکن کر دیا ہو[1]

[1] ۔ تفسیر بیضاوی ج ۱ ص ۳۸۳ مطبوعہ نولکشور پریس آیت: اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَاۤءِ

اس طرح مسکین کے لفظ کا اطلاق ایسے لوگوں پر ہوگا جو انتہائی سکون کی حالت میں ہوں جنھیں بڑھاپے یا بیماری نے ایسا ناکارہ اور نکما کر دیا ہو کہ کوئی کام دھندا نہ کر سکتے ہوں یا کر سکیں بھی تو اپنی گذر بسر کے لیے پورا نہ کما سکیں جنگ میں اندھے، لولے، لنگڑے، اپاہج ہو جانے والے لوگوں پر بھی "مسکین" کے لفظ کا اطلاق ہو سکتا ہے۔" امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ مسکین کی حالت فقیر سے بدتر ہوتی ہے کیونکہ مسکین وہ ہے جس کو عدم زر نے ساکن کر دیا ہو" بہر حال دونوں (یعنی فقراء اور مساکین) کو اتنی مقدار دینی چاہیے جس سے فقر و مسکنت کی پستی سے نکل کر تونگری کے ابتدائی درجے پر پہنچ جائیں۔[1]

اسلام نے اگر ایک طرف لوگوں کو گداگری اور سوال کرنے سے روک دیا ہے تو دوسری طرف ساتھ ہی موازنہ میں بے روزگاروں، اپاہج، اور معذوروں کی امداد کے لیے گنجائش رکھی ہے۔[2]

---

[1] ماوردی: الاحکام السلطانیہ باب ۱۱ ص ۱۲۱ نیز ابو یعلیٰ صفحہ ۱۱۶ قسمۃ الصدقات

[2] "انگلستان میں کلیسائی نظام کے زوال کے بعد سے یہ بات مان لی گئی کہ مفلسوں کی امداد بھی حکومت کا ایک فرض ہے اور محتاجوں کی اس وقت تک خاطر خواہ مدد نہیں کی جا سکتی جب تک کہ حکومت کی نگرانی میں اس کا باقاعدہ انتظام نہ ہو۔ اسی بنا پر ۱۶۰۱ء میں قانون محتاجان منظور کیا گیا جس کی رو سے مفلس طبقوں کی امداد کو قانونی حیثیت دی گئی گو اصولاً یہ بات طے کر لی گئی کہ کوئی حکومت ملک کے مفلسوں، یتیموں، مجنونوں اور بے یار و مددگار لوگوں کو بھوکا مرنے نہ دے تاہم تجربہ سے یہ ثابت ہوا کہ امداد کے بعض طریقوں سے افلاس میں بجائے کمی کے اور اضافہ ہو جاتا ہے۔ علاوہ اس کے اگر حکومت اس فرض سے غافل رہے تو اس میں نہ صرف اس کی بدنامی ہے بلکہ اندیشہ ہے کہ یہ طرز عمل تمام قوم کے لیے خطرناک ثابت ہو لہٰذا امداد محتاجان ایک ایسا مسئلہ ہے جو صرف سرکاری انتظام اور حکومت کی کوششوں سے حل ہو سکتا ہے، حکومت کا فرض ہے کہ مفلسوں کی مدد کے لیے ایسے طریقے اور تجویزیں اختیار کرے جن میں عمومیت پائی جاتی ہو، لیکن حکومت کی مداخلت کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ خانگی خیرات کا سلسلہ

(ج) "تیسرا حصہ صدقات کے عمال کا ہے ان کی دو قسمیں ہیں (۱) ایک وصول کرنے والے عمال تحصیل (۲) دوسرے تقسیم کرنے والے عمال، ان میں امین، کارکن اور چھوٹے بڑے اہلکار سب داخل ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی تنخواہوں کی کفالت بھی زکات کے مال سے تجویز فرمائی ہیں تاکہ یہ لوگ اپنے معاوضۂ خدمت کے لیے مطمئن اور ارباب اموال سے زیادہ وصول نہ کریں اس مد سے ہر ایک کی تنخواہ کارکردگی کی حیثیت سے دی جائے گی۔ تنخواہیں دے کر جو بچ رہے اس کو دوسرے حصہ داروں پر تقسیم کر دیا جائے گا اور کمی ہو تو ایک رائے یہ ہے کہ زکات کے مال سے پوری کی جائے اور دوسری رائے یہ ہے کہ مصالحت کے مال سے کمی پوری کی جائے"[1]

(د) چوتھا حصہ تالیف قلوب کا ہے "تالیف قلوب کے مد کو مختلف فقیہوں اور مورخوں نے کافی تفصیل سے لکھا ہے جس کی یہاں گنجایش نہیں۔ اس کا منشا یہ تھا کہ تبلیغ اسلام میں جو رکاوٹیں ہوں یا مسلمانوں پر جہاں ظلم ہوں اگر رقم کے ذریعہ وہ رکاوٹیں اور وہ مظالم دور ہوسکیں تو ان کو دور کیا جائے تاکہ فتنہ و فساد کی نوبت نہ آئے چنانچہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) بالکل منقطع ہو جائے۔ برخلاف اس کے امداد کے دونوں طریقوں کو اس طور پر ترتیب دیا جائے کہ وہ ایک دوسرے کے مخالف نہ ہو بلکہ دونوں سے ساتھ ساتھ استفادہ کیا جاسکے تاکہ قوم کو بہ حیثیت مجموعی بڑے سے بڑا فائدہ حاصل ہو، محتاجوں کی اس طور پر امداد کرنی چاہیے کہ اس سے نہ تو کاہلوں کی ہمت افزائی ہو اور نہ محنت و جانفشانی سے روٹی کمانے والوں پر بیجا بار پڑے۔ یہ ایک ایسا مقصد ہے جس کو اب تک کوئی حکومت بہ تمام و کمال پورا نہیں کر سکی۔ بہر حال سرکاری خرچ کے اس مسلمہ جز کی خاطر بھاری بھاری ٹیکس لگانے پڑتے ہیں اور مرکزی اور مقامی حکومتوں کے متفقہ عمل سے اس کا انتظام کیا جاسکتا ہے" آرمٹیج اسمتھ اصول طریق محصول صفحہ ۱۵۔

[1] ۔ ماوردی: الاحکام السلطانیہ باب ۱۱ صفحہ ۱۱۸

بعض وقت ظالم کافی رقم پاکر شرارت سے باز آجاتے ہیں اور کبھی کبھی اس حسن سلوک سے متاثر ہو کر اسلام کی طرف بھی مائل ہو جاتے تھے اس طرح جو لوگ اسلام قبول کر کے اپنے آپ کو نادار و محتاج پاتے ان کی بھی مالی امداد کی جاتی تھی کہ یہ لوگ کسب معاش کے قابل ہو جائیں لیکن جب اسلام کو غلبہ حاصل ہو کر افلاس دور ہوا تو پھر ایسی مالی امداد کی ضرورت ہی نہ رہی رسول کریمؐ کے عہد میں زیادہ رقم تالیف قلوب کی مد میں صرف ہوتی تھی حضرت صدیق اکبرؓ کے زمانے میں یہ رقم کم ہو گئی اور حضرت عمر فاروقؓ کے زمانے میں جب کہ اسلامی فتوحات روز افزوں تھے اس کی ضرورت بالکل باقی نہ رہی بہر حال اس کا مقصد و منشا یہی تھا کہ مالی امداد کی شکل میں مخالفت کا منہ بند کیا جائے اور نادار مسلمانوں کی امداد کی جائے کہ اشاعت اسلام میں وسعت ہو[1]

(ط) "پانچواں حصہ" گردن چھڑانے کا ہے، امام ابو حنیفہؒ اور امام شافعیؒ کے نزدیک مکاتب غلاموں کو اتنی رقم دی جائے جس سے وہ خود کو آزاد کرالیں، امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ غلام خرید کر آزاد کیے جائیں[2]

طلوع اسلام کے وقت سارے عرب میں غلامی کا رواج تھا اسلامی حکومت نے غلامی کے انسداد کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور سرکاری خزانہ کی مدد سے پُر امن طور پر غلامی کے انسداد کا سامان کر دیا۔ امریکہ میں غلامی کے انسداد کے لیے ——— جیسا کہ سب جانتے ہیں ——— ایک عرصہ تک خانہ جنگی ہوتی رہی۔ مزید برآں مسلمان قیدیوں کو دشمن کے ہاتھوں سے چھڑانے کے لیے بطور فدیہ یہ رقم استعمال ہوتی تھی۔

(ی) "چھٹا حصہ" قرض داروں (غارمین) کا ہے۔ ان کی دو قسمیں ہیں

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ماوردی: الاحکام السلطانیہ باب ۱۱ صفحہ ۱۱۸ نیز ابو یعلیٰ ص ۱۱۶ نیز ہدایہ ج ۱ کتاب الزکوٰۃ

[2] ماوردی: الاحکام السلطانیہ باب ۱۱ ص ۱۱۸ نیز ابو یعلیٰ ص ۱۱۷ قسمۃ الصدقات

(۱) "ایک وہ جنھوں نے اپنی ضرورتوں کے لیے قرض لیا ہو، ان کو اگر مالدار نہ ہوں تو اس میں سے دیا جائے[1]"

(۲) "دوسرے وہ جنھوں نے مسلمانوں کے مصالح کے لیے قرض لیا ہو خواہ نادار ہوں یا مالدار انھیں اتنا ہی دیا جائے کہ ان کا قرض ادا ہو جائے اس سے زیادہ دینے کی ضرورت نہیں[1]"

معاشی نقطہ نظر سے مذکورۂ بالا مسئلہ کی آج کل خاص اہمیت ہے امام ابو یوسف رح نے "غارمین" کی تعریف کرتے ہوئے بتایا ہے کہ "غارمین وہ لوگ ہیں جو اپنے قرضوں کو ادا نہیں کر سکتے[2]" صاحب ہدایہ کے الفاظ میں "غارم وہ ہے جس پر قرض ہو اور اپنے قرضے سے فاضل کسی نصاب کا مالک نہ ہو[3]" شمس الائمہ سرخسی اور دیگر فقہاء نے غارم کی جو تعریفیں کی ہیں وہ اسی تعریف سے ملتی جلتی سی ہے۔

بے محل نہ ہو گا اگر مورخ طبری کی تفسیر سے "غارم" کی دو ایک تعریفیں بھی بیان کر دی جائیں۔ طبری اور دوسرے قدیم مفسروں کا یہ طریقہ ہے کہ وہ اپنے سے قدیم تر مفسرین جو صحابہ یا تابعین میں گزرے ہیں ان کے حوالے بیان کرتے ہیں، مثلاً طبری نے قتادہ کی یہ روایت نقل کی ہے "غارم" وہ لوگ ہیں جو قرضوں کے جنجال میں پھنسے ہوئے ہوں اور جن پر نہ کسی فضول خرچی نہ کسی فساد اور نہ مفلسی کی وجہ سے قرض کا بار پڑا ہو[4]" اور پھر طبری نے مجاہد کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "غارم" وہ ہے جس کا مکان جل گیا ہو اور سیلاب اس کا مال و اسباب بہا لے گیا ہو اور وہ اپنے اہل و عیال کی پرورش نہ کر سکتا ہو[5]" تو ان تمام صورتوں میں

---

[1] ماوردی: الاحکام السلطانیہ باب ۱۱ ص ۱۱۸ نیز ابو یعلی صفحہ ۱۱۷ قسمۃ الصدقات

[2] ابو یوسف: کتاب الخراج ص ۴۶ [3] ہدایہ ج ا کتاب الزکوٰۃ۔

[4] تفسیر طبری ج ۱۰ ص ۱۱۱ آیت: انما الصدقات للفقراء الخ

[5] تفسیر طبری ج ۱۰ ص ۱۱۱ آیت: انما الصدقات للفقراء الخ

يَنۡبَغِي الۡاِمَامِ اَنۡ يَقۡضِيَ عَنۡهُمۡ مِنۡ بَيۡتِ الۡمَالِ[1] امام کو چاہیے کہ ان کے قرضوں کو بیت المال سے ادا کرے۔

عہد رسالت میں اگر کوئی شخص مقروض مرجاتا تو ابتداءً رسول کریمؐ اس کی نماز جنازہ خود نہ پڑھتے بلکہ کسی صحابی سے نماز پڑھ دینے کے لیے فرما دیتے لیکن جب بیت المال کو صدقات کے محصول سے کافی آمدنی ہونے لگی تو آپ نے فرما دیا کہ "جس نے مال چھوڑا وہ اس کے وارثوں کے واسطے ہے اور جس نے قرض چھوڑا وہ ہماری طرف ہے"[2] اس طرح رسول کریمؐ نے نادار قرضداروں کے قرض کی کفالت اور ان کے اہل و عیال کی کفالت حکومت کی جانب سے قبول فرمائی اور بیت المال سے مقروضوں کا قرض ادا ہونے لگا۔

حالیہ زمانہ میں مصالحت قرضہ کی انجمنوں کو "سب سے نمایاں کامیابی بھاؤ نگر میں ہوئی، جہاں قرضوں کا تصفیہ اور ان میں بڑی حد تک کمی کر دینے کے بعد رقم کی ادائی کو دربار نے اپنے ذمہ لے لیا اور لین داروں کے مطالبات کو بتمام و کمال پورا کر دیا"[3]

اس قسم کے قرضوں کی بے باقی کے علاوہ بیت المال سے قرضہ حسنہ کا بھی سرکاری انتظام کیا گیا تھا "میرے محدود مطالعہ میں وہ پہلا مذہب جس نے سود کو حرام قرار دیتے ہوئے ساتھ ہی ساتھ قرضہ حسنہ کا سرکاری انتظام کرنے کا حکم دیا وہ اسلام تھا چنانچہ تقسیم و گردش دولت اور مالداروں پر محصول لگا کر محتاجوں کی عام امداد کے احکام کے علاوہ قرآن مجید کے سورۂ ۹ آیت ۶۰ میں موازنہ سرکاری کے اصول بتائے گئے ہیں کہ کن کن حالات میں سرکاری آمدنی خرچ کی جا سکتی ہے اس میں فقراء اور مساکین کے علاوہ "غارمین" ایک دلچسپ لفظ ہے، اس کے معنے قرضداروں کے ہیں،

---

[1] ۔ تفسیر طبری ج ۱۰ صفحہ ۱۰۰ آیت: انما الصدقات للفقراء الخ

[2] ۔ بخاری پ ۲۷ کتاب الفرائض ۔

[3] ۔ جیٹھارہ دبیری معاشیات ہند ج ۱ باب ۹ صفحہ ۳۰۴ ۔

فقرار ومساکین کے علاوہ "غارمین" کا لفظ صاف بتاتا ہے کہ اس سے مراد وہ خوشحال لوگ ہیں جن کو مجبوراً عارضی طور سے قرض لینا پڑا ہو، مفلس قرضدار تو فقرار ومساکین میں آجائے گا۔"

"سود کی ممانعت عہد نبوی کے آخری احکام میں سمجھی جاتی ہے اور خوش باش لوگوں کے قرضہ حسنہ کے یہ احکام جناب رسالت مآبؐ کی وفات سے بمشکل سال بھر پہلے کے ہیں اس لیے اس کا خصوصی "ادارہ" عہد نبوی میں وجود میں نہ آسکا کیونکہ اس حکم کے بعد جلد ہی ارتداد وغیرہ کی بغاوتیں شروع ہوئیں جن کا سلسلہ حضرت ابوبکرؓ کے دور خلافت میں بھی جاری رہا۔ آخر جب حضرت عمرؓ کے زمانہ میں مملکت اسلامیہ نے استحکام اور وسعت حاصل کی تو مورخین نے بیان کیا ہے کہ بیت المال کے خزانہ عامرہ میں ایک صیغہ قرضہ بلاسودی کا بھی کھول دیا گیا تھا اور مختلف لوگ حتیٰ کہ خود خلیفہ بھی اپنی سالانہ تنخواہ کی کفالت پر بیت المال سے قرضہ حاصل کیا کرتے تھے۔"

"خلافت راشدہ میں اس کا سلسلہ جاری رہا اور مدینہ منورہ کے مرکزی بیت المال اور دیگر مقامات کے صوبہ واریوں سے یہ کاروبار ایک امر مفاد عامہ کے طور پر انجام پاتا رہا اور مملکت اسلامیہ میں سودی قرضوں کا نام ونشان تک نہ رہا۔"[1]

جن ملکوں میں معاشیات عدم مداخلت[I] کا رواج ہے حکومت قرضدار اور قرضخواہ کے معاملہ میں دخل نہیں دیتی حالانکہ اس عدم مداخلت کی پالیسی سے بیسیوں معاشی اور معاشرتی خرابیاں پھیلتی ہیں۔ "ہندوستان کے مہاجن اور ساہوکار بھی ربا خوری میں یورپ کے یہودیوں سے کم نہیں انھوں نے بھی جونک کی طرح ملک کا بہت سا خون چوسا ہے[2] اصول عدم مداخلت اور

---

[1] ڈاکٹر حمید اللہ: انجمن ہائے قرضہ حسنہ کی اہمیت اور حیدرآباد میں ان کی حالت مجلہ طیلسانین عثمانیہ حصہ معاشیات ج ۲ ۱۹۴۳ء۔

I. Laissez faire حکومت کی رعایا کے انفرادی کاروبار میں دخل نہ دینے کی پالیسی۔

[2] پروفیسر الیاس برنی صاحب: معیشت الہند فصل دہم صفحہ ۲۹۷

معاہدہ کی پوری پابندی کے تصورات اور "غیر معمولی کثرتِ کار کے باعث دیوانی عدالتوں کے ججوں نے کمترین مقاومت کا طریقہ اختیار کیا اور معاہدہ کی تفصیلوں میں پڑنے کی کوشش کیے بغیر قانون کا سختی کے ساتھ اور لفظ بہ لفظ اطلاق کرنے کو پسند کیا ہے[1] اس کے سوا مروجہ قانون میں لچک بھی نہیں تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ "شائلاک" کو ایک پونڈ گوشت دلانے کے معاہدہ کی پوری پابندی سے بیسیوں "انٹونیو" کی جانیں چلی گئیں۔ یوپی، سی پی اور پنجاب وغیرہ کی عدالتوں کی پوری مسلیں ان خونچکاں داستانوں کے گہرے رنگ سے رنگیں ہیں جن میں مقروض نے کسی غیر پیدا آور غرض کے لیے پانچ دس روپیہ قرض لیے تھے اور عدالت نے اپنی قوت اور اقتدار کے بل بوتے پر قرضخواہ کو سینکڑوں ہزاروں روپیے مقروضوں کی جیب سے یا ان کے گھربار کو ہراج کرکے دلوائے[2]۔ اس طرح ہزاروں گھربار تباہ ہوگئے اور عدم مداخلت کی پالیسی سے رعایا کو سخت نقصان پہنچا۔ آخر ساہوکاروں کی دراز دستیوں سے تنگ آکر سرکار نے تمام ملک کی استدعا پر ۱۹۱۸ء میں ہندوستان میں بھی انگلستان کی طرح قانون رباخوری نافذ کیا اور لین دین کی بیجا شرطوں میں عدالتوں کو ترمیم اور تنسیخ کا مجاز گردانا، لیکن صرف اس قدر مداخلت سے مقروض اور قرضخواہوں کا جھگڑا نہیں چک سکتا۔ مسٹر بیچ ولف لکھتے ہیں کہ "سارا ملک مہاجن کے پنجے میں پھنسا ہوا ہے اور قرضے کی زنجیریں زراعت کی راہ میں رکاوٹ ڈال رہی ہیں[3]" خود سرکاری زرعی کمیشن کی رپورٹ ہے کہ "ہمیں یقین ہے کہ کوئی بھی ایسے نظام کو برقرار رکھنا نہیں چاہتا جس کے تحت لوگوں کی بڑی تعداد مقروض پیدا ہوتی ہے،

---

[1] جتھار و بیری: معاشیات ہند باب ۹ ص ۲۹۰
[2] پنجاب کے قرضوں کی تفصیل دیکھیے کتاب پنجاب کا دیہی قرضہ از ڈارلنگ"۔ اور یوپی کے قرضوں کی تفصیل کے لیے اصول معاشیات نیز معیشت الہند از پروفیسر الیاس برنی ملاحظہ ہوں۔
[3] بیچ، ولف کی کتاب موسوم بہ "ہندستان میں امداد باہمی" صفحہ ۳۔

مقروض زندگی بسر کرتی ہے اور مقروض مرتی ہے بلکہ مرنے کے بعد بھی اپنا بوجھ اپنے وارثوں کے سر ڈال جاتی ہے[1]۔ غرض یہی قرضداری کا مسئلہ ہندوستان و پاکستان کی زرعی معیشت کے نہایت اہم مسائل میں سے ایک ہے۔

اسلام نے یہ بڑی اچھی اصلاح کی کہ ایک طرف سود کو ناجائز ٹھیرایا تو دوسری طرف محصول زکات سے "غارمین" کی کفالت کے لیے ایک مد بھی رکھی اور بیت المال یا قومی خزانے سے قرض حسنہ کا بھی انتظام کیا۔

انگلستان میں ہنری ہشتم کے عہد سے پہلے عیسائی رعایا کو سودی کاروبار اور لین دین کی قانوناً ممانعت کردی گئی تھی لیکن قانون اس وجہ سے ناکام رہا کہ قرضہ حسنہ یا بلاسودی قرضہ کا کچھ انتظام نہ تھا نیز یہودیوں کو سودی کاروبار سے مستثنیٰ رکھا گیا تھا۔ یہودیوں کو سود لیتا دیکھ کر بھلا عیسائی کب رکنے والے تھے انھوں نے بھی سودی کاروبار دھڑتے سے شروع کردیا اور حکومت کو اپنا سا منھ لیکر عدم مداخلت کے اصول پر مجبور ہونا پڑا۔ البتہ ہنری ہشتم نے شرح سود دس فیصد معین کردی۔

"جدید ترین ماہرین معاشیات بھی یہ ماننے لگے ہیں کہ سب سے مہذب معاشرہ وہی ہوگا جہاں شرح سود سب سے کم ہو اور بلاسودی قرضہ ملنا ایک انتہائی مطمح نظر ہے۔ یہ چیز مان تو لی گئی ہے لیکن جب تک بلاسودی قرضہ دینے کا کوئی قابل اطمینان انتظام نہ کیا جائے۔ صرف سود کی اخلاقی بلکہ قانونی ممانعت سے مقصد حاصل نہیں ہوتا۔ مذہبی آدمی سود لینے سے تو بچیگا لیکن سود دینے پر وہ بھی خواہی نخواہی مجبور ہوتا ہے جب اس کے احتیاج کی تکمیل کسی سودخوار کے سوا کوئی اور کرنے آمادہ نہ ہو"[2]

---

[1] ۔ دکن بلوہ کمیشن ۔ لاحظہ ہو رپورٹ کا فقرہ ۳۶۷ ۔

[2] ۔ ڈاکٹر حمید اللہ: انجمن ہائے قرضہ حسنہ کی اہمیت اور حیدرآباد میں ان کی حالت۔ مجلہ طیلسانین حصہ معاشیات ج ۲ ۱۹۴۳ء ۔

اب جبکہ عدم مداخلت کے اصول کی خامیاں واضح ہو چکی ہیں آج نہیں تو کل دنیا کی حکومتوں کو ملک کے باشندوں کے قرضہ کی اصلاح کے معاملوں کو اپنے ہاتھ میں لے کر سرکاری خزانہ سے قرضہ کا انتظام کرنا پڑے گا چنانچہ اب مملکت حیدرآباد میں "حکومت سرکار عالی نے سابق سپاہیوں، ان کی بیواؤں یا پسماندہ لوگوں کو بلاسودی قرضہ دینے کے لیے چالیس ہزار روپے کی منظوری عطا فرمائی ہے۔ یہ قرضے شادی، بچوں کی تعلیم، یا تجہیز و تکفین کے لیے دیے جائیں گے"[1] گو ایک ایسی مملکت جس کا موازنہ کروڑوں روپیہ کا ہو اس میں سے چالیس ہزار کی رقم ایک حقیر رقم سہی لیکن ایک اصول تسلیم کر لیا گیا کہ بیسویں صدی میں بھی بلاسودی قرضہ دیا جا سکتا ہے[I] اور اس طرح مملکت حیدرآباد نے دنیا کی اور حکومتوں کے لیے ایک نظیر قایم کر دی۔

(ھ) ساتواں حصہ "فی سبیل اللہ" تھا یعنی اس سے فوج کی ضرورتوں پر خرچ ہوتا تھا۔ ذمی رعایا سے اسلامی مملکت جزیہ کے نام سے جو محصول لیتی تھی اس کا ایک بڑا حصہ فوج پر صرف ہوا کرتا تھا اسی طرح زکات کا ایک حصہ بھی فوج پر صرف کیا جاتا تھا غرض محصول زکات میں سے "ساتواں حصہ "فی سبیل اللہ" کا رکھا گیا ہے اس سے مراد مجاہدین ہیں ان کو اس میں سے جہاد کی ضرورت کے موافق دیا جائے گا۔ اگر لشکر والے کہیں چھاؤنی ڈال کر رہیں تو ان کے جانے اور

---

[1] رہبر دکن مورخہ ۳۰ جمادی الثانی سنہ ۱۳۶۳ھ مطابق ۱۲ جون سنہ ۱۹۴۴ء بحوالہ (۱ - ب)

I فوجی کارروائی سے پہلے گرانی اور معاشی ناکہ بندی کے زمانے میں بھی مملکت حیدرآباد نے تمام سرکاری غیر گزیٹڈ ملازموں کو ان کی تنخواہ کی ضمانت پر فی کس زیادہ سے زیادہ ایک ہزار روپیہ بلاسودی جاری کیے تھے۔ یہ قرضے کئی لاکھ تک پہنچے اور اب تک ماہانہ قسطوں میں ان کی ادائی ہو رہی ہے۔

ابھی حال میں سعودی عرب کی حکومت نے شام کی حکومت کو ساٹھ لاکھ پونڈ کی گراں قدر رقم کا بے سودی قرض قرض حسنہ کے طور پر دیا ہے اور چار مساوی اقساط میں پانچ سال بعد قرض کی ادائی ہوگی۔ (پی۔ ٹی۔ آئی، رائٹر) بحوالہ اخبار ہند مورخہ ۹ فروری سنہ ۱۹۵۰ء۔

وہاں کے قیام کا انھیں مناسب خرچ دیا جائے گا، اگر جہاد سے لوٹ رہے ہوں تو آنے جانے کا خرچ دیا جائے گا[۱]۔ امام بیضاوی نے "سبیل اللہ" کی ذیل میں "پل اور قلعے (مصانع) بنانے[۲] کے اخراجات بھی مراد لیے ہیں۔

(ح) آٹھواں حصہ "ابنُ السَّبِیْل" (مسافر) کے لیے ہے "ابنُ السَّبِیْل" سے وہ مسافر مراد ہیں جن کے پاس زادِ راہ نہ ہو، اس حصہ میں سے ان کو اس شرط پر کہ ان کا سفر کسی معصیت کے لیے نہ ہو اتنا ہی دیا جائے گا جو سفر میں کافی ہو سکے، اس میں آغازِ سفر والا اور درمیان سفر والا دونوں برابر ہیں، امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ درمیان سفر والے کو دیا جائے آغاز والے کو نہ دیا جائے[۳]۔ آغازِ سفر والے کو دینا یا نہ دینا اب حکومت کے اختیار میں ہوگا۔ آغاز والے کی بھی کبھی مدد ضروری ہو جاتی ہے مثلاً اکثر دیہاتی شہر میں آکر محنت مزدوری کرتے رہتے ہیں اب فرض کیجیے کہ اتفاق سے گاؤں میں ان کا کوئی قریبی رشتہ دار بیمار ہو جائے اور موٹر یا ریل کا سفر کرنے کے لیے پیسہ پاس نہ ہو تو مجبور ہو کر لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلانا پڑے گا جو انسانی عزت و وقار کے منافی ہے اس لیے اسلامی حکومت کو اپنے موازنہ میں مسافروں کی امداد کے لیے بھی رقم رکھنا لازم ہو گیا چاہے ان مسافروں کی ان کے وطن میں کتنی ہی دولت کیوں نہ ہو، بعض اتفاقی حادثوں کی بنا پر مسافر کا غربت میں کوئی آسرا اور سہارا نہیں رہتا مثلاً ہندوستان کے بہت سے دولت مند جو انگلستان گئے ہوئے تھے دشمن کی بمباری سے تباہ حال ہو گئے۔ ایسے ہی تباہ حال مسافروں کی امداد ضروری ہے۔

قدیم زمانہ میں مسافروں کی امداد اکثر ملکوں میں رضاکارانہ طور پر افراد ہی

---

[۱] ماوردی: الاحکام السلطانیہ باب ۱۱ ص ۱۱۸ نیز ابویعلیٰ صفحہ ۱۱۰ قسمۃ الصدقات۔

[۲] تفسیر بیضاوی ج ۱ صفحہ ۳۴۸ آیت: إنما الصدقات الخ۔ عربی میں مصانع کا لفظ حوضوں کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

[۳] ماوردی: الاحکام السلطانیہ باب ۱۱ ص ۱۱۸

کیا کرتے تھے، جاہلی عرب میں ایک غریب عرب کے پاس صرف ایک ہی اونٹنی رہتی اور اتفاق سے کوئی مسافر آجاتا تو وہ اس اونٹنی کو ذبح کر دینے میں بھی دریغ نہیں کرتا تھا لیکن ہندوستان میں جہاں برہمنوں کی بستی ہوتی تھی اگر وہاں کوئی بھولا بھٹکا شودر مسافر چلا جاتا تو اس کی امداد تو امداد اسے اپنے محلہ میں بھی بھٹکنے نہیں دیا جاتا تھا اور ابھی تک ہندوستان کے بعض مقاموں پر ایسا ہی ہے۔

مسافروں کی امداد نہ صرف رقم کی شکل میں بلکہ بعض دوسرے اور ذریعوں مثلاً مسافر خانے، اسٹیشنوں پر ویٹنگ روم، اور حمام خانے (اشنان گھر) وغیرہ بنا کر بھی کی جاسکتی ہے۔

محصول زکات کے مصارف کا بیان ختم ہوا یہاں دو ایک باتوں کی وضاحت ضروری ہے بعض فقہاء کا اس میں اختلاف ہے کہ آیا برابر آٹھ حصے کیے جائیں یا تمام مذکورہ لوگوں کو دیا جائے۔ اس پر زیادہ بحث کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ یہ حالات اور واقعات کے ساتھ امام کے اختیار تمیزی پر منحصر ہے۔

محصول زکات کے سلسلہ میں اور ایک بات یہ ہے کہ یہ محصول ــــ خواہ جنس کی شکل میں لیا جاتا یا روپیہ کی شکل میں ــــ مقامی طور پر وہیں کے بیت المال کے توسط سے تقسیم کر دیا جاتا تھا[1] اور مرکزی حکومت کے

---

[1] ۔ رسول کریمؐ اور خلفاء راشدینؓ کے زمانہ میں زکات مقامی طور پر تقسیم کر دی جاتی تھی، جب یہ دور ختم ہوا اور بعض ظالم حکمران ہوئے تو وہ اس کو مرکز میں منگوانے لگے چنانچہ زیاد یا کسی اور امیر نے عمران بن حصین کو زکات کے وصول کرنے پر مامور کیا۔ جب عمران لوٹ کر آئے تو اس نے پوچھا کہ مال کہاں ہے؟ عمران نے کہا کیا تو نے مجھے مال لانے کے لیے بھیجا تھا۔ ہم نے اسی طرح زکات لی جس طرح رسول اللہؐ کے زمانہ میں لیتے تھے۔ اور اس کو ایسے ہی صرف کیا جیسے رسول اللہؐ کے زمانہ میں صرف کیا کرتے تھے۔

ابو داؤد کتاب الزکوٰۃ نیز ابن ماجہ کتاب الزکوٰۃ

خزانہ کو اس سے بہت کم تعلق ہوتا تھا کیونکہ یہ اصول کفایت شعاری کے عین مطابق تھا۔

اس زمانہ میں انکم ٹیکس (محصول آمدنی) کا منشا بھی غریبوں کی امداد بتایا جاتا ہے لیکن عملاً وہ پھر مالداروں کے ہی پاس چلا جاتا ہے کیونکہ حکومتیں مالداروں سے بڑی بڑی رقمیں قرض لیتی ہیں اور یہ انکم ٹیکس سے لیا ہوا روپیہ پھر سود کی شکل میں مالداروں کی جیبوں میں پہنچ جاتا ہے اور دولت ملک کے چند سرمایہ داروں کے ہاتھ میں سونے کی چڑیا بن کر رہ جاتی ہے۔ جب تک حکومت دولتمندوں پر محاصل لگا کر ناداروں اور مفلسوں کی امداد نہ کریگی اجتماعی طور سے انسانیت کبھی ترقی نہیں کر سکتی۔

(۳) قرآن کے بیان کئے ہوئے مصارف کے سوا اور دوسرے مصارف

بیت المال کے مصرف رسول کریمؐ اور خلفاء راشدینؓ کے زمانہ میں اسلامی حکومت کی مختلف آمدنیوں کے مصارف کا جو عمل درآمد تھا اس کی روشنی میں فقہاء نے بیت المال کی آمدنیوں کو مصارف کے لحاظ سے چار مختلف شعبوں میں تقسیم کیا ہے۔ اس کا ایک سرسری سا تذکرہ ابھی سرکاری مصارف کے ابتدائی حصہ میں گذر چکا۔ اب ہم شمس الائمہ سرخسی کی زبانی اس کی مزید وضاحت کریں گے۔ شمس الائمہ سرخسی کو اسلامی چمنستان فقہ کی آخری فصل بہار کہنا چاہیے کیونکہ امام موصوف کے بعد پھر کوئی ایسی غیر معمولی ذکاوت اور معنی آفریں فقیہ نہیں ہوا اور بعد کے زمانہ کے فقہا نے ——— گو چند ان میں سے مستثنیٰ سہی ——— ان ہی کی کتابوں یا ان کے پیشرو فقہا کی کتابوں کے خلاصے، حاشیے یا شرحیں لکھنے سے ایک قدم آگے نہ بڑھ سکے۔

"بیت المال کو جو محاصل وصول ہوتے ہیں اس کی چار قسمیں ہیں۔

(۱) "ان میں سے ایک تو خمس ہے جس کا مصرف خدا وند تعالیٰ نے یہ بیان فرمایا ہے کہ

وَاعْلَمُوْا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ۔	جان لو کہ جو کچھ بھی مال غنیمت میں ملے اس کا خمس اللہ اور رسول کے لیے ہے نیز رسول کے قرابت داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لیے

پ۱۰ الانفال ۱ رع ۵

"پھر ہمارے پاس رسول کریم کا حصہ آپ کی وفات کے بعد ساقط ہو گیا اور امام شافعیؒ کہتے ہیں کہ آپ کے بعد ہر ایک خلیفہ کے لیے ہے کیونکہ ان کو بھی وفد اور سفیروں کے بھیجنے کی ضرورت پڑتی ہے جیسا کہ رسول کریمؐ کو ہوتی تھی اور ہماری دلیل یہ ہے کہ خلفاء راشدینؓ نے یہ حصہ اپنے لیے نہیں حاصل کیا اور یہ صرف رسول اللہؐ کے لیے تھا۔"

(۲) "دوسری قسم صدقات اور عشور ہیں جن کا مصرف ہم بیان کر چکے ہیں۔"

(۳) "تیسری قسم خراج اور جزیہ ہے اور وہ صدقات ہیں جو بنو تغلب سے حاصل ہوں اور نیز جو کچھ کہ عاشر ذمیوں اور حربیوں سے جبکہ وہ اس کے پاس سے گزرے وصول کرتا ہے۔"

"اس قسم کے مال کا مصرف یہ ہے کہ مسلمانوں کی ضرورتوں پر صرف کیا جائے۔ اور اسی سے فوجیوں کی تنخواہیں دی جائیں، فوجیوں کو جو تنخواہیں دی جاتی ہیں وہ نہ صرف انہی کو کافی ہوں بلکہ انکے بال بچوں کو بھی کفایت کریں کیونکہ انھوں نے اپنی ذات کو جہاد کے لیے خاص کر رکھا ہے اور مشرکین کے شر کو مسلمانوں سے دور کرتے رہتے ہیں۔"

"اور اس مال سے اسلحہ اور ہتھیار خریدے جائیں اور قلعے بنائے جائیں اور چھوٹے اور بڑے پل تعمیر کیے جائیں اور ندی کا پانی روکنے کے لیے پشتے بنائے جائیں اور اسی سے بڑی نہریں نکالی جائیں۔"

"اور اسی سے قاضیوں (عدالت کے حاکموں) مفتیوں، محتسبوں اور

اساتذہ کو روزینے عطا کیے جائیں اور نیز ہر اس شخص کو جو مسلمانوں کے کاموں میں مصروف ہو کفایت کے لحاظ سے اسی نوع کے مال سے گزارے دیے جائیں۔"

(۴) "محاصل کی چوتھی قسم میں مسلمانوں کے وہ متروکے ہیں جن کا کوئی وارث نہ ہو یا صرف میاں یا بیوی ہی وارث ہوئی ہو تو باقی کا مصرف بیت المال ہے۔ اسی طرح لاوارث مال (لقطہ) ہے جب کہ اس کی شناخت نہ ہو سکے تو ایسے مال بھی بیت المال کے لیے ہیں۔"

"اور اس قسم کے مال کا مصرف گمنام لاوارث بچوں کی پرورش اور ایسے مسلمانوں کی تکفین ہے جن کے پاس مال نہ ہو۔"

"امام پر لازم ہے کہ مال کو اس کے مصارف میں صرف کرتے وقت اللہ سے ڈرتا رہے۔ ہر ایک نادار کو صدقات سے اتنا دے کہ غنی ہو جائے۔"

"اگر بعض مسلمانوں کو ضرورت پڑے اور بیت المال میں صدقات نہ ہوں تو امام خراج کے بیت المال سے ان کی احتیاجوں کے لیے رقم عطا کرے گا اور یہ صدقہ کے بیت المال پر قرض نہ ہوگا کیونکہ ہم نے بیان کر دیا ہے کہ خراج اور اس کے ساتھ جو آمدنیاں ہیں وہ مسلمانوں کی ضرورتوں ہی پر صرف ہوتی ہیں۔"

"اس کے برخلاف امام کو اگر فوجیوں کو تنخواہ دینی ہو اور خراج کے بیت المال میں مال نہ ہو تو صدقہ کے بیت المال پر بطور قرض کے ہوگا کیونکہ صدقہ کا مال تو صرف فقراء اور مساکین کے لیے ہے۔"[1]

شمس الائمہ سرخسی نے حکومت کے مصارف کی مختلف مدوں کو جس پیرایہ میں بیان کیا ہے اس میں اس قدر لچک ہے کہ حکومتوں کی جدید ضرورتیں بھی ان کے تحت آسکتی ہیں۔

---

[1] شمس الائمہ سرخسی: مبسوط ج ۳ کتاب الزکوٰۃ ص ۱۸، نیز ھدایہ ج ۲ کتاب السیر فصل فی نصاریٰ بنی تغلب و مصارف بیت المال۔

صدر مملکت کا مشاہرہ

جب رسول کریمؐ ہجرت کرکے مدینہ تشریف لائے تو لوگوں نے کھجور کے درختوں سے رسول اللہؐ کی اعانت کی تھی[1] بعد کے برسوں میں "رسول کریمؐ کے لیے تین صفایا (منتخبہ) تھے۔ بنو نضیر کی اراضی رسول کریمؐ کے لیے تھی اور فدک مسافروں کے لیے خیبر کو آنحضرتؐ نے تین حصوں میں تقسیم کر دیا تھا دو حصے مسلمانوں کے لیے تھے اور ایک حصہ اپنے اہل و عیال کے خرچ کے لیے۔ پھر جو آپ کے خرچ سے بچتا وہ مہاجر فقراء پر صرف کر دیا جاتا تھا"[2]

"ابو بکرؓ تجارت پیشہ تھے، روزانہ آپ صبح کو بازار جاتے اور لین دین میں لگے رہتے۔ ...... سنح کے قیام کے زمانہ میں چھ مہینے تک آپ کا یہی طرز عمل رہا پھر آپ مدینہ چلے آئے اور وہیں قیام کر لیا۔ آپ نے خلافت کے فرائض اور اپنے معاشی مسئلہ پر غور کر کے کہا بخدا! لوگوں کے معاملات کی نگرانی کے ساتھ ساتھ تجارت وغیرہ کچھ ہو نہیں سکتی۔ اس خدمت کے لیے فراغت اور پوری توجہ کی ضرورت ہے۔ ادھر میرے اہل و عیال کے لیے بھی کچھ ضروری ہے اس لیے آپ نے تجارت چھوڑ دی اور بیت المال سے اپنی اور اپنے متعلقین کی ضرورتوں کے لیے روزانہ کا خرچ لینے لگے۔ صحابہ نے آپ کے ذاتی مصارف کے لیے ابتدا میں کم لیکن گنجائش ہو جانے کے بعد آخری زمانہ میں سالانہ چھ ہزار درہم کی رقم منظور کی تھی"[3]

"جب ابو بکرؓ خلیفہ ہوئے تو انھوں نے کہا کہ بے شک میری قوم جانتی ہے کہ میرا پیشہ ایسا نہیں کہ میرے اہل و عیال کی کفالت نہ کر سکے۔ لیکن میں مسلمانوں کے کام میں مصروف کر دیا گیا ہوں تو اب ابو بکر کے بال بچے اس مال (بیت المال) سے کھائیں گے اور میں مسلمانوں کا کام کروں گا"[4]

"امام کا نفقہ بیت المال پر ہے اور یہ اتنا مقرر کر دیا جائے، جو اس کی

---

[1] تیسرے باب میں ص ۲۲۳ پر تفصیل بیان کی جا چکی۔ [2] ابو داؤد ج ۲ کتاب الخراج۔
[3] تاریخ طبری ج ۴ صفحہ ۵ مطبوعہ لیڈن [4] بخاری ج ۱ کتاب البیوع نیز کتاب الاحوال ص ۲۶۶ نمبر ۶۵۶

ضرورتوں کو پورا کر سکے چنانچہ بیان کیا جاتا ہے کہ جب حضرت ابوبکرؓ خلیفہ منتخب ہوئے تو حضرت عمرؓ نے انھیں دیکھا کہ وہ اپنے اہل و عیال کا کچھ سامان اٹھائے لیے جا رہے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے کہا: اے رسول اللہؐ کے خلیفہ! آپ کہاں جا رہے ہیں؟ انھوں نے کہا کہ اپنے اہل و عیال کے واسطے سامان بیچنے کے لیے بازار جا رہا ہوں کیونکہ میری ضرورتوں کے لیے خرچ نہیں ہے چنانچہ صحابۂ کرامؓ جمع ہوئے اور انھوں نے ابتدائً آپ کے لیے روزانہ ۲⅔ درہم یا تین درہم یا ۳½ درہم مقرر کر دیے اس میں روایتوں کا اختلاف ہے[1]

مورخ ابن سعد وغیرہ کا بیان ہے کہ "حضرت ابوبکرؓ کی دو ہزار تنخواہ مقرر ہوئی مگر آپ نے عذر کیا کہ میرا کنبہ بڑا ہے اور مجھ سے خلافت کی مصروفیت کی وجہ سے اب تجارت نہ ہو سکے گی اس لیے کچھ اضافہ کیا جائے چنانچہ پانچسو کا اضافہ ہو گیا"[2]

"جب ابوبکرؓ کی وفات کا وقت ہوا تو انھوں نے کہا کہ میرے پاس بیت المال کا جو کچھ سامان ہو وہ سب واپس کر دو کیونکہ میں اس مال میں سے اپنے ذمہ کچھ رکھنا نہیں چاہتا، فلاں مقام والی میری زمین اس رقم کے معاوضہ میں دے دو جو آج تک میں نے بیت المال سے لی ہے چنانچہ وہ زمین اور ایک اونٹنی، ایک قلعی گر غلام اور کچھ غلہ جس کی قیمت پانچ درہم ہو گی یہ سب چیزیں عمرؓ کو دیدی گئیں۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ ابوبکرؓ نے اپنے بعد والوں کو کسی قدر مشکل میں ڈال دیا"[3] ایک روایت یہ ہے کہ ابوبکرؓ نے لوگوں سے کہا کہ حساب لگا کے بتاؤ کہ جب سے میں خلیفہ ہوا میں نے بیت المال کی اب تک کتنی رقم صرف کی ہے، جو کچھ رقم نکلے اس کو میری جائداد سے وصول کر لو چنانچہ حساب لگایا گیا تو پورے زمانہ خلافت کی رقم آٹھ ہزار درہم نکلی[4]

---

[1] ۔ شمس الائمہ السرخسی: مبسوط ج ۳ ص ۱۹ باب ما یوضع فیہ الخمس

[2] ۔ ابن سعد ج ۳ ص ۱۳۱ سیوطی: تاریخ الخلفاء ص ۳۰ [3] تاریخ طبری ج ۴ ص نیز تفصیل کتاب الاموال ص ۲۶۷ نمبر ۶۵۷ تا ۶۵۹ [4] تاریخ طبری ج ۴ ص ۲۱۴۴ ۔

حضرت عمرؓ بھی اپنی اور اپنے اہل و عیال کی گزر بسر کے لیے بیت المال سے لینے لگے بعد میں بدر میں شریک ہونے والے صحابہ کے مثل آپ نے بھی اپنی ذات کے لیے سالانہ پانچ ہزار درہم مقرر کیے۔[1]

جب حضرت عثمانؓ خلیفہ ہوئے تو "آپ بیت المال سے اپنی ثروت اور دولتمندی کی بنا پر کچھ نہ لیتے تھے"[2]

حضرت علی کرم اللہ وجہہ اپنی خلافت کے زمانہ میں بیت المال سے ماہوار (پانچ ہزار درہم سالانہ) لینے لگے۔

حاصل یہ کہ صدر مملکت اگر دولتمند ہو تو بہتر یہی ہے کہ بیت المال سے کچھ نہ لے اور اگر ضرورتمند ہو تو اپنے اور اپنے اہل و عیال کے لیے بیت المال سے ضرورت کے موافق لیا کرے جیسا کہ خداوند تعالیٰ نے یتیموں کے محافظین کے بارے میں رہنمائی فرمائی ہے کہ[3]

مَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ، وَمَنْ كَانَ فَقِيرًا فَلْيَأْكُلْ بِالْمَعْرُوفِ۔ — جو (سرپرست) مالدار ہو وہ بچتا رہے اور جو نادار ہو وہ دستور کے موافق کھائے۔

پ۴ نساء ۴ع ۱

عدالت کے حاکموں کی تنخواہ

صدر مملکت کی طرح عدالت کے حاکموں کی تنخواہ کا مسئلہ ہے "حاکم عدالت (قاضی) کا روزینہ مقرر کرنے میں کچھ حرج نہیں ہے کیونکہ رسول کریمؐ نے عتاب بن اُسید کو مکہ بھیجا اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو یمن بھیجا اور ان کا روزینہ مقرر کردیا نیز اس وجہ سے بھی کہ وہ مسلمانوں کے حق میں منہمک ہوگیا تو اس کا خرچ انہیں پر یعنی بیت المال پر ہوگا"[4]

اسی طرح مختلف اسلامی ماخذوں سے دوسرے سرکاری ملازمین اور

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو باب۲ ج ۲ ص ۴۴۴

[2] شمس الائمہ السرخسی: مبسوط ج ۳ صفحہ ۱۹ باب ما یوضع فی الخمس

[3] شمس الائمہ السرخسی: مبسوط ج ۳ صفحہ ۱۹ باب ما یوضع فی الخمس

[4] ھدایہ ج ۴ کتاب الکراہیۃ۔

اعلیٰ عہدہ داروں کی تنخواہیں جو رسول کریمؐ کے عہد مبارک میں یا خلفاء راشدینؓ کے زمانہ میں مقرر تھیں درج کی جاسکتی ہیں لیکن اب ہم مزید تفصیلات میں نہیں جائیں گے البتہ اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ حضرت عمرؓ نے ورکٹال کی دیانت اور راست بازی قایم رکھنے کے لیے نہایت عمدہ اصول یہ اختیار کیا تھا کہ تنخواہیں بیش قرار مقرر کی تھیں۔ یورپ نے مدتوں کے تجربہ کے بعد یہ اصول سیکھا ہے اور ایشیائی سلطنتیں تو اب تک اس راز کو نہیں سمجھیں جس کی وجہ سے رشوت اور غبن ایشیائی سلطنتوں کا خاصہ ہوگیا ہے۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں اگرچہ معاشرت نہایت ارزاں اور روپیہ گراں تھا تاہم تنخواہیں علیٰ قدر مراتب عموماً بیش قرار تھیں۔ صوبہ داروں کی تنخواہ پانچ پانچ ہزار تک ہوتی تھی اور غنیمت کی تقسیم سے جو مال ملتا تھا وہ الگ چنانچہ امیر معاویہؓ کی تنخواہ ہزار دینار ماہوار یعنی پانچ ہزار روپے تھی۔[1]

لاوارث بچوں کی پرورش

گمنام اور لاوارث بچوں کی پرورش بیت المال کے چوتھے شعبے کی گنجایش سے ہوتی تھی، "جب کوئی بچہ جس کا باپ نہ ہوتا یا جسے کسی گذرگاہ پر ڈال دیا جاتا حضرت عمرؓ کے پاس لایا جاتا تو آپ اس کے لیے سو درہم مقرر کرتے اور اس کی خوراک اور دوسرے مصارف کے لیے جتنے مال کی ضرورت ہوتی مقرر کرتے، اس کا ولی مہینے کے مہینے اس کا فریضہ آکر لے جاتا، امیر المومنین سال کے سال اس کو جاکر دیکھتے اس کے حق میں حسن سلوک کی ہدایت کرتے اور بیت المال سے اس کی رضاعت اور پرورش کے اخراجات کا حکم دیتے"[2]

"گمنام لاوارث بچہ (لقیط) کا نفقہ بیت المال سے ہوگا اور یہی حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ سے مروی ہے اور اس دلیل سے کہ لقیط ایک ایسا مسلمان ہے جو کمائی کرنے سے عاجز ہے۔ نہ اس کا مال ہے اور نہ کوئی قرابت دار ہے تو وہ

---

[1] شبلی: الفاروق حصہ دوم صفحہ ۳۸ عہدہ داران ملکی بحوالہ استیعاب قاضی عبد البر اور ازالۃ الخلفاء ج ۲ صفحہ ۱۷۔

[2] بلاذری فتوح البلدان صفحہ ۴۵۲ عطا کی ابتداء نیز تاریخ یعقوبی ج ۲ ص ۱۰۷۔

ایسے بچے کے مثل ہے جس کا کچھ مال نہ ہو یعنے جیسے بچے کا خرچ بیت المال میں ہوتا ہے اسی طرح لقیط کا بھی خرچ بیت المال پر ہوگا۔ اور اس دلیل سے کہ لقیط کی میراث بیت المال میں داخل ہوتی ہے اس طرح جس کو حاصلات ملے وہی خرچ اٹھاتا ہے (الخراجُ بالضّمان) چنانچہ لقیط اگر کوئی جرم کرتا ہے تو بیت المال اس کا خرچ برداشت کرتا ہے[1]

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ "لقیط (گمنام لاوارث بچہ) آزاد ہوتا ہے کیونکہ آدمی میں اصل آزادی ہے اور یوں دارالاسلام بھی آزادوں کا ملک ہے اور اکثر کے اعتبار سے حکم ہوتا ہے[2]" یعنے دارالاسلام میں اکثر لوگ آزاد ہوتے ہیں تو انھیں کے لحاظ سے یہ بھی آزاد ہوگا۔

"ملتقط (جو شخص گمنام بچے کو اٹھا لاتا ہے) کو اختیار ہے کہ لقیط کو کوئی پیشہ و ہنر سیکھنے کے لیے کسی صنعتی درس گاہ کے سپرد کرے کیونکہ یہ اس کی درستی اور حفظ حال کی قسم سے ہے"[3]

غیر مسلموں کے لاوارث بچے:۔ اسلامی مملکت میں جو مذہبی آزادی پائی جاتی تھی اس کے سلسلہ میں یہی اشارہ کافی ہے کہ غیر مسلموں کے لاوارث بچے غیر مسلم ہی شمار ہوتے تھے۔

وَاِنْ وُجِدَ فِی قَرْیَۃٍ مِنْ قُرَیٰ اَھْلِ الذِّمَّۃِ اَوْفِی بِیْعَۃٍ اَوْ کَنِیْسَۃٍ کَانَ ذِمِّیًّا۔

اگر لقیط ذمیوں کے کسی گاؤں یا گرجا کلیسا میں پایا جائے تو وہ ذمی ہوگا۔[4]

---

[1] ھدایہ ج ۲ کتاب اللقیط۔

[2] ھدایہ ج ۲ کتاب اللقیط، اللقیط حرٌ لانّ اصل فی بنی آدم انما ھُوَ الحریۃ وکذا الدار دار الحرار ولان الحکمَ للغالب۔

[3] ھدایہ ج ۲ کتاب اللقیط۔

[4] ھدایہ ج ۲ کتاب اللقیط۔

قیدیوں، مجرموں کا خرچ

"اگر کسی مجرم کے جرائم بڑھ جائیں بار بار کی سزا سے بھی وہ باز نہ آئے اور لوگوں کو اس سے ایذا پہنچے تو حاکم اس کو زندگی بھر کے لیے قید کی سزا دے سکتا ہے اور اس کے کھانے، پینے اور پہننے کا خرچ بیت المال سے مقرر ہو گا۔"[1]

"اگر قید خانہ میں کوئی مقتول پایا جائے تو اس کی دیت بیت المال پر واجب ہو گی۔"[2]

"اور جن قیدیوں کے عزیز و اقارب نہ ہوں ان کی تجہیز و تکفین کا سامان بیت المال سے کیا جائے گا۔"[3]

فوجی آمد و رفت سے زراعت کی پامالی اور اس کی پابجائی

فوجی آمد و رفت سے زراعت وغیرہ کی پامالی ہوتی تو اسکی پابجائی بھی بیت المال سے کی جاتی تھی ایک کاشت کار حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ اے امیر المومنین! میں نے کھیتی بوئی تھی، شام والوں کا ایک لشکر وہاں سے گذرا اور اس نے کھیتی پامال کر ڈالی۔ اس پر حضرت عمرؓ نے بیت المال سے اس کو دس ہزار درہم بطور معاوضہ کے دلوائے۔[4] المختصر بیت المال پر بیسیوں مصارف عائد ہوتے ہیں۔

محصول خراج، محصول جزیہ، اور محصول درآمد یہ مال فیئ کی مدات شمار ہوتے ہیں۔ ان سے اسلامی مملکت کو خاصی آمدنی حاصل ہوتی تھی۔ صرف محصول خراج ہی سے سرکاری خزانہ کو کروڑوں کی آمدنی تھی جس سے تمام مصارف کی پابجائی کی جاتی تھی اور پھر بھی خاصی رقم خزانہ میں بچ رہتی تھی یہاں تک کہ بہت بعد کے زمانہ میں سواد کے علاقہ سے "یوسف بن عمر چھ کروڑ سے سات کروڑ تک سالانہ وصول کرتا تھا اس سے وہ عراق میں متعینہ شامی فوج کو ایک کروڑ چھ لاکھ دیتا، ڈاک کے خرچ میں چالیس لاکھ لگاتا، اور راستوں پر بیس لاکھ صرف کرتا تھا پھر بھی ایک کروڑ درہم غیر معمولی ضرورتوں کے لیے خزانہ عامرہ میں بچ جاتے تھے۔"[5]

زکات کا محصول تو غریبوں کے لیے وصول کیا جاتا اور غریبوں ہی پر تقسیم ہوتا تھا لیکن محصول خراج، محصول جزیہ اور محصول درآمد وغیرہ سے بھی جو آمدنی وصول ہوتی تھی وہ مشترکہ ضرورتوں پر صرف ہوا کرتی اور حکومت کے جملہ مصارف کے بعد جتنا بھی روپیہ بچتا اس کو بھی تمام ملت پر تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ اس کی کافی وضاحت تقسیم دولت باب ۷ میں کی جا چکی۔[6]

حضرت عمرؓ نے نہ صرف شہریوں بلکہ دیہاتیوں کے لیے بھی باقاعدہ تجربے کرنے کے بعد کہ ہر شخص روزانہ کس قدر کھا پی سکتا ہے ان کے روزینے مقرر کیے تھے۔ بعد میں آمدنی میں

1۔ ماوردی: الاحکام السلطانیہ باب ۱۹ صفحہ ۲۰۹ نیز ابو یعلی صفحہ ۲۴۳ ۔ 2۔ ھدایہ ج ۴ کتاب الدیات۔
3۔ ابو یوسف: کتاب الخراج ص ۸۹ ۔ 4۔ ابو یوسف: کتاب الخراج ص ۶۸
5۔ ماوردی: الاحکام السلطانیہ باب ۱۴ ص ۱۶۷ نیز ابو یعلی ص ۱۶۹
6۔ حوالے تقسیم دولت کے باب ۷ ج ۲ ص ۴۵ پر گذر چکے ہیں۔

اضافہ ہوا تو لباس کی تقسیم بھی ہونے لگی۔ آپ نے ان کے لیے پکی اینٹوں کے نئے ہوادار مکانات بنوائے۔ کوفہ، بصرہ اور فسطاط میں نئے شہر بسائے جن میں چوڑی چوڑی سڑکیں، دوکانیں اور چوک بنوائے، ہر محلہ میں اونٹوں تک کے باندھنے کی جگہ الگ رکھی[1] نہریں کاٹ کر شہروں میں آب رسانی کا انتظام کیا، اس طرح ملک کے ہر ایک باشندہ کو کھانے کے لیے کھانا، پہننے کے لیے کپڑا اور رہنے کے لیے مکان نصیب ہوا۔

مورخین کا بیان ہے کہ عمر بن عبدالعزیزؒ اور ولید بن عبدالملک نے معذوروں کے وظائف کے علاوہ اندھوں کی رہنمائی اور اپاہجوں کی خدمت کے لیے آدمی مقرر کیے تھے[2] عمر بن عبدالعزیزؒ اپنے زمانے میں بیت المال سے شادیوں کے لیے بھی امداد دیتے تھے[3] غرض اس سماجی تحفظ کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلامی مملکت میں کسی نادار کا نام و نشان نہ رہا۔

یہاں یہ بات باعث دلچسپی ہوگی کہ خود رسول کریمؐ نے اپنے عاملوں کو حکم دیا تھا کہ اگر وہ چاہیں تو حکومت کے خزانے سے شادیوں کے لیے امداد حاصل کر سکتے ہیں۔ موجودہ زمانہ میں اعلیٰ عہدداروں کے لیے سرکاری مکان اور سرکاری خادم کی جو عام مراعات حاصل ہیں ان کے مقابلے میں یا ان سے دو قدم آگے یہ حکم ہے کہ

عَنِ الْمُسْتَوْرِدِ بْنِ شَدَّادٍ قَالَ: — مستورد بن شدادؓ سے روایت ہے کہ

سَمِعْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ: — میں نے رسول کریمؐ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ

مَنْ كَانَ لَنَا عَامِلًا فَلْيَكْتَسِبْ زَوْجَةً — جو ہمارا عامل ہو تو وہ بیوی کر لے (اگر بیوی نہ ہو)

فَإِنْ لَمْ يَكُنْ لَهُ خَادِمٌ فَلْيَكْتَسِبْ خَادِمًا — اور اگر اس کے پاس نوکر نہ ہو تو نوکر بھی لے لے،

فَإِنْ لَمْ يَكُنْ لَهُ مَسْكَنٌ فَلْيَكْتَسِبْ مَسْكَنًا — اور اگر اس کے پاس مکان نہ ہو تو مکان بھی لے لے

وَفِي رِوَايَةٍ مَنِ اتَّخَذَ غَيْرَ ذٰلِكَ فَهُوَ غَالٌّ[4] — ان اخراجات کے علاوہ اور جو وہ (سرکاری خزانے سے) لے گا تو وہ خائن ہے

اس سلسلے میں محدثین وضاحت کرتے ہیں کہ "عامل کے لیے جائز ہے کہ وہ بیت المال سے بیوی کے نان نفقہ اس کے لباس اور مہر کے اخراجات متوسط پیمانہ پر حاصل کرے" اسی طرح وہ بیت المال سے مکان اور ملازم کے اخراجات بھی حاصل کر سکتا ہے۔ سرکاری خزانہ سے بیوی کا مہر، بیوی کے اخراجات، بیوی کے لباس کا الونس حتیٰ کہ شادی کی دعوت کے اخراجات حاصل کرنا یقیناً بڑی جدت اور دلچسپ بات ہے، مقصد یہی ہے کہ ملازم سرکار، اجیر یا مزدور کو اس کی بنیادی ضرورتوں سے بے نیاز کر دیا جائے تاکہ وہ پوری دلجمعی اور اطمینان قلب کے ساتھ اپنے فرائض منصبی بجا لا سکے۔

عصر جدید کی حکومتیں ادنیٰ تر عہدہ داروں کو الونس کرایہ مکان، الونس گرانی اور تعمیر مکان اور موٹر کی خریدی کے لیے قرضہ عطا کرتی ہیں اسی طرح استانیوں اور مزدور عورتوں کے لیے الونس زچگی اور پوری تنخواہ کے ساتھ رخصت بھی

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ماوردی: الاحکام السلطانیہ باب ۱۵ ص ۱۱۰ نیز دیگر تاریخیں۔
[2] تاریخ طبری ص ۱۲۷۱، سیوطی: تاریخ الخلفاء ص ۲۲۲ نیز ابن جوزی: سیرۃ عمر بن عبدالعزیز ص ۱۱۵
[3] تفصیل کتاب الاموال ص ۲۵۱ نمبر ۶۲۱ ملاحظہ ہو۔ [4] ابو داؤد بحوالہ مشکوٰۃ باب رزق الولاۃ
[5] ہدایہ ج ۴ ص ۲۱۵ مطبوعہ دمشق۔

بعض جگہ ملتی ہے اگر کوئی عوامی حکومت اس اسلامی پیش بندی اور ترقی پسند رجحانات کے تحت ان الاؤنسوں اور بونسوں میں "عطیہ سرکاری برائے شادی" کے ایک جدید مد کا اپنے خرچ کے موازنہ میں اضافہ کرے تو وہ یقیناً آجکل کے زمانہ میں بڑی روشن خیال اور ترقی پسند حکومت تصور کی جائے گی۔

(۴) بیمہ (انشورنس)

"واقعہ یہ ہے کہ اسلام نے ابتداءمیں جو نقشہ قائم کیا تھا کاش کچھ دن بھی مسلمان اس نقشہ کو باقی رکھتے تو آج گھبرا گھبرا کر نہ دنیا بیمہ اور انشورنس کے دامن میں پناہ ڈھونڈتی، نہ غریب مخلوق اور کاشت کاروں کے مشکلات کا حل باہمی اتحاد والی سود خوار انجمن میں سوچا جاتا گویا "پنجہ گرگ" (ساہوکار) سے نکال کر اس کے حلق پر ان انجمنوں کی چھری چلائی جاتی ہے مسلمان علماء کو مجبور کیا جا رہا ہے کہ سود اور بیمہ وغیرہ کی شکلوں کے جواز کی صورت پیدا کریں۔ سمجھا جاتا ہے کہ اسلام کے نظام میں ان مشکلات کے حل کی کوئی تدبیر نہ تھی اور گویا یورپ کا ذہن پہلی دفعہ ان مسائل کی طرف منتقل ہوا لیکن کیا کیجیے کہ کسی تصویر کی کسی ایک حصہ کے دیکھنے سے پوری تصویر کا حال معلوم نہیں ہو سکتا ہے[1]"

اس زمانہ کی سرمایہ دار حکومتیں نادار بے روزگار باشندوں کی معاشرتی کفالت کی ذمہ داری نہیں لیتیں اگر انگلستان میں ذمہ داری لی بھی جاتی ہے تو محدود پیمانہ پر مجبوراً بیمہ کرانا پڑتا ہے۔ سرمایہ دار ملکوں میں تو چند چوٹی کے سرمایہ داروں نے بیمہ کو ایک باقاعدہ تجارتی کاروبار بنا کے غریب پالیسی ہولڈروں کی آمدنی میں خود کو بھی حصہ دار بنا لیا ہے۔ دوسری خامی یہ ہے کہ یہ کمپنی "متوفی قبل از وقت" کی اولاد کی جو بھی امداد کرتی ہے اس امداد کا بار ملک کے تمام باشندوں پر نہیں بلکہ صرف انھی چند ہزار لوگوں کی جیب پر پڑتا ہے جو اس بیمہ کمپنی میں شریک ہیں کیونکہ منیجر یا کمپنی کے نظما اپنی جیب سے نہیں بلکہ اور پالیسی ہولڈروں کی رقموں سے جو

---

[1] اسلامی معاشیات از مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی ص

منافع ہوتا ہے اس کا ایک حصہ اس دوسرے قبل از وقت مرنے والے کی اولاد کو یکمشت دے دیتے ہیں، پھر سودی کاروبار کی جملہ خرابیاں بھی اس میں سمائی ہوئی ہیں۔

اسلامی نظام معیشت کی ترویج ہو تو "نہ کوئی باپ اپنے مرنے سے اس لیے خوف زدہ رہ سکتا ہے کہ اس کے بچے یتیم ہو جائیں گے، بیوی، بیوہ ہو کر لاوارث ہو جائے گی، نہ کسی کو اس کا خطرہ رہ سکتا ہے کہ میں اگر اتفاقی طور پر کسی مصیبت یا مرض کا شکار ہوا اور میرا ہاتھ خالی ہو گیا تو علاج کون کرے گا؟ میرے بچے کیا کھائیں گے؟ اگر کسی تاجر کو تجارت میں خسارہ آ جائے، کسان کو زراعت میں نقصان پہنچے، کوئی لنگڑا ہو جائے، اندھا ہو جائے، بڈھا ہو جائے سب کو اطمینان ہے کہ میری امداد کے لیے سرکاری خزانہ میں مستقل کافی رقم موجود ہے۔ جس ملک کے مقروضوں کو قرض توڑنے کے لیے نہ سودی قرض کی حاجت نہ جائداد بیچنے کی ضرورت کہ ان کے قرض کی ادائی کا سامان حکومت کے خزانہ میں موجود ہے۔ بیوپار کاروبار کرنے والے مسافر جو ایک جگہ سے دوسری جگہ آتے جاتے رہتے ہیں نہ ان کو اس کی فکر کہ کس جگہ جا کر میرا ہاتھ خالی ہو جائے گا کہ ہر ضلع ہر تعلقہ کے مقامی خزانہ میں اس کی امداد کا فنڈ موجود ہے"[1]

بیمہ کا بدل[2] ذیل میں ہم بیمہ کی ایک شکل یعنی "معاقل" کی وضاحت کریں گے "معاقل" بیمہ ہی کی ایک غیر سودی شکل ہے جو عہد نبوی سے رائج ہے اس میں چند آدمی اپنا چندہ مشترکہ فنڈ میں جمع کرایا کرتے ہیں اور ان

---

[1] اسلامی معاشیات از مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی ص۔

[2] ابھی حال میں پنجاب سے ایک کتاب "بیمہ اور اسلام" کے نام سے شائع ہوئی ہے جس کے صفحہ ۷۵ پر یہ عبارت ہے کہ "یہ ذکر کرنا دلچسپی سے خالی نہیں کہ بیمہ مسلمانوں ہی کی ایجاد ہے یہ وہ حقیقت ہے جس پر تاریخ شاہد ہے، جس وقت مسلمان ایک تجارتی قوم کی حیثیت سے اقوام عالم میں سربلند تھے اس وقت بیمہ بحری (Marine Insurance) رائج تھا اور "زمانیہ"

چندہ دینے والوں پر کوئی ذمہ داری آ پڑے مثلاً خون بہا (ہرجانہ وغیرہ) تو اس فنڈ سے ادائی ہوتی ہے ورنہ سوا ونٹ غریب کے بس کی چیز نہیں۔

ادارہ معاقل عربوں کے زمانہ جاہلیت میں بھی تھا اور رسول کریمؐ کے روا رکھنے کے باعث اسلام میں بھی جاری رہا۔[1]

اس کا ایک رخ یہ تھا کہ اگر کوئی شخص کسی قتل، ضمان اور ہرجانہ والے فعل کا ارتکاب کرتا یا اُسے کسی کا خون بہا ادا کرنا پڑتا تو وہ تنہا اس کی ادائی کا ذمہ دار نہ تھا بلکہ اس کا پورا خاندان یا قبیلے والے مل کر اس کا ہاتھ بٹاتے۔

حادثاتی بیمہ کی یہ صورت عربوں کے سوا مدینہ کے یہودیوں میں بھی بہت منظم حالت میں تھی چنانچہ سیرۃ محمد بن یوسف الشامی میں لکھا ہے "اس زمانہ میں اسلام بن مشکم بنو نضیر کا سردار اور ان کا خزانچی تھا، یعنے اس مال کا خزانچی تھا جو وہ حادثوں اور ضرورتوں کے لیے جمع کرتے تھے"[2]

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) (ضمانیہ) کے نام سے موسوم ہوئی، جوں جوں مسلمانوں میں شہنشاہیت بڑھتی گئی یہ کام بلقانی یہودیوں نے اپنے قبضہ میں لیا اور جوں ہی مسلمانوں نے قسطنطنیہ سے آگے قدم بڑھائے وہ لوگ جنوبی یورپ چھوڑ کر شمال کی جانب روانہ ہوئے اور ان ہی لوگوں نے انگلستان پہنچ کر وہاں بیمہ کا کام رائج کیا جو بعد میں (Lloyds.) کے نام سے مشہور ہوا، پھر صفحہ ۸ پر لکھا ہے کہ "یورپین محققین نے بالاتفاق اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ مسلمانان اسپین نے تجارت کے تحفظ اور ارتقاء کے لیے بحری بیمہ کی بنا رکھی!" (بیمہ اور اسلام مولفہ چودھری محمد بلال پبلشرز چودھری اینڈ کمپنی انشورنس پرنٹرز اینڈ پبلشرز اینک روڈ انارکلی لاہور)

اسلامی ممالک کی پہلی معاشی کانفرنس میں افتتاحی تقریر کرتے ہوئے فضیلت مآب غلام محمد صاحب نے بتایا کہ

"ممکن ہے بہت سے لوگ اس سے واقف نہ ہوں لیکن یہ حقیقت ہے کہ مسلمانوں نے یورپینوں سے صدیوں پہلے اسلامی اصولوں کے مطابق جہازرانی کا بیمہ شروع کیا تھا۔" (الھدیٰ حیدرآباد دکن مورخہ ۱۸ صفر المظفر ۱۳۶۹ھ م ۹ دسمبر ۱۹۴۹ء بحوالہ اُردو ڈان)

[1] تفصیل ھدایہ ج ۴ کتاب المعاقل — [2] سیرۃ محمد بن یوسف الشامی ص ۲۴ ذکر غزوۃ بنی النضیر

دستور مملکت مدینہ میں انصار کے قبیلوں کا نام بنام ذکر ہے کہ پرانے طریقے پر رہیں گے (یتعاقلون معاقلہم الاولی)
پھر یہ بھی ذکر ہے کہ اگر کوئی قبیلہ ایسا نادار ہو کہ اپنے فنڈ سے اپنی ذمہ داریوں کو ادا نہ کر سکے تو دوسرے اسلامی قبیلے اس کی مدد کریں[1]
اس کا دوسرا رخ یہ ہے کہ اگر کسی مقام پر کوئی لاش پائی جائے اور قاتل کا پتہ نہ چلے تو وہاں کی آبادی اجتماعی طور سے خون بہا ادا کرتی ہے
معاقل کا یہ ادارہ بیمہ کی ایک قسم ہے۔ ہر سماجی وحدت "بالمعروف والقسط" اپنے جملہ ارکان کے لیے زخمی ہرجانوں کے خلاف سماجی بیمہ کرتی تھی۔ یہ نہیں کہ ایک غریب آدمی خون بہا کے سو اونٹ تنہا خود ہی دینے کا پابند ہو یا ادا نہ کر سکنے کے باعث خون ہدر ہو جائے بلکہ "عاقلہ" برادری سب مل کر اس کو برداشت کرتی تھی۔

لانّ الضم لنفی الحرج حتیٰ	قاتل کے ساتھ دوسروں کو شامل کرنا
لا یصیب کل واحد الا زمن	اس غرض سے تھا کہ حرج و مشقت نہ ہو تاکہ
ثلاثہ او اربعۃ وھذا المعنی	ہر ایک پر تین یا چار درہم سے زیادہ لازم نہ آئے اور
یتحقق عند الکثرۃ[2]	یہ جب ہی ہوتا ہے جبکہ مدد کرنے والوں کی کثرت ہو

معاقل کا یہ نظام پہلے پہل ہم قبیلہ افراد میں تھا۔ رسول کریمؐ نے جملہ مہاجرین کو مدینہ میں ایک سماجی وحدت قرار دیا۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں اہل دیوان یعنے ایک دفتر کے جملہ لوگوں کو جن کے نام ایک ہی رجسٹر میں درج تھے (یا ایک تعلقہ دار خزانے کے مضافات کے سب رہنے والوں کو جو اپنی تنخواہ اسی خزانے سے حاصل کرتے) اغراض معاقل کے لیے ایک وحدت قرار دیا گیا تھا[3] اسی طرح ایک شہر کے جملہ ہم پیشہ لوگ ٹریڈ گلڈ یا ٹریڈ یونین کی طرح ایک سماجی وحدت

---

[1] ۔ کتاب الاموال ص ۲۰۳ [2] ہدایہ ج ۴ کتاب المعاقل
[3] ۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ہدایہ ج ۴ کتاب المعاقل یا ہدایہ کی مختلف شرحیں مثلاً فتح القدیر وغیرہ ۔

ہوں گے جیسے سنار، لوہار وغیرہ چنانچہ ھدایہ میں ہے کہ

لو كان اليوم قوم تناصرهم بالحرف فعاقلتهم اهل الحرفة[1]

اگر اس زمانہ میں کوئی قوم ایسی ہو کہ ان کی باہمی مددگاری حرفہ اور پیشہ کے ذریعہ ہو تو اس کے پیشہ والے اس کے عاقلہ (تاوان ادا کرنے والے) ہوں گے۔

موٹروں اور دوسری تیز رفتار سواریوں کے اضافہ سے راستوں کے حادثوں میں بھی روزافزوں اضافہ ہو رہا ہے۔

مجلس علماء دکن نے بیمہ موٹر کے حادثوں کے لیے مذکورہ بالا فقہی عبارت سے استدلال کر کے حکومت سرکار عالی کو یہ یادداشت بھیجی تھی کہ موٹروں کے تمام مالکوں کو سالانہ ایک مختصر سا محصول ادا کرنا چاہیے اور یہ جمع شدہ رقم موٹروں سے ضرر پانے والوں میں تقسیم ہوا کرے۔ غرض بیمہ ضمان اور حادثاتی بیمہ کا اسلامی کتب میں پتا ملتا ہے اور آج بھی موجودہ انشورنس کے کاروبار کو سود کے عنصر سے پاک کر کے رضاکارانہ امداد باہمی اور قسط و معروف کی بنیاد پر اس کو قائم کیا جا سکتا ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ جمع شدہ چندوں سے رقم بچ رہے تو اس سے کوئی کاروبار کیا جائے اور سب چندہ دینے والوں میں ان کے چندوں کے تناسب سے نفع بھی تقسیم کیا جائے۔

غیر مسلموں کا سماجی تحفظ

اس سلسلہ میں آخری بات یہ کہنے کی ہے کہ اسلامی مملکت نے غیر مسلم باشندوں کو بھی کبھی نظر انداز نہیں کیا۔ نادار مسلمانوں کی امداد کے لیے زکٰوۃ کا محصول مالدار مسلمانوں سے لیا جاتا تھا اب رہا محصول جزیہ، محصول خراج اور غیر مسلم باشندوں سے محصول درآمد کی وصولی تو اس سے نادار ذمی رعایا کی بھی کافی امداد کی جاتی تھی۔ خمس فیئ کے قرآنی مصارف میں جہاں "مساکین" کا تذکرہ ہے اس سے مسلم اور غیر مسلم دونوں مراد ہیں قاضی ابو یوسف نے یہ روایت نقل کی ہے کہ حضرت عمرؓ نے صدقہ کے قرآنی مصارف میں

[1] ہدایہ ج ۴ کتاب المعاقل

جہاں "مسکین" کا لفظ ہے اس سے "غیر مسلم" ہی کے معنی مراد لیے تھے[1]

بہر کیف جس مذہب نے تمام انسانوں کو ایک ہی آدم کی اولاد قرار دیکر رنگ، نسل اور جغرافی حدود کو مٹا دیا ہو اور جس پیغمبرؐ نے اپنے ایک غیر مسلم یہودی خادم کی اس کی بیماری میں خود عیادت کی ہو بھلا اس کے صحابۂ کرامؓ غیر مسلموں کے حقوق کیونکر نظر انداز کر سکتے تھے! رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی اس کشادہ دلی اور تمام بنی نوع انسان سے ہمدردی اور غمگساری کی تعلیم کا نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت ابو بکرؓ کی خلافت میں لشکر اسلام کے سپہ سالار اعظم خالد بن ولیدؓ نے حیرہ فتح کرکے حیرہ والوں سے جو معاہدہ کیا اس میں یہ لکھا کہ "اور میں نے ان کو یہ حق عطا کیا ہے کہ اگر کوئی بوڑھا کام کرنے سے معذور ہو جائے یا اس پر آفت آجائے یا پہلے مالدار تھا اب نادار ہو گیا اور اس کے ہم مذہب اس کو خیرات دینے لگیں تو اس کا جزیہ نہیں لیا جائے گا اور ساتھ ہی اس کے اور اس کے بال بچوں کا خرچ مسلمانوں کے بیت المال سے مقرر کیا جائے گا"[2]

حضرت عمرؓ دمشق میں جاتے وقت عیسائیوں کی اس جماعت کی طرف سے گزرے جو جذام میں مبتلا تھی اس کو دیکھ کر یہ حکم دیا کہ ان لوگوں کو صدقات میں سے کچھ دیا جائے اور ان کے لیے مدد معاشیں جاری کی جائیں[3] اس سلسلہ میں اسلامی ماخذوں سے اور مواد پیش کیا جا سکتا ہے ہم صرف اسی ایک واقعے پر اکتفا کرتے ہیں "ایک دفعہ حضرت عمرؓ کا ایک قوم کے دروازہ پر سے گزر ہوا وہاں ایک بوڑھے اندھے کو بھیک مانگتے دیکھا اور اس کا مونڈھا پکڑ کر پوچھا کہ تو

---

[1] ابو یوسف: کتاب الخراج ص ۱۰ حضرت عمرؓ نے فقراء سے مسلم اور مساکین سے غیر مسلم مراد لیے تھے اور اس کی تائید لفظ مسکین کے لغوی معنوں سے بھی ہوتی ہے یعنی (Residential alient) اجنبی جو ہمارے ہاں سکونت پذیر یا پناہ گزیں ہو۔

[2] ابو یوسف: کتاب الخراج صفحہ ۸۵ مطبوعہ بولاق مصر۔

[3] بلاذری: فتوح البلدان صفحہ ۱۲۹ دمشق اور ۱۳۱ کی فتح۔

کس اہل کتاب سے ہے؟ اس نے کہا کہ میں یہودی ہوں۔ آپ نے پوچھا کہ پھر کیوں بھیک مانگ رہا ہے؟ اس نے کہا کہ مجھ سے جزیہ طلب کیا جارہا ہے اور مجھ میں ادائی کی سکت نہیں حضرت عمرؓ خود اس کا ہاتھ پکڑے ہوئے گھر لے آئے اور اپنے یہاں سے کچھ عنایت کرکے بیت المال کے خزانچی کو بلا بھیجا اور حکم دیا کہ اس کی حالت دیکھو اور اس کے لیے کچھ مقرر کردو۔ اور اس سے جزیہ نہ لو واللہ! یہ انصاف کی بات نہیں کہ ان لوگوں کی جوانی سے تو ہم فائدہ اٹھائیں اور بڑھاپے میں نکال باہر کردیں[۵۲]

حضرت عمرؓ کے مذکورہ بیان کے آخری الفاظ غور کے قابل ہیں جس طرح حکومتیں مالداروں سے محصول وصول کیا کرتی ہیں اسی طرح نادار ہو جاتے پر سرکاری خزانہ سے مدد کرنا حکومتوں کا فرض ہونا چاہیے یہ نہیں جب تک لوگوں کے پاس دولت رہی تھی تو خوب محصول وصول کیا اور جب وہ نادار اپاہج اور ضعیف ہوگئے تو ان کو نظر انداز کردیا۔

اسلامی مالیات کا یہ باب اور خود اپنا یہ مقالہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث پر ختم کیا جاتا ہے۔

"تم میں سے ہر ایک راعی (چرواہا، نگہبان) ہے اور اس سے رعیت کی نسبت پوچھا جائے گا پس امیر بھی راعی ہے اور اس سے اس کی رعیت کی بابت پوچھا جائے گا اور مرد بھی اپنے گھر کا نگہبان ہے اور اس سے اس کی رعیت کی بابت پوچھا جائے گا اور عورت اپنے شوہر کے گھر کی نگہبان ہے اس سے اس کی رعیت کی بابت پوچھا جائے گا، اور خادم اپنے آقا کے مال کا نگہبان ہے اس سے اس کی بابت پوچھا جائے گا۔"[۵۳]

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

شیخ امام کا اعظم پورہ نمبر مکان ۳۹/بی
حیدرآباد دکن

کلیہ فنون جامعہ عثمانیہ نمبر روم نمبر ۹۹
یکم رمضان المبارک ۱۳۶۳ھ
۱۹۴۴ء

۵۲۔ ابو یوسف: کتاب الخراج صد ۲۷ نیز کتاب الاموال صد ۲۶ نمبر ۱۱۹
۵۳۔ یہ حدیث بخاری، موطا، مسلم، ترمذی ہر ایک حدیث کی کتاب میں ملے گی۔

اشاریہ

اسلام کے معاشی نظریے

پہلی اور دوسری جلد

ماخذات

ذیل میں چند کتابیں درج کی جاتی ہیں جن سے اس مقالہ میں مدد لی گئی ہے۔ مواد حاصل کرنے میں قرآن مجید ہی کو پہلا اور اصل ماخذ بنایا ہے پھر بخاری شریف بعد ازاں دیگر صحاح، قرآن مجید کی مستند تفسیروں، فقہ کی کتابوں، تاریخوں اور دیگر مستند اسلامی ماخذوں سے مواد حاصل کیا گیا ہے۔

۱۔ قرآن مجید

۲۔ تفسیر

(۱) تفسیر ابن عربی (الاحکام القرآن) مطبوعہ مصر
(۲) تفسیر احمدی (تفسیر ملاجیون جون پوری) مصری ٹائپ
(۳) تفسیر بیضاوی (انوار التنزیل) مطبوعہ نولکشور پریس
(۴) تفسیر خازن (لباب التاویل) مطبوعہ مصر
(۵) تفسیر رازی (مفاتیح الغیب) " "
(۶) تفسیر زمخشری (کشاف) " "
(۷) تفسیر طبری (جامع البیان) " "
(۸) تفسیر فیض الکریم مطبوعہ حیدر آباد دکن

۳۔ حدیث

(۱) ابن ماجہ مطبوعہ لاہور
(۲) ابو داؤد مطبوعہ مصر
(۳) بخاری مطبوعہ مصر
(۴) ترمذی مطبوعہ مصر

(۵) کتاب الاموال لابی عبید قاسم بن سلام مطبوعہ مصر
(۶) سنن الکبریٰ بیہقی مطبوعہ دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن
(۷) مشکوٰۃ المصابیح مطبوعہ مصر
(۸) مصنف ابن ابی شیبہ قلمی نسخہ کتب خانہ سعیدیہ حیدرآباد دکن
(۹) مسلم۔ مطبوعہ مصر
(۱۰) موطا لامام مالک بروایت یحییٰ بن یحییٰ مزنی (قلمی نسخہ کتب خانہ سعیدیہ)
(۱۱) موطا بروایت امام محمد شیبانی مطبوعہ لاہور
(۱۲) نسائی۔ مطبوعہ مصر

۴۔ فقہ و اصول فقہ

(۱) اصول شرع محمدی سید امیر علی (دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن)
(۲) اصول فقہ اسلام سر عبدالرحیم (دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ)
(۳) الاحکام السلطانیہ ماوردی مطبوعہ مصر ۱۲۹۸ھ
(۴) الاحکام السلطانیہ لابی یعلیٰ مطبوعہ مصر
(۵) بدائع الصنائع الکاسانی مطبوعہ مصر
(۶) بدایۃ المجتہد لابن رشد الحفید مطبوعہ مصر
(۷) درمختار۔ مطبوعہ مصر
(۸) سراجی۔ مطبوعہ کانپور۔
(۹) عینی شرح ہدایہ۔
(۱۰) فتح القدیر لابن ہمام۔ مطبوعہ مصر
(۱۱) فتاویٰ قاضی خان مطبوعہ کلکتہ نیز مطبوعہ مصر
(۱۲) کتاب الام امام الشافعی۔ مطبوعہ مصر
(۱۳) کتاب الخراج لابی یوسف بولاق مصر
(۱۴) کتاب الخراج لیحییٰ ابن آدم
(۱۵) مبسوط السرخسی۔ مطبوعہ مصر
(۱۶) المدونۃ الکبریٰ امام مالک مطبوعہ مصر
(۱۷) ہدایہ۔ مطبوعہ نولکشور پریس

۵ - تاریخ سیر اور جغرافیہ وغیرہ

(۱) تاریخ ابو الفدا - مطبوعہ مصر
(۲) تاریخ و مقدمہ ابن خلدون مطبوعہ مصر
(۳) تاریخ الخلفاء سیوطی - مطبوعہ مصر
(۴) تاریخ طبری - مطبوعہ لیڈن ہالینڈ
(۵) تاریخ کامل ابن الاثیر الجزری مطبوعہ مصر
(۶) تاریخ یعقوبی - مطبوعہ لیڈن
(۷) اخبار الطوال
(۸) اخبار مکہ للازرقی
(۹) التنبیہ والاشراف مسعودی - مطبوعہ لیڈن
(۱۰) العرب قبل الاسلام جرجی زیدان منشی الہلال
(۱۱) النقود الاسلامیہ مقریزی - مطبوعہ قسطنطنیہ -
(۱۲) الاسواق العرب فی الجاہلیتہ والاسلام - سعید الافغانی مطبوعہ دمشق
(۱۳) الوثائق السیاسیہ لدکتور محمد حمید اللہ مطبوعہ مصر
(۱۴) الفاروق - شبلی نعمانی مطبوعہ نامی پریس کانپور
(۱۵) تمدن عرب - موسیو لی بان - مترجمہ سید علی بلگرامی
(۱۶) کتاب المحبر محمد بن حبیب مطبوعہ دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن
(۱۷) معارف لابن قتیبۃ
(۱۸) اسلامی معاشیات از مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد
(۱۹) اسلام اور سود - از ڈاکٹر انور اقبال قریشی - ادارہ معاشیات حیدرآباد دکن
(۲۰) اسلام کے چند معاشی نظریے - محمد یوسف الدین (ایم - اے) انجمن طیلسانیین حیدرآباد دکن
(۲۱) سیرۃ ابن ہشام - مطبوعہ مصر
(۲۲) روض الانف شرح سیرۃ ابن ہشام للسہیلی مطبوعہ مصر
(۲۳) فوائد بدریہ، مولانا محمد صبغۃ اللہ قاضی بدر الدولہ شمس المطابع شبین پریس حیدرآباد دکن
(۲۴) مناجتہ الطرب فی تقدمات العرب، نوفل افندی مطبوعہ بیروت

(۲۵) فتوح البلدان بلاذری

(۲۶) فتوح مصر لابن عبد الحکم

(۲۷) مروج الذہب مسعودی مطبوعہ مصر

(۲۸) الارتسامات اللطاف امیر شکیب ارسلان

(۲۹) صبح الاعشیٰ، قلقشندی، مطبوعہ بولاق مصر

(۳۰) جغرافیہ عالم حصہ اول و دوم از مارسڈن دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ

(۳۱) عربوں کی جہازرانی از مولانا سید سلیمان ندوی

(۳۲) صفۃ الجزیرۃ العرب للھمدانی

(۳۳) معجم البلدان، یاقوت

(۳۴) عہد نبوی کے عربی اور ایرانی تعلقات از ڈاکٹر حمید اللہ مطبوعہ معارف اعظم گڑھ

(۳۵) جاہلی عرب کے معاشی نظام کا اثر پہلی مملکت اسلامیہ کے قیام پر از ڈاکٹر حمید اللہ مطبوعہ حیدر آباد دکن

(۳۶) شہری مملکت مکہ از ڈاکٹر حمید اللہ

(۳۷) عربوں کے تعلقات بیز نطینی حکومت سے از ڈاکٹر حمید اللہ

(۳۸) عہد نبوی کا نظام حکمرانی از ڈاکٹر حمید اللہ

(۳۹) بھگوت گیتا مترجمہ منشی شیام سندر لال مطبوعہ نول کشور ۱۸۸۴ء

(۴۰) منوسمرتی (مانو دھرم شاستر) مترجمہ لالہ سوامی دیال مطبوعہ نولکشور

(۴۱) اقوال بدھا ترجمہ دھم پد مترجمہ مانک راؤ وٹھل راؤ انڈین پریس الہ آباد

(۴۲) کتاب مقدس (بائبل)

(۴۳) سبع معلقات

(۴۴) حماسہ

انگریزی کتابیں

(۱) انسائیکلوپیڈیا آف اسلام

(۲) انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا

(۳) انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجنز اینڈ ایتھکس، جیمس ہیسٹنگس

(۴) اسپرٹ آف اسلام، سر سید امیر علی

(۵) اورینٹ انڈر دی کیلفس، فان کریمر، انگلش ٹرانسلیشن خدا بخش

(۶) اسلامس بلیف اینڈ انسٹیٹیوشنز، لامنز، انگلش ٹرانسلیشن ڈینین راس میتھون کمپنی لندن

(۷) انالس آف دی ارلی کیلیفس سر ولیم میور

(۸) اولڈ ٹسٹمنٹ (توریت)

(۹) پان اسلامزم اینڈ بالشویزم، قدوائی۔ لوزاک اینڈ کمپنی لندن

(۱۰) سوشیالوجی آف اسلام ریوبن لیوی

(۱۱) عرب کانکوسٹ آف ایجپٹ، بٹلر

(۱۲) کنزشپ اینڈ میاریج ان ارلی اریبیا، رابرٹسن اسمتھ، لندن

(۱۳) لائف آف محمدؐ، سر ولیم میور

(۱۴) لائف آف محمدؐ، باسورتھ اسمتھ

(۱۵) لائف آف محمدؐ، واشنگٹن ارونگ

(۱۶) محمڈن تھیوریز آف فینانس، اگنی ڈس، نیویارک امریکہ

(۱۷) محمڈن جیورس پروڈنس، سر عبدالرحیم

(۱۸) مسلم کانڈکٹ آف اسٹیٹ، ڈاکٹر حمید اللہ

(۱۹) نیو ٹسٹمنٹ (انجیل)

معاشیات کی انگریزی کتابیں

(۱) اکنامکس بین ھام۔ سیکنڈ اڈیشن

(۲) ایلیمنٹس آف اکنامکس، ای تھامس

(۳) ایلیمنٹری اکنامکس تھامس کارور اینڈ کار میکائیل۔ نیویارک

(۴) ایلیمنٹری پرنسپلز آف اکنامکس، ارون فشر۔ ایکل یونیورسٹی

(۵) اے فسٹ اپروچ ٹو اکنامکس فار انڈین ریڈرس، شرما
(۶) اے اسٹڈی آف انڈین اکنامکس، پی بانرجی۔ میکملن کمپنی
(۷) اکنامکس آف ایوری ڈے لائف، سر ٹی، ہیچ پن سن ج ۱، ج ۲۔ کیمبرج یونیورسٹی پریس
(۸) پرنسپلز آف اکنامکس، الفرڈ مارشل (آٹھواں ایڈیشن)
(۹) پرنسپلز آف اکنامکس، ٹاسگ ج ۱، ج ۲
(۱۰) پرنسپلز آف اکنامکس، برج نارائن دہلی۔ چاند اینڈ کمپنی ۱۹۴۱ء
(۱۱) پرنسپلز آف انڈین اکنامکس جتھار اینڈ بیری
(۱۲) اکنامک لائف آف دی اینیشنٹ ورلڈ، ٹوبین انگلش ٹرانسلیشن کے گن بال
(۱۳) اکنامک ہسٹری آف انگلینڈ، پرسی جارڈن اینڈ ملٹن برگس
(۱۴) ہسٹری آف اکنامکس، ارنسٹ نیس
(۱۵) کرسچیانٹی اینڈ اکنامکس، لارڈ اسٹامپ
(۱۶) کیپٹل، کارل مارکس
(۱۷) پبلک فینانس، ڈالٹن
(۱۸) پرنسپلز اینڈ میتھڈرس آف ٹیکسیشن، آر دی ٹیج اسمتھ
(۱۹) پبلک فینانس، بسٹیبل میکملن کمپنی ۱۹۱۷ء
(۲۰) منی اینڈ دی میکانیزم آف اکسچینج، پروفیسر جیونز (ستائیسواں اڈیشن)
(۲۱) سوشیلزم ورسیز کیپیلزم، اے۔ سی۔ پیگو۔
(۲۲) دی اکنامکس آف ان ہیری ٹینس، سر جوشیا ویج وڈ۔ پیگون سیریز۔
(۲۳) دی جنرل تھیوری آف ایمپلائمنٹ اینڈ انٹریسٹ اینڈ منی، لارڈ کینز

معاشیات کی اردو کتابیں

(۱) اصول معاشیات (برائے بی۔ اے) از پروفیسر الیاس برنی
(۲) اصول سیاست مدن از رائے بہادر دھرم نارائن دہلوی علی گڈھ ۱۸۶۹ء
(۳) اصول فلسفہ سیاست مدن، قوانین دولت (ہارس ہیل: لاز آف ویلتھ) مترجمہ خواجہ غلام الحسنین رفاہ عام پریس لاہور ۱۹۰۸ء

(۴) اصول معاشیات ج ۱، ج ۲ مترجمہ پروفیسر رشید احمد، دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ

(۵) علم المعیشت از پروفیسر الیاس برنی

(۶) معاشیات از پروفیسر حبیب الرحمٰن مطبوعہ حیدرآباد دکن

(۷) معاشیات مقصد و منہاج از ڈاکٹر ذاکر حسین مطبوعہ ہندوستانی اکاڈیمی الہ آباد

(۸) مبادی معاشیات (ایلیمنٹری پولیٹیکل اکانمی) از ایڈون، کینن) مترجمہ ڈاکٹر ذاکر حسین۔ مطبوعہ الہ آباد

(۹) مبادی علم المعیشت از آغا محمد اشرف۔ مطبوعہ لاہور

(۱۰) معاشیات کی الف بے از پروفیسر محمد ناصر علی۔ انجمن طیلسانین عثمانیہ حیدرآباد

(۱۱) مقدمہ معاشیات (مورلینڈ: انٹروڈکشن ٹو اکنامکس) مترجمہ پروفیسر الیاس برنی

(۱۲) علم الاقتصاد از علامہ سر محمد اقبال۔ کارخانہ پیسہ اخبار لاہور

(۱۳) اصول وطریق محصول مترجمہ پروفیسر حبیب الرحمٰن دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ

(۱۴) نظام اصلداری و اشتراکیت از ڈاکٹر انور اقبال قریشی

(۱۵) معیشت الہند از پروفیسر الیاس برنی دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ دکن

(۱۶) ہندوستانی معاشیات کے مبادی از شرف الدین بی اے عثمانیہ انجمن طیلسانین حیدرآباد

(۱۷) سرمایہ (خلاصہ کیپٹل) از ام۔ ام۔ جوہر مطبوعہ دہلی

HE ECONOMIC DOCTRINES OF ISLAM

(UNDER PRINT)

(A THESIS APPROVED FOR THE DEGREE OF Ph., D.)

By

MOHD. YUSUFUDDIN M. A. Ph., D.

LECTURER, OSMANIA UNIVERSITY.

"The Work is a Diligent and

Scientific Study"

Prof. KRENKOW

CAMBRIDGE UNIVERSITY.

"By his great work he has brought

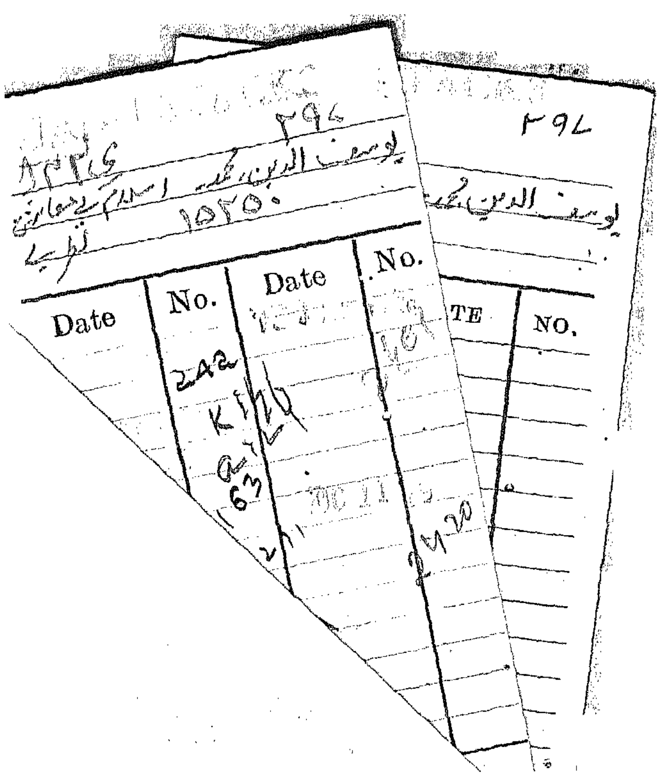
Credit to his University"

L. K. HYDER

Prof. of Economics

Muslim University (Alig.)

اصول الاقتصادیۃ فی الاسلام (زیر ترتیب)



Date
No.
Date
No.
NO.